# مطالب القرآن

فی

# دروس الفرقان

سورۂ المجادلہ - سورۂ الحشر - سورۂ الممتحنہ
سورۂ الصف - سورۂ الجمہ - سورۂ المنافقون
سورۂ التغابن - سورۂ الطلاق - سورۂ التحریم

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

# مطالب القرآن

فی

# دروس الفرقان

**سورۃ المجادلہ - سورۃ الحشر - سورۃ الممتحنہ**
**سورۃ الصف - سورۃ الجمعہ - سورۃ المنافقون**
**سورۃ التغابن - سورۃ الطلاق - سورۃ التحریم**

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

## جملہ حقوق محفوظ ہیں


| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب | ............ | مطالب القرآن فی دروس الفرقان (سورۃ البقرہ جلد 1) |
| دروس | ............ | از: جناب غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ |
| ناشر | ............ | بزمِ طلوعِ اسلام، لاہور |
| زیرِاہتمام | ............ | ادارہ طلوعِ اسلام 25 بی 2 گلبرگ، لاہور |
| | ............ | فون نمبر 5714546-5753666 |
| ایڈیشن اول | ............ | فروری 2014ء |
| مطبع | ............ | باقر یونس پرنٹنگ پریس، لاہور |


**ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔**

## سرٹیفیکیٹ تصحیح

# انتساب

## رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظام عدل و حریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔ شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی و عنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی و سماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ و تابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن و زیبائی جن کی حقیقی آب و تاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جو ہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب و تاب سے موزوں ہو گئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینؐ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بجق ' دل بند و راہ مصطفیؐ رو

[معراجِ انسانیت ص ۴۷ از۔ علامہ پرویز رحمۃ اللہ علیہ]

# اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو
آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست
رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]

# سورة المجادلة

# پہلا باب: **سورۃ المجادلۃ**( آیات 1 تا 4)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! سورۃ المجادلہ آ رہی [1] ہے۔ یہ 58 ویں سورۃ ہے اور پارہ بھی نیا یعنی 28 واں شروع ہو رہا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم دوسرے دور میں ستائیس پارے ختم کر چکے ہیں' اٹھائیسواں شروع ہے۔ 28,29,30 تھوڑی سی منزل ہی رہ گئی ہے۔ اللہ توفیق عطا فرمائے۔

## قرآن حکیم میں بیانِ عورت اور حسنِ اتفاق

یہ سورۃ المجادلہ ایسے وقت میں سامنے آ رہی ہے جب یہ شور مچ رہا ہے کہ عورت کو اجازت دی جا رہی ہے کہ وہ اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرے۔ کیونکہ اس کی یہ جرأتیں بے باک ہو رہی ہیں کہ ''یہ چیزیں خلافِ اسلام ہیں'' یہ خلافِ شریعت ہے۔ اس لیے انہیں گھروں کے اندر بند کر دو۔ نظر بندی نہ کہو بلکہ یہ کہو کہ یہ اسلام کا' خدا کا' رسول کا' حکم ہے کہ تم بند رہو' خود اپنے آپ کو نظر بندی میں رکھو' اور آواز بھی زبان پہ مت لاؤ' اس لیے کہ مرد تمہارے اوپر حاکم ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ اتفاقِ حسنا ہے کہ عین اس وقت یہ سورۃ شروع ہو رہی ہے۔ کیا شروع ہو رہی ہے؟ کہا ہے کہ قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا (58:1)۔ ایک تو میں پہلے عرض

کردوں' میں نے کہا تھا' کہ ہمارے ہاں زوجہ تو صرف عورت کو کہا جاتا ہے' مرد اس کا زوج ہوتا ہی نہیں وہ تو حاکم ہوتا ہے' مالک ہوتا ہے۔ یعنی ہمارے ہاں زبان میں آپ دیکھیے پنجابی زبان میں جو الفاظ ہیں' مجھے پتہ نہیں اردو میں بھی وہ کہتے ہیں' ہمارے ہاں تو خاوند کو مالک کہتے ہیں اور میاں تو یا اللہ میاں ہوتا ہے یا خاوند میاں ہوتا ہے تو ان کے سامنے کیا بات کرنا کیا۔ بات ہے اس آزادی کی!

## خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں مقامِ رسالت کی کا ذکر اور مقامِ عورت کے اظہار کا ذریعہ: اسلامی نظام مملکت کا سربراہ

عزیزانِ من! رسول اللہ ﷺ کی حیثیت یہ ہے کہ یہ مملکت کے سربراہ کی رسالت ہے جس پہ ایمان لائے بغیر مسلمان نہیں ہوسکتے۔ کیفیت یہ ہے کہ جب تک یہ اپنے اختلافی معاملات میں تمہیں حَکَم (فیصلہ کرنے والا' ثالث) نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم صادر کرو' اس کے سامنے اس طرح سرِ تسلیم خم نہ کریں کہ اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی اُس کے خلاف گرانی اور کبیدگی محسوس نہ کریں۔ وہ کیا آیتِ جلیل [1] ہے کہ خدا اس پر شاہد ہے کہ تم کبھی مومن نہیں ہوسکتے تاوقتیکہ اپنے معاملات تیرے پاس نہ لائیں اور جب تو فیصلہ دیدے تو اس فیصلے کے خلاف ان کے دل میں بھی کوئی گرانی نہ گزرے۔ یہ کیفیت ہے لیکن آزادی کا کیا عالم ہے! یہ حُکم کسی روایت اور حدیث کا محتاج نہیں ہے۔ قرآن کریم نے اس کو یہ بتانے کے لیے محفوظ کیا کہ عورت کو بھی اپنے حقوق اور اپنے دعاوی پیش کرنے کا کتنا حق حاصل ہے! وہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں پیش کر رہی ہے' قرآن کریم نے اس عورت کا نام نہیں لیا کہ بات مخصوص اور محدود ہو جائے گی کہ یہ واقعہ صرف اس عورت کا تھا' کہا کہ قَوْلَ الَّتِىْ تُجَادِلُكَ (58:1) وہ رسول ﷺ جس کے فیصلے کے خلاف دل میں گرانی گزر جائے تو انسان مومن نہیں رہتا تجھ سے' اے رسول ﷺ! جھگڑ رہی ہے۔ مجادل جدل سے ہے۔ یہ جنگ وجدل تو عام لفظ ہے تو یہ آپ نے سنا ہوگا وہیں سے یہ لفظ رسول کے ساتھ جھگڑ رہی ہے۔ یہ رسول کی ذات کا معاملہ نہیں ہے۔ کہا ہے کہ وَتَشْتَكِىْٓ اِلَى اللّٰهِ (58:1) وہ اس طرح اپنی شکایت کو خدا تک پہنچا رہی ہے۔ کیا بات ہے! تیرے ساتھ یہ جھگڑ رہی ہے۔ خدا کہتا ہے کہ اے رسول! ہم سن رہے ہیں اس کی باتوں کو۔ آہاہاہا! کیا مقام ہے' عزیزانِ من! میری بیٹیوں کا' رسول ﷺ کے ساتھ کہ اپنے حق کے لیے جھگڑ رہی ہے' خدا سن رہا ہے' شہادت دے رہا ہے۔ پھر واضح کیا کہ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا (58:1)۔ یہ تَحَاوُر کا لفظ ہے۔ یہ لفظ محاورہ سے ہے۔ محاورہ کہتے ہیں ''آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بحث کرنا''۔ یہ یہی نہیں کیے جا رہی ہے' تم بھی کچھ بحث کر رہے ہو' یہ نہیں بحث کر رہی ہے۔ آپ اس منظر کو سامنے لائیں گے۔ یہ مجادل ہے' جھگڑا ہے' دونوں طرف سے باتیں ہو رہی ہیں' تو اس کے اندر کونسی چیز ہے جو روایت کی

---

[1] یہ درس سابقہ درس سورہ الحدید کے تسلسل میں ہی دیا گیا تھا۔

[2] وہ (4:65) ہے یعنی سورۃ النسآء کی 65ویں آیت۔

ہے۔ کہا کہ تَشۡتَکِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ (58:1) خدا سے اپنی شکایت بیان کر رہی ہے۔ اب یہ بھی معلوم ہو گیا کہ خدا سے شکایت کرنے کا ذریعہ کیا ہے۔ یہ ذریعہ ہے اسلامی نظامِ مملکت کا سربراہ۔

## حضرت عمرؓ کا سربراہِ مملکت کی حیثیت سے ذمہ داری کے احساس کا اظہار اور عورت کا ایک اہم مسئلہ

عزیزانِ من! اسی لیے حضرتِ عمرؓ نے یہ کہا تھا' کیا بات تھی جو وہ کہہ جاتے تھے' کہ خدا نے مجھے تو یہ خلافت اس لیے دی ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو اس تک نہ پہنچنے دوں' راستے میں ہی روک لوں۔ خدا تک تو اُس دعا کے پہنچانے کی ضرورت ہو گی جو تمہاری ضرورت یہاں رکی رہے تو میں اگر اسے یہیں پورا کر دوں تو پھر خدا کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے۔ بابا! میں ہی پورا کر دونگا اور اگر یہ وہاں تک پہنچے گی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ میری شکایت ہو گی کہ میں تمہاری ضرورت کو پورا نہیں کر سکا تو خدا کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔ خدا کے نظام کے ہوتے ہوئے' خدا کے دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی' معاملہ یہیں حل ہو جائے گا۔ کہا ہے کہ تَشۡتَکِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ وَ اللّٰہُ یَسۡمَعُ تَحَاوُرَکُمَا اِنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌۢ بَصِیۡرٌ (58:1)۔ معاملہ تم دونوں کا ہو رہا ہے' ہم سن بھی رہے ہیں' ہم دیکھ بھی رہے ہیں اور فیصلہ اس عورت کے حق میں ہو رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک اس خاص مسئلے کے متعلق وحی کے احکام نہیں آئے تھے۔ جہالت میں یہ ہوتا تھا اور اب تو خیر عرصہ ہوا دیکھنے کا یہ موقع نہیں ملا۔ یہاں ہمارے ہاں بھی جہالت میں مرد' عورتوں کے متعلق' بیوی کے متعلق' غصے میں آ کر جہاں اور باتیں کرتے تھے وہ یہ بھی کہتے تھے کہ "تُو تو میری ماں لگدی ہے" "تُو بہن لگتی ہے۔ یہ عام طور پہ عربوں کے ہاں جہالت میں ہوتا تھا تو کوئی جہالت عام تھی' اسے تو دورہی جاہلیہ کا کہا کرتے تھے۔ یہ کہہ دینے کے بعد یہ سمجھ لیتے تھے کہ وہ عورت بیوی نہیں رہی۔ اب عورت عجیب مصیبت میں پھنس جاتی تھی: وہ طلاق نہیں ہوئی کہ کسی دوسری جگہ ہی شادی کر لے' اس کے یہ کہنے سے بیوی نہیں رہی معلقہ ہو گئی۔ یہ تھی وہ پوزیشن' وہ سچویشن (Situation) جس کے لیے ابھی قرآن کریم میں کوئی حکم نہیں آیا تھا اور نظر آتا ہے کہ اس قسم کا کوئی واقعہ ہو گیا' اب اس کے بعد یہ بات کہ اس عورت نے یہ کہا کہ میری زندگی کے متعلق کوئی فیصلہ ہونا چاہیے کہ اس کے ساتھ نکاح ختم ہو گیا ہے تو میں دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہوں' مطلقہ کی حیثیت سے بھی' نہیں ختم ہوا تو مجھے تو اس سلسلہ میں یہ بیوی کی حیثیت سے رکھنا ہو گا کیا فیصلہ ہے؟

## جہالت میں بیوی کو ماں یا بہن کہہ دینے سے بیوی کا رشتہ ختم نہیں ہو جاتا

عزیزانِ من! یہ تھا وہ معاملہ۔ کیا بات ہے صاحب! اس انداز سے' اس نظام کے اندر یہ آزادیاں تھیں کہ عورت جھگڑ رہی ہے اور خدا سن رہا ہے اور پھر اس پہ خدا کی طرف سے فیصلہ ہو رہا ہے کہ نہیں بھئی! اگر کوئی اس طرح سے جہالت میں' غصے میں آ کر کہہ دیتا ہے تو یہ محض

جہالت ہے۔اس سے وہ بیوی ماں نہیں بن جاتی۔کہا ہے کہ اَلَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآئِهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ (58:2) بات یہ ہے کہ جولوگ اپنی بیویوں کو جہالت کی وجہ سے غصہ میں آ کر ماں کہہ دیں وہ اس سے ان کی سچ مچ کی مائیں نہیں بن جاتیں کیونکہ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔیْ وَلَدْنَهُمْ (58:2) ماں تو وہی ہوتی ہے جس نے اس کو جنا تھا۔یہ رشتے عقدی ہیں۔بیوی کے ساتھ ایک معاہدہ کی رو سے رشتہ قائم ہوتا ہے اور وہ رشتہ ٹوٹتا بھی اس معاہدے کے توڑ دینے سے ہے ویسے نہیں ٹوٹتا ہے۔وہ ماں نہیں بن سکتی نہ ماں ہو سکتی ہے۔ کیا بات ہے! کہا کہ وَاِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا (58:2) یہ غصے میں آ کر جو کہہ دیتے ہیں یہ یونہی ایک بکواس کی بات ہے جو کر دی جاتی ہے جھوٹی بات ہے جو یہ کہہ دی ہے سچی بات نہیں ہے۔

## اس قسم کی جہالت کی بیخ کنی کرنے کے لیے ایک علامتی عمل کو سرانجام دینے کے حکم کی تفصیل

عزیزانِ من! اس قسم کی چیزیں جو آدمی یونہی طیش میں آ کر بکواس کر دیتا ہے وہ قانون نہیں بن سکتا۔کہا ہے کہ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ (58:2)۔عفو کے معنی ہوتے ہیں کہ ''کسی کے پاس سے یوں گزر جانا'' غفور کے معنی ہوتا ہے ''جو کچھ یہ کیا ہے اس کی حفاظت دیدینا'' یہ حفاظت ہم دیتے ہیں اور اس طرح اس لغویت کے تباہ کن نتائج سے انہیں محفوظ رکھتے ہیں اور اس کے بعد یہ حکم ہوا کہ وَالَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ یَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا (58:3) غصے میں آ کر یہ کہہ دیا اور اس کے بعد غصہ فرو ہوا تو پھر آپ نے جو کہا تھا اس پر نادم ہوئے متاسف ہوئے تو پھر کیا صورت ہے۔تو اگر یہ بات ہو کہ ٹھیک ہے بھئی! تم نے کہہ دیا پھر تم نادم ہو گئے معاملہ ختم ہو گیا۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ اس طرح سے تو معاشرے کے اندر روز ہی یہ کچھ بچوں کا کھیل ہو جائے گا۔یہ عقد نہیں رہے گا معاہدہ نہیں رہے گا۔ جب جی چاہے۔یہ کہہ دیا جب جی چاہے پھر یہ عقد بحال ہو جائے۔کچھ تھوڑی سی تو اس کے اوپر پابندی ہو کچھ تھوڑا سا اس کے اوپر جرمانہ ہونا چاہیے کہا کہ وہ میاں بیوی تو بدستور رہے ہیں لیکن اس کے لیے کفارہ اس قسم کا کچھ دینا پڑے گا۔یہ ہے جو اس نے کہا کہ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ (58:2)۔یہ کہنا جرم نہیں ہے طلاق نہیں ہوئی نکاح نہیں ٹوٹا لیکن کچھ کفارہ ہوتا ہے کہ آئندہ کے لیے تم محتاط رہو کہ پھر میں نے جوشِ جنوں میں اگر جاہلیت میں اس قسم کے الفاظ کہہ دیئے تو یہ کچھ بھگتنا پڑے گا۔کہا کہ فَتَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا (58:3)۔اس زمانے میں تو غلام اور لونڈیاں عرب میں ابھی عام تھیں قرآن حکیم نے آ کر اس زمانے کو بند کیا جہاں سے یہ بناتے تھے۔ جنگ کے قیدیوں کو بند کر دیا۔جو موجود تھیں ان کے متعلق پھر آہستہ آہستہ ان کو رہا کرنے کے آزاد کرنے کے ان کو جزو معاشرہ بنانے کے قرآن حکیم نے احکام دیئے۔مَامَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ کے متعلق جتنے احکام ہیں جن کو لونڈیوں کے متعلق کہا جاتا ہے وہ سارے ان غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق ہے جو وہاں عرب میں اس معاشرے میں پہلے سے موجود تھے بعد میں تو کسی کے بنانے کا سوال ہی پیدا

نہیں ہوتا' تو قرآن حکیم اسی طرح سے کفارے وغیرہ کی قسموں کے معاملے میں آہستہ آہستہ ان کو یا تو رہا کرتا گیا اور یا ان کو ویسے ہی کہا کہ آزاد کرو یا کرؤ ان کو جزو معاشرہ بناؤ' تو کہا کہ اگر کفارہ ہے تو فَتَحۡرِيۡرُ رَقَبَةٍ (58:3) ایک غلام آزاد کریں۔

## لونڈیوں کے متعلق مودودی مرحومؒ کا فتویٰ

ہمارے ہاں عجیب بات ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ غلام اور لونڈیوں کے حق میں ہماری جو مذہبی پیشوائیت ہے' وہ تو بڑے زور سے کہتی ہے کہ قرآن حکیم میں یہ (غلام اور لونڈیاں) جائز ہیں' اب بھی بنائی جا سکتی ہیں اس لیے مودودی مرحوم کی لکھی ہوئی ایک کتاب موجود ہے۔ ہمارے ساتھ یہ مقابلہ ہوا تھا۔ انہوں نے آخر میں' جب کوئی دلیل بن نہیں پڑی تھی اور یہ کتاب میں لکھی ہوئی موجود ہے کہ ان لوگوں کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ یہ قرآن کریم سے اس قسم کے احکام لاتے ہیں۔ ٹھیک ہے جی! یہ ہے بنیادی غلطی۔ ہاں! وہ بنیادی غلطی یہ ہے کہ قرآن کریم سے جواز مل نہیں سکتا اور اس کا چاؤ اتنا ہے۔

## پارلیمنٹ میں کم از کم ایک لونڈی رکھنے کا مطالبہ اور اظہار کا کفارہ

عزیزانِ من! آپ کو یاد ہے' میں پہلے بتایا کرتا تھا (ذوالفقار علی) بھٹو (79-1928ء) کے زمانے میں پارلیمنٹ میں جب یہ عائلی قوانین زیر بحث تھے تو ایک بہت بڑے مولانا صاحب نے یہ کہا تھا کہ بابا! تم چار بیویاں کرنے پر یہ پابندیاں لگا رہے ہو' اس کے اندر اس قسم کی پابندیاں تھیں' اس پہ تو ہمارا بس نہیں' لیکن کم از کم ایک لونڈی رکھنے کی اجازت تو دیدو۔ مملکتِ اسلامیہ پاکستان کی پارلیمان کے اندر آج یہ مولانا صاحب اٹھ کر یہ فرما رہے ہیں۔ قرآن کریم میں ہر جگہ غلاموں کو آزاد کرنے کا تو حکم ہے' کسی ایک جگہ بھی نہیں ہے کہ اس کو تم غلام بنا سکتے ہو. کہا ہے کہ وَ لَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِيۡۤ اٰدَمَ (17:70) ہر انسانی بچہ انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم ہے۔ تو قرآن حکیم کسی کو غلام بنانا تو کیا وہ تو کسی کو محکوم بھی نہیں بنانے کی اجازت دیتا۔ فَتَحۡرِيۡرُ رَقَبَةٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّتَمَآسَّا ذٰلِكُمۡ تُوۡعَظُوۡنَ بِهٖ (58:3) یہ اس لیے ہے کہ تم ذرا ہوش میں رہو' تم یونہی نہ بکواس کر دیا کرو' سنبھل کر بات کرو کہ صاحب! یہ ایک غلام کو آزاد کرنا پڑے گا۔ پوچھو نہیں' پتہ نہیں کہ انہیں کتنی مار پڑتی ہوگی۔ اگر وہ اپنا غلام ہے تو وہ تو پوچھو ہی نہیں۔ وہ ساری دنیا کے کام ان سے لیتے تھے۔ دوسرے سے لے کر اگر آزاد کرنا ہے تو وہی قیمت دینی پڑتی تھی' تو کہا کہ اس کے بعد تم اس قسم کے الفاظ زبان سے نکالتے ہوئے۔ دسیوں دفعہ سوچو گے۔ کہا کہ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ (58:3) ہم جانتے ہیں' جو کچھ تم کرتے ہو' اس کو روکنا ضروری ہے' لیکن اگر غلام خریدنے کی ہمت نہ ہو یا ایسا دور آجائے جیسے ہمارا ہے کہ غلام اب ہیں ہی نہیں' تو قرآن حکیم ہے اس نے یہ حکم نہیں دیا۔ یہ بات نامکمل رہ جاتی اس لیے کہا کہ فَمَنۡ لَّمۡ يَجِدۡ فَصِيَامُ شَهۡرَيۡنِ مُتَتَابِعَيۡنِ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّتَمَآسَّا (58:4) اگر آزاد کرنے کے لیے غلام نہ

ہوتو پھر دو مہینے کے مسلسل روزے رکھو۔ یہ بھی بڑی سخت گزرنے کی بات ہے' ایسے بھی تو ہیں کہ ان کے اندر روزے رکھنے کی ہمت ہی نہ ہو۔ روزوں کے احکام میں قرآن کریم نے کہا ہے الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ (2:184) جو مشکل روزہ نبھا سکتے ہوں تو وہ روزہ نہ رکھیں وہ ایک محتاج کا کھانا دیدیا کریں تو ایسے بھی تو ہو کتے ہیں' اس قسم کے کہ جو روزے کی ہمت نہ رکھیں تو ان پہ بھی فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا (58:4) جو اس کی بھی ہمت نہ رکھیں تو ساٹھ بھوکوں کے کھانے کا انتظام کریں تو وہ جو جہالت میں' غصے میں' آ کر اس نے یہ کچھ کہہ دیا اس کے ازالے کے لیے متاثر تو وہ خود ہوا ہے' ندامت اس کو ہوئی ہے اپنے کیے پر۔ پہلی شرط تو یہ ہے۔ اسے توبہ کہتے ہیں اور اس کے بعد اس کا کفارہ آئندہ کے لیے یونہی منہ سے پھٹ پھٹا کر یہ باتیں نہ کر دیا کرو۔ یہ ہے جو کفارہ قرآن حکیم نے قرار دیا ہے۔

## ہماری خودساختہ شریعت میں طلاق دینے کا طریق اور پھر اس کا شرمناک علاج: حلالہ

آپ کے ہاں پتہ ہے کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ غصے میں آ کر وہ میاں صاحب بیوی سے کہتے ہیں: طلاق' طلاق' طلاق۔ تین دفعہ کہنا ضروری ہے۔ وہ نیلامی میں جو ہوتا ہے وہ تین دفعہ کہتا ہے: ون ٹو تھری' تین دفعہ۔ اگر اس نے یہ کہہ دیا ایک سانس میں تو وہ طلاق ہوگئی۔ ختم ہوا معاملہ۔ قرآن کریم نے تو یہ کچھ کہنے کے بعد یہ کہا تھا کہ یہ ہے اس کا کفارہ۔ ''خدا''[1] تھا جس نے یہ کچھ کیا۔ اس نے کہا کہ نہیں صاحب! معاملہ اب ہمارے بس میں ہے۔ پچاس ساٹھ برس کی وہ محترمہ خاتون' سر سفید ہوا ہے' بیٹے بیٹیوں والی نہیں ہے' نواسے نواسیوں والی بھی ہے اور یہ غصے میں آ کر کہہ بیٹھے ہیں: طلاق طلاق طلاق۔ بیچاری کا تو کوئی قصور بھی نہیں ہے۔ اب مولوی صاحب کے پاس جاتے ہیں صاحب! کہ کیا جائے گا صاحب! کہنے لگے کہ اب تو اس کے لیے صورت یہ ہے کہ یہ تمہاری بیوی کسی دوسرے مرد کے ساتھ شادی کرے۔ میری بیٹیاں معاف رکھیں' مجھے ان کا پورا حکم دہرانا ہے کہ شادی کریں' یونہی رسمی نکاح نہیں کریں ایک شرط تھی کہ کم از کم ہم بستری بھی کرے۔ دوسری صبح کو وہ شخص اس کو طلاق دیدے' پھر اس کے بعد یہ اس کی بیوی بن سکتی ہے۔ یہ آپ کی اس شریعتِ حقہ کا فیصلہ ہے جسے یہ یہاں نافذ کرنا چاہتے ہیں۔

## عائلی قوانین کے خلاف شور کیوں؟

عائلی قوانین کے خلاف جو شور مچا رکھا ہے' اس میں ایک شق یہ بھی ہے کہ یہ قوانین اس قسم کے طلاق کو طلاق ہی نہیں مانتے' وہ جو قانون چاہتے ہیں کہ نافذ ہوا اسے حلالہ کہتے ہیں۔ اس بیوی کو پھر اس خاوند کے لیے حلال قرار دینے کے لیے اس پہ طلاق پڑ گئی۔ سوچ

---

[1] ہمارے ہاں بھی خاوند کو خدا کی سمجھا جاتا ہے۔

رہے ہیں آپ؟ اور پھر یہ تو معاملہ میاں بیوی کا بھی نہیں ہے۔ نکاح کا معاہدہ جو عقد ہے' جو Agreement ہے' جو Contract ہے' وہ تو ان دونوں میں تھا' توڑنے کا حق ایسی پارٹی کو ہے جس نے کبھی ان کو دیکھا تک بھی نہیں ہے۔ آپ نے اگلے دن مجلّہ طلوعِ اسلام میں پڑھ لیا ہوگا کہ مولوی صاحب نے فتویٰ دیا کہ ان کے نکاح ٹوٹ گئے' یہ جنتی خواتین' خواتین تو وہ کہتے ہی نہیں ہیں' وہ تو اس نفرت سے ان کا نام لیتے ہیں' وہ جن کے پاؤں کے نیچے جنت بھی کہتے ہیں اور گالیاں بھی دیتے ہیں کہ جنہوں نے یہ ڈیمانسٹریشن کی تھی' یہ ان قوانین کے خلاف جو ان کے متعلق بن رہے تھے یا نہیں بنے تھے' وہ جنہوں نے اس میں حصہ لیا تھا' ان کے نکاح تھوک کے حساب سے ٹوٹ گئے' پتہ نہیں کتنے سینکڑوں کی تعداد میں تھے' نکاح ٹوٹ گئے اب جب نکاح ٹوٹ گئے تو پھر جوڑنے کا طریقہ کیا ہوگا۔ وہی طریقہ کہ کسی اور مرد سے جا کر وہ شادی کرے' طلاق ہو گئی پھر وہی حلالہ ہو' پھر یہ قصہ ہو' اور ایسے کیسز آئے کہ کوئی ملتا نہیں ہے جو اس طرح سے ایک رات کے لیے شادی کر لے' یہ واقعات میرے ذہن میں آئے ہیں' مولوی صاحب نے کہا کہ اب تمہاری مجبوری ہے تو اب اور کوئی نہیں ملتا تو چلیے! میں ہی اپنے آپ کو اس آگ میں جھونک دیتا ہوں۔ یہ کچھ کیا۔ دوسری صبح انہوں نے کہا کہ مولانا! وہ شرط پوری ہو گئی' اب طلاق دیجیے۔ کہنے لگے کہ وہ رات کی بات رات میں گئی' اب میں طلاق ولاق کچھ نہیں دے سکتا۔ جی! یہ کیسز آرہے ہیں۔ وہ طلاق دیتا نہیں ہے اور کوئی دلا ہی نہیں سکتا کہ باقاعدہ نکاح ہوا ہے۔

## خدا کے قانون کی گرفت تو بڑی سخت ہوتی ہے

قرآن مجید نے کہا تھا کہ لَا تَتَّخِذُوٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا (2:231) ہمارے احکام کو مذاق نہ بناؤ' ان کی ہنسی نہ اڑاؤ۔ اس سے زیادہ ہنسی بھی اڑائی جا سکتی ہے!! کہا ہے کہ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (58:4) یہ اس لیے ہے کہ تم اس نظام خداوندی کی صداقت پر یقین محکم رکھو جو اس کے رسول ﷺ کے ہاتھوں متشکل ہو رہا ہے اور سنو! تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ (58:4) یہ خدا کی باندھی ہوئی حدیں ہیں' ان کو نہ توڑو' ان کے اندر رہنا ضروری ہے۔ کہا کہ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (58:4) ان کو توڑنے والے جو ہیں ان کو کافر کہا گیا ہے' ان کے لیے عذاب الیم کہا ہے' دردناک عذاب ہے اور اس سے زیادہ دردناک عذاب اور کونسا ہو سکتا ہے جس میں بحیثیت قوم ہم سارے گرفتار ہیں۔

عزیزانِ من! سورۃ المجادلۃ کی چار آیات تک ہم آ گئے' پانچویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

❀......❀......❀

# دوسرا باب: **سورة المجادلة**( آیات 5 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج جون 1983ء کی 3 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المجادلۃ کی آیت 5 سے ہو رہا ہے: (58:5)۔

## ایک عورت کا اپنی حق طلبی کی خاطر نبی اکرمؐ کی بارگاہ میں حاضری کی روداد انسانی آزادی کی ترجمان ہے

شروع کی چار آیتوں میں بات یہ بیان کی گئی تھی کہ ایک خاتون جس کا نام قرآن حکیم نے نہیں لیا' وہ رسول خدا سے جھگڑا کر رہی تھی یہ ایسی چیز ہے کہ نبی اکرمؐ رسول ہونے کی جہت سے ہیں۔ یہ وہ ہیں کہ جن پر ایمان لا کر ایک انسان مسلمان ہوتا تھا اور ہوتا ہے اور جو مملکتِ اسلامیہ کے سربراہِ اول بھی تھے لیکن اپنا حق ایسی چیز ہے کہ اس قسم کی ہستی کے ساتھ بھی قرآن کریم کے الفاظ میں مجادلہ ہے' جھگڑا کیا جاسکتا ہے۔ کہا ہے کہ تَحَاوُرَكُمَا (58:1) باہمی ایک دوسرے کے ساتھ برابر کی گفتگو ہو رہی ہے۔ خدا سن رہا ہے' وہ اس عورت کو ڈانٹ نہیں رہا کہ کیا کر رہی ہے' تو کس سے بات کر رہی ہے' کس سے جھگڑا کر رہی ہے۔ خدا سن رہا ہے۔ رسول اللہؐ کی وساطت سے وہ خدا تک اپنی شکایت پہنچا رہی ہے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیصلہ اس کے حق میں دیا جاتا ہے۔ شکایت کر رہی ہے'' کے معنی یہ تھے کہ اس سے پہلے ابھی وحی کی رو سے اس معاملہ کے متعلق کوئی راہنمائی نہیں آئی تھی اور اس کے بعد خدا نے اس کے متعلق حکم جاری کر دیا اور وہ حکم تو چونکہ قرآن کریم کے اندر آ گیا' قیامت تک کے لیے غیر متبدل ہو گیا کہ جو لوگ غصے میں آ کر یونہی اپنی بیویوں کو (مثلاً) ماں کہہ دیتے ہیں۔ یہ اس زمانے کی جاہلیت کا تھا اور اب بھی ہمارے ہاں جاہلیت کی یہ چیزیں ہوتی ہیں۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ بیوی کے متعلق کہہ دیا کہ تو مجھ پہ حرام ہے' تو میری ماں لگتی ہے تو یہ جہالت ہے۔ اس جہالت کے ازالے کے لیے قرآن کریم نے کہا کہ زندگی کے ان معاملات کو یوں مذاق ہی نہ بنا لو کچھ تھوڑی سی سزا بھی بھگتو' تو اس کے لیے' جسے قسم توڑنے کا کفارہ کہتے ہیں' وہ کفارہ نازل ہو گیا تو گویا یہ حکم ہوا۔ ایک اور چیز یہ ہوئی' قرآن حکیم نے خود بتایا کہ اس عورت نے جو اپنی حق طلبی کے لیے رسول اللہؐ سے بھی جھگڑا کیا' خدا وہ سن رہا تھا تو اس پہ یہ اس کے حق میں فیصلہ نازل ہوا اور فرمایا کہ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ (58:4) یہ خدا کی مقرر کردہ حدود ہیں جن کے اندر رہنا ضروری ہے۔

## فقہ کے نزدیک حدود اور تعزیر میں بنیادی فرق ہے اور حد کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! یہ قرآنِ کریم میں بڑی چیز ہے جہاں اس قسم کے احکام دیئے گئے ہیں۔ انہیں حدود کہہ کر پکارا ہے۔ فقہ میں تو جو حدود ہیں' ان کا ایک خاص مفہوم ہوتا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ وہ جرائم' جن کی سزائیں خود قرآن کریم نے مقرر کی ہیں' انہیں حدود کہا جاتا ہے اور جن

کی سزائیں مملکت یا سلطنت یا حکومت مقرر کرے انہیں تعزیر کہا جاتا ہے۔ یہ فقہ کی رو سے حدود اور تعزیر کا فرق ہے اور حدود کی Definition (تعریف) میں قرآن کریم نے جو حدود کہا ہے تو وہ ایک بہت بڑی عظیم حقیقت ہے۔اس نے قدم قدم پر یہ زنجیریں اور رسیاں نہیں باندھ دیں' ایک لائن کھینچ دی ہے جسے آپ Limitations کہتے ہیں۔ وہ ہیں حدود۔ حقیقت میں تو یہ وہ لائن ہے جس کے اندر رہتے ہوئے تمہیں اجازت ہے' آزادی ہے مگر تم تجاوز نہیں کر سکتے' ان حدود کا اس لائن کا' اس باؤنڈری لائن کا Cross (عبور) نہیں کر سکتے' جو ہم نے مقرر کی ہیں' اس لیے ان کو قرآن میں حدود کہا ہے۔ان حدود کو توڑنے والوں کے متعلق کہا :اس کے لیے عائلی زندگی کے' ازدواجی زندگی کے احکام دیکھیے۔ یہ گھر کے متعلق' میاں بیوی کی زندگی کے متعلق ہیں تو گویا ان کو ہمارے ہاں کچھ زیادہ Seriously نہیں لیا جاتا کہ ان جن چیزوں کے متعلق خدا خود کوئی حکم نازل کر دے اور ان کو حدود کے اندر لے آئے۔تو یہ کہا ہے کہ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (58:4) ان حدود سے تجاوز کرنے والا کو یا ان کو توڑنے والے کو' کافر کہہ کر پکارا ہے' عذاب الیم کا مستحق قرار دیا ہے تو یہ سوال ہی نہیں ہے کہ یہ کچھ عام ادنیٰ سے احکام ہیں' ہدایات ہیں' ان کو Seriously کیا لیا جائے۔ ہم تو اپنے ہاں کے عائلی معاملات کو Seriously لیتے نہیں ہیں اور پھر وہ میاں جو گھر کا ہے' جو خاوند ہے تو اس کا تو سوال ہی نہیں کہ وہ زندگی کی کوئی بات بھی Seriously (سنجیدگی سے) لے لیکن قرآن کریم کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ان حدود کو Cross (عبور) کرنے والوں کے متعلق کہتا ہے کہ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (58:4) کہا ہے صاحب کہ وہ اتنی اہمیت دیتا ہے۔ وہ ان معاملات کو بھی' معاملات چھوٹے ہوں یا بڑے ہوں' جب اللہ کا کوئی فیصلہ قرآن کریم کے اندر آ گیا تو وہ تو یکساں ہو جاتا ہے۔صاحب! یہ جو ان حدود کی خلاف ورزی کرنے والے ہیں یا ان کو توڑنے والے ہیں' ان کے متعلق کہا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ (58:5) گویا حدود جو ہم نے مقرر کر دی ہیں' واضح احکام ہیں' جن کے مطابق یہ حدود متعین کی گئی ہیں' جو ان کے راستے میں یہاں ہیں۔ یہ جو يُحَآدُّوْنَ ہے' وہی حدود ہے' جہاں سے یہ لفظ بنا ہے۔ جس کو یہ حد کہا جاتا ہے اس کے معنی رکاوٹ بھی ہوتا ہے' روک ڈالنا اور حقیقت میں حد ہوتی بھی روک ہے تو کہا یہ کہ یہاں تک ہے' اس سے آگے نہیں۔تو یہ ہے۔ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ (58:5) یہ خدا کی حدود ہیں۔

## انسانی معاشرے میں اسلامی اور غیر اسلامی ہونے کا تعین کرنے کے لیے قرآن حکیم کو معیار نہ بنانے کا نتیجہ جہنم ہے

عزیزانِ من! ''اللہ اور رسول کے احکام'' کے متعلق تو میں نے یہ بتایا ہوا ہے اور یہ بات تفصیل کے ساتھ کئی درسوں میں آ گئی ہے کہ

یہ جو نبی اکرم ﷺ کے بعد ''اللہ اور رسول کی جو اطاعت'' ہے' یہ اسلامی مملکت کی اطاعت ہے' جو قرآن کریم کی رو سے قائم ہوگی۔ اسے یاد رکھیے گا جب بھی اسلامی مملکت کہا جائے گا' میں بہرحال جب بھی یہ کہوں گا' تو اس کے معنی اس مملکت کے ہوں گے جو قرآن حکیم کی رو سے قائم ہوا اور اس کا اعلان یہ ہو کہ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ[1] (5:44) جو خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے کافر کہا جاتا ہے۔ تو یہ ہے جو میں اسی فرق کرنے کے لیے عام طور پہ خلافت علیٰ منہاج رسالت کہتا ہوں۔ اسلامی تو ہر چیز کو کہا جا سکتا ہے' (مثلاً) اسلامی نظام' اسلامی حکومت' اسلامی قوانین' اسلامی شریعت' مگر اسلامی کے متعلق کوئی متعین ہی نہیں کرتا کہ اسلامی کسے کہا جائے اور غیر اسلامی کسے کہا جائے گا۔ فقہ کی کسی کتاب کا ایک فیصلہ ہوتا ہے' اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ اسلامی قانون ہے تو یہ بات تو پہلے طے کیجیے کہ کسے اسلامی کہا جائے گا۔ قرآن حکیم نے تو اسلامی اور غیر اسلامی کے لیے حد مقرر کر دی ہے کہ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ (5:44)۔ یہ سورۃ المائدۃ ہے۔ آیت 44 ہے اور تین آیتیں ہیں ان میں الظّٰلِمُوۡنَ (5:45) بھی کہا ہے الۡفٰسِقُوۡنَ (5:47) بھی کہا ہے۔ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ وہاں تو یہ معیار اور قولِ فیصل ہے کسی چیز کے اسلامی اور غیر اسلامی ہونے کا۔ کہا کہ جو بھی ان حدود کو توڑتے ہیں یقیناً آخر الامر ان کو ذلیل ہونا پڑے گا' اب وہ تو ہماری صدرِ اول کی تاریخ بتاتی ہے کہ جنہوں نے بھی نبی اکرم ﷺ کی' اس تحریک کی' قرآن کی' اسلام کی' اس مملکت کی مخالفت کی تھی' آخر الامر ان سب کو جھکنا پڑا۔ وہ لوگ Surrender سرنگوں ہوئے تھے' تو یہ جو قرآن حکیم نے کہا ہے کہ ان لوگوں کو یقیناً جھکنا پڑے گا' سرنگوں ہونا پڑے گا' ذلیل ہونا پڑے گا' اسی طرح جس طرح سے کہ اس سے پہلے وہ اقوام' جنہوں نے خدا کی حدود کی خلاف ورزی کی تھی' وہ بھی شکست خوردہ ہوئے تھے' ان کو بھی جھکنا پڑا تھا تو یہ حدود اللہ تو ایک ایسی چیز ہے۔

## قرآن حکیم ایک ایسی ابدی حقیقت جس کی روشنی نہ کبھی ماند پڑی ہے اور نہ کبھی پڑے گی

عزیزانِ من! قرآن حکیم نے یہ جو کہا ہے کہ ایسا ہو نہیں سکتا کہ کافر مومنوں کے اوپر کبھی غلبہ پا سکیں تو یہ ایک ابدی حقیقت ہے۔ یہ کسی خاص دور کے مومنین کے متعلق یا کفار کے متعلق نہیں ہے۔ یہ ایک ابدی حقیقت ہے۔ جماعتِ مومنین یا مومن قوم یا اپنے آپ کو مومن یا مسلمان کہنے والی قوم کا پہلا ہی معیار یہ ہے کہ وہ مومن ہیں یا نہیں' وہ یہ ہے کہ اگر کفار ان پہ غالب آئے ہوئے ہیں تو وہ قرآن حکیم کی اس تشریح کے مطابق مومنین کی صف میں نہیں آ سکتے ورنہ آپ کو معاذ اللہ قرآنِ حکیم کو جھٹلانا پڑے گا۔ یہ کہتا ہے کہ مومن پر کفار کبھی غالب نہیں آ سکتے بلکہ یہاں لَنۡ یَّجۡعَلَ اللّٰہُ لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ سَبِیۡلًا (4:141) ہے۔ غالباً خدا ایسا نہیں ہونے

---

[1] یاد رکھو! جو شخص اس قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتا جسے خدا نے نازل کیا ہے' وہ کافر ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن ص 255)

دے گا تو اگر آپ دیکھیں کہ ایک قوم یا جماعت جو اپنے آپ کو مومن کہتی ہے' مسلمان کہتی ہے' اس پر کفار غالب ہیں تو پھر تو آپ یہ مانیں گے کہ اگر یہ واقعی مومن ہیں تو معاذ اللہ خدا کا وہ جو وعدہ ہے' وہ غلط ہو گیا معاذ اللہ' اور وہ وعدہ تو غلط نہیں ہو سکتا تو اگلی چیز یہی ہے کہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ قوم یا جماعت' مومن کی Definition (تعریف) پہ پوری نہیں آ رہی۔ ایسا ماننے کے لیے تو بڑی دلیری کی ضرورت ہے' بڑی قوت کی ضرورت ہے' بڑی جرأت کی ضرورت ہے لیکن حقائق تو حقائق ہیں' آپ کے نہ ماننے سے وہ حقائق بدل نہیں جاتے ہیں۔

## شترمرغ کی کیفیت' کفار کے لیے عذاب' قرآنی انقلاب اور خدائے علیم

آج تو ساری دنیا کے اندر ایک ارب کے قریب مسلمانوں کی آبادی بتائی جاتی ہے۔ چالیس سے زیادہ ان کی مملکتیں آباد ہیں۔ یہ جتنی مملکتیں ہیں' کسی نہ کسی نوعیت اور جہت سے' کفار ان پر غالب ہیں تو اب آیئے قرآن کریم کے ان وعدوں کی روشنی میں' ان چیزوں کا جائزہ لیجیے پھر جس نتیجے پہ پہنچ سکتے ہیں اس پہ پہنچیے۔ پہنچنے کے بعد پھر ہمت کی ضرورت ہو گی' پھر اپنے آپ کو شترمرغ کی طرح ریت میں سر دے کر خطرے سے محفوظ ہونے والی بات نہیں رہے گی لیکن اس میں سے تو یہ سارا زور ہی ختم ہو جاتا ہے۔

یہ جسے' آپ آج اسلامی کہہ رہے ہیں وہ یہ بات بھی آتی ہے کہ وہ کہا تھا کہ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (58:5) ان کی خلاف ورزی کرنے والے ذلیل ہونگے۔ یہاں ''مھین'' ہے' عذاب بھی ذلت آمیز عذاب ہے. کہا ہے کہ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا اَحْصٰهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (58:6) یہ جو ہے کہ جب خدا ان سب کو اٹھا کھڑا کرے گا' اکٹھا کرے گا' تو عام طور پہ تو ہمارے ذہنوں میں یہی ہے کہ قیامت کے دن یہ ہو گا' لیکن جیسا کہ میں نے یہ عرض کیا ہے' کہ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں یہ چیز ہے کہ یہاں بھی وہ انقلابِ عظیم جو حضورؐ کے ہاتھوں برپا ہوا تھا' اس میں یہ چیزیں محسوس طور میں اسی دنیا کے اندر بھی سامنے آ گئی تھیں' اسی پر میں زور دے رہا ہوں کہ وہ جو مرنے کے بعد کی زندگی میں جو کچھ قرآن مجید نے کہا ہے' وہ برحق ہے' وہ اپنے مقام پر ہو گا لیکن یہ نہیں ہے کہ یہ وہیں جا کر ہوں گے۔ ان اعمال کے جو نتائج ہیں' سامنے ہیں' اس زندگی میں' اس دنیا کے اندر بھی' اگر قرآنی انقلاب رونما ہو گا تو یہ سب کچھ ہو گا جو قرآن کریم بتا رہا ہے تو کہا کہ اسوقت ہم بتا دیں گے کہ تم کیا کیا کرتے تھے۔ یہ بڑے عجیب انداز میں کہا ہے۔ کہا ہے کہ اَحْصٰهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ (58:6). تم تو شاید بھول جاؤ لیکن خدا نے اس کو محفوظ کر رکھا ہے' وہ نہیں بھولتا کہ تم نے کیا کیا تھا' وہ ہر شے کے اوپر نگران ہے' شھید ہے' وہ تو بصیر ہے' وہ تو سمیع ہے' وہ تو علیم ہے' تو یہ جو کہا ہے کہ تم تو اس کو بھول سکتے ہو' خدا نہیں بھلا سکتا. کہا کہ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (58:7). تمہیں اس کا علم نہیں ہے کہ خدا علم رکھتا ہے' جانتا ہے جو کچھ بھی ارض اور سما کے اندر ہے' ساری کائنات کے اندر جو کچھ بھی ہو رہا ہے' خدا کو اس کا علم ہے تو جو کچھ تم کر رہے ہو' کیا

اس کا علم خدا کو نہیں ہے؟ اور علم ہونے کے بعد ٹھیک ہے تم تو بھول سکتے ہو اور خدا تو اس کو نہیں بھول سکتا۔

## قرآن حکیم کا تو ایک ایک لفظ سدا بہار پھول کی تازگی اور اس کی خوشبو کے پیغام کو اپنے اندر لیے ہوئے ہوتا ہے اور خدا ہر جگہ موجود ہے

اب آگے ایک اہم بات آ رہی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ ہماری عام اصطلاح میں یہ جو چھوٹے چھوٹے احکام ہیں اور معاشرتی زندگی سے متعلق ہیں لیکن یہ جو قرآن حکیم کے اندر آ گئے اور محفوظ ہو گئے' وہ چھوٹے اور بڑے نہیں رہتے۔ ان میں سے ہر شے اپنے مقام پر خدا کا حکم ہوتی ہے اور یہ چھوٹے چھوٹے جتنے معاشرتی احکام ہیں' ان کو بھی قرآن حکیم نے بڑی اہمیت سے بیان کیا ہے کہ معاشرے میں ان چھوٹی چھوٹی جزئیات سے ہی حقیقت میں جو بڑی بڑی معاشرتی زندگی کے اجزاء ہوتے ہیں' مرتب ہوتے ہیں۔ ان چھوٹی چھوٹی سی باتوں کے اوپر ان میں سے ایک یہ ہے کہ مَا یَکُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَۃٍ اِلَّا ھُوَ رَابِعُھُمْ وَلَا خَمْسَۃٍ اِلَّا ھُوَ سَادِسُھُمْ وَلَآ اَدْنٰی مِنْ ذٰلِکَ وَلَآ اَکْثَرَ (58:7)۔ بات یہ تھی' قرآن کہہ یہ رہا تھا کہ وہ جانتا ہے کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے' تو کیا جو کچھ تم کر رہے ہو وہ اس سے بے خبر ہے؟ نہیں' ہرگز نہیں۔ کہا کہ اس کے علم کی کیفیت یہ ہے کہ تم آپس میں خفیہ مشورے بھی کچھ کرو' جس کے متعلق تم یہ اطمینان کر لو کہ کوئی ان سے واقف نہیں ہے' نہ ہو سکتا ہے۔ ایسے خفیہ مشورے تم میں سے تین آدمی بھی ایسے کریں تو چوتھا ان میں خدا ہوتا ہے' اگر پانچ اس قسم کے کریں تو چھٹا ان میں خدا ہوتا ہے یعنی وہ تو تمہارے ان مشوروں میں' جہاں تم اطمینان کرتے ہو کہ کوئی اور غیر نہیں ہے' تو وہاں ہم ہیں' جو تین ہیں ان میں ایک ایسا خدا موجود ہوتا ہے اس لیے اس سے تم کیا چھپا سکتے ہو۔

## اگر تم ایک ہوتے ہو تو دوسرا وہاں خدا ہوتا ہے اور خدا کے قانون کے مطابق ان کے نتائج مرتب ہوتے ہیں

اور وہ تو یہ ہے کہ وَلَآ اَدْنٰی مِنْ ذٰلِکَ وَلَآ اَکْثَرَ اِلَّا ھُوَ مَعَھُمْ اَیْنَ مَا کَانُوْا (58:7). بات جامع کر دی کہ یہ تین اور پانچ کی بات نہیں' وہ تو مثال کے طور پہ کہا تھا۔ جہاں بھی یہ ہیں' خدا ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ یہ بڑی اہم چیز تھی جو میں نے آپ سے معراج کے واقعہ کے سلسلے میں عرض کیا تھا کہ خدا نے یہ کہا ہے کہ جہاں بھی تم ہو' خدا تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔ اس لیے خدا سے ملنے کے لیے کسی مقام پر جانے کی بات نہیں ہے' وہ تو ہر جگہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے صاحب! یہاں کہا ہے کہ وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے یعنی کوئی خاص انسان نہیں' جن کے ساتھ ہوتا ہے' وہ کہتا ہے کہ خدا ان کے بھی ساتھ ہوتا ہے جہاں بھی یہ ہوتے ہیں۔ اَیْنَ مَا کَانُوْا ثُمَّ یُنَبِّئُھُمْ بِمَا عَمِلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (58:7) اور پھر جو کچھ تم کر رہے ہو' خدا کے قانون کے مطابق ان کے نتائج مرتب ہوتے چلے جاتے ہیں' اسی قانون کی رو سے ایک وقت میں وہ محسوس طور پر سامنے آ جاتے ہیں۔ اسے قرآن حکیم میں یوم القیٰمۃ کہا گیا ہے۔

## لفظ قیامت کا لغوی مفہوم اور اس کے متعلق علامہ اقبال کی نگاہِ بصیرت

آپ کو شاید یاد ہو' میں نے عرض کیا تھا کہ قیامت' قیام تو ہے' یہ اٹھ کھڑے ہونا ہے اور عربی زبان کے قاعدے کی رو سے اگر اس قسم کے الفاظ کے آگے یہ گول سی (ۃ) لگا دی جائے تو اس کے معنی ہوتے ہیں ''اچانک کوئی چیز ہو جانا' شدت سے کسی چیز کا ہو جانا'' تو اس میں دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں کہ ہنگامی طور پر' یکلخت کوئی چیز ہو جائے یا بڑی شدت سے ہو جائے تو یہ قیامت ہوتی ہے۔ قیام جو بڑی شدت سے ہو' ہنگامی طور پہ ہو' اسے ہمارے ہاں انقلاب کہتے ہیں۔ تو اس دنیا کے اندر وہ انقلاب جو حضورؐ کے ہاتھوں برپا ہوا' وہ جو تھا اسے بھی اس اعتبار سے قیامت کہا جائے گا' جب بھی ان کی اس قسم کے جو سازشیں تھیں' ان کے محسوس نتائج مرتب ہو کر سامنے آنے کا جو وقت ہوگا' اس زندگی میں ہوگا' جب بھی وہ قیامت کہلائے گا' اس کے بعد کی زندگی میں ہوگا جب بھی وہ قیامت کہلائے گا۔ وہ قیامت اخروی زندگی کی ہوگی یہ قیامتِ موجود ہوگی۔

هزار حیف نه بینی قیامتِ موجود ❶

اقبالؒ جو کہتا ہے کہ

سخن ز نامه و میزاں دراز تر گفتی

اس آنے والی قیامت کے میزان اور وہاں کے نامہ اعمال کی تو باتیں بڑی لمبی لمبی تم کر رہے ہو مگر

هزار حیف نه بینی قیامتِ موجود

وہ قیامت جو اس وقت برپا ہے' وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے نہیں ہے۔ اگر انسان کہیں قیامتِ موجود کو دیکھنے کو لگ جائے تو پھر وہ کچھ کرے ہی نہیں کہ جس کے قیامت کے برپا کرنے کے لیے وہ اسٹیج ہوتی ہے۔ کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (58:7) وہ تو تمام معاملات سے' تمام اشیاء سے' واقف ہے۔

## عہد نبوتؐ کے دورِ اولیٰ میں پیدا ہونے والی مشکلات کا ذکر: اثم' عدوان' منافقت کا مفہوم

آگے کہا کہ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ یَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَیَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِیَتِ

---

❶ زبورِ عجم میں یہ شعر یوں آیا ہے:

سخن ز نامه و میزاں دراز تر گفتی — بحیرتم که نه بینی قیامت موجود

[تو نے (قیامت کے روز) نامہ اعمال اور ان کو تولنے کے ترازو کی بات تو بڑی لمبی چوڑی کی ہے۔ میں حیرت میں ہوں کہ تُو اس قیامت کو نہیں دیکھ رہا جو تیرے سامنے موجود ہے]

الـرَّسُوْلِ (58:8)۔میں نے عرض کی اہے کہ یہ جو اسلامی مملکت کا' خاص طور پہ مدینے میں پہنچ کر ابتدائی دور تھا' اس کے اندر بہت سے منافق جمع ہو گئے تھے۔ یہ ایک تفریق ذہن میں رکھیے گا کہ ایک تو ان کا ذکر جنہیں اعراب کہتے تھے کہ ہم ایمان لے آئے اور ان سے کہا تھا کہ ابھی یہ نہ کہیں کہ ہم ایمان لے آئے' کہیں یہ کہ ہم نے اسلامی مملکت کے سامنے اپنے آپ کو سرنڈر کر دیا ہے۔ ایمان کی بات ابھی اس لیے نہ کریں کہ وَلَـمَّا یَـدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ (49:14) ایمان ابھی ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔ تو صاحبِ ایمان کہنے کا حق اس کو ہے جس کے دل کی گہرائیوں میں ایمان اتر جائے۔ اگر وہ بات نہیں ہوئی ہے تو یہ ہے کہ انہوں نے سرنڈر کر دیا ہے تو ایک شق تو یہ تھی۔ یہ اعراب منافق نہیں تھے' یہ وہ تھے جن کے ایمان میں ہنوز پختگی نہیں آئی تھی لیکن ایک وہ لوگ تھے جو ایک سازش کے ماتحت تھے' انہوں نے ایمان اور اسلام قبول ہی نہیں کیا تھا۔ وہ ظاہر میں مسلمان ہو کر' ان مسلمانوں کے اندر شامل ہوتے تھے اور سازشیں کرتے تھے۔ یہ ہیں جنہیں منافق کہا جاتا ہے اور وہ تو پھر اگر زبان کے اعتبار سے لیں تو نظر آتا ہے کہ یہ عرب کیا زبان رکھتے تھے اور قرآن کریم نے ان کے لیے کیا لفظ استعمال کیا ہے۔ وہ لفظ ہے منافق۔ لفظ منافق کے معنی ہوتے ہیں' دو لفظوں میں' میں عرض کر دوں' کہ وہ شخص جو کسی جگہ اندر داخل ہونے سے پہلے' یہ دیکھ لے کہ باہر نکلنے کا راستہ کونسا ہے۔ کیا بات ہے منافق کی Definition کی۔ صحراؤں میں یا جنگلوں میں بعض چوہے ہوتے ہیں' انہوں نے جو اپنے بل بنا رکھے ہوتے ہیں' ان بلوں میں انہوں نے اندر سے کئی راستے اور بھی چوری چوری کے بنا رکھے ہوتے ہیں۔ ادھر سے وہ اس بل میں گھستے ہیں اور اگر پھر کوئی خطرہ ہے تو جس بل سے وہ ادھر گھسے ہیں' اس سوراخ کو وہ بند بھی کر دے یا وہاں وہ جسے چور دروازہ کہتے ہیں یعنی دوسری طرف وہ آگے راستے اس نے پہلے ہی رکھ چھوڑے ہوتے ہیں' وہ وہاں سے نکل جاتے ہیں' تو عرب اسے منافق کہتے تھے۔ کہا کہ ان سے منع کیا گیا تھا کہ اس قسم کے خفیہ مشورے کرو۔ ہمارے دور میں اسے Mysterious Campaign کہتے ہیں۔ یعنی کانا پھوسی کرنا' مثلاً چپکے سے صبح اُٹھے اور آ کر کہا کہ سنا بھی ہے تم نے' کچھ ویسے تمہیں کیا واسطہ ان چیزوں سے' لیکن جب یہ بات آ گئی تو میں نے کہا کہ آپ کو بتا دوں۔ وہ دیکھا صاحب! جو اتنے بڑے مومن بنے پھرتے تھے' ان کے ماتھے پہ محراب دیکھیے۔ کیا ان کا قرآن! کیا نماز! لیکن ہمیں کیا واسطہ کسی سے۔ بات نہ کیجیے گا اور شام تک سارے شہر میں وہ گھوم جاتی ہے اور کسی کو آپ پکڑ نہیں سکتے کہ کس نے یہ بات کی۔ سارا معاشرہ ہی منافقین کا ہو گیا۔ کسی پہ آپ اعتماد ہی نہیں کر سکے۔ ان سے کہا گیا تھا کہ یہ حرکتیں نہ کیا کریں لیکن اس کے باوجود وہ یہ کچھ کرتے ہیں۔ یہ کہا کہ بِـالْاِثْـمِ وَالْعُدْوَانِ (58:8) اور وہ تخریبی کارروائیوں کے متعلق جو کچھ کرتے ہیں تو خفیہ مشوروں کی ضرورت ہی نہیں ہوتی وہ تو اعلانیہ کیے جاتے ہیں۔

اثم اور عدوان دونوں چیزوں کا ہمارے ہاں تو گناہ ہی ترجمہ کر دیا جاتا ہے۔ تو قرآن حمید تو الگ الفاظ لاتا ہے۔ عربی زبان میں' میں نے عرض کیا ہے کہ مرادفات ہوتے ہی نہیں۔ اثم یوں سمجھ لیجیے جیسے جس چیز کا تعلق اپنی ذات تک ہی ہو اور اس سے ایک میزان پیدا

ہو افسردگی پیدا ہو۔ عدوان وہ ہے کہ جو انفیکشن دوسروں تک بھی پہنچ جائے۔ آپ نے یہ متعدی امراض سنا ہوا ہے یہ تو بعض تو اس قسم کی حرکتیں ہوتی ہیں' جن کا اپنی ذات تک تعلق ہوتا ہے مثلاً ایک شخص افیون کھا لیتا ہے' افیون کھانے کا عادی ہے تو اس کی اپنی ذات تک اس کا نقصان ہے لیکن دوسرا شخص جو ہے' جو ہنگامہ برپا کر دیتا ہے وہ متعدی بھی ہو جاتا ہے۔ قرآن حمید نے اس قسم کی چیزیں کہی ہیں۔ ایک اثم ہے جس کے اندر اپنی ذات تک اضمحلال ہوتا ہے۔ ایک عدوان ہے جس میں سرکشی ہوتی ہے' جو معاشرے میں پھیل جاتی ہے۔ کہا کہ یہ اس قسم کی سازشیں کرتے رہتے ہیں' مشورے' جسے میں نے Mysterious Campaign عرض کیا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی خلاف ورزی معصیت ہے' یہ اس قسم کے مشورے کرتے تھے۔ ان کو منع کیا تھا کہ یہ نہ کرو۔ کھلے بندوں یا مخالفت کرو' یا کھلے بندوں موافقت کرو۔ یہ تمہارا کیا انداز ہے! کہا کہ وَاِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ وَيَقُوْلُوْنَ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ (58:8)۔ ان کی منافقت کی یہ کیفیت ہے۔

منافقت کا کردار بڑا ہی گھناؤنا ہوتا ہے۔ وہ آتے ہیں تو سیدھی جس طرح سے تمہارے لیے اسلام علیکم کہا ہے کہ کہا کرو سلامتی۔ وہ ایک دوسرے کی یہ زبان کو ذرا سا پھیر دیتے ہیں' لفظ بھی ذرا سا دبا دیتے ہیں' اسام علیکم۔ اس کے معنی ہیں تجھ کو موت آئے۔ کہتا ہے کہ کیفیت یہ ہے کہ یہ اتنی چیز بھی انکی تنگ نگہی کی یہ کیفیت ہے کہ وہ اتنی سی بات بھی تم سے کہنا نہیں چاہتے' اس میں کچھ نہ کچھ منافقت کا پہلو رکھ لیتے ہیں۔ ذرا سا زبان کو دبایا اور اسام علیکم۔ جی کہ پتہ ہی نہیں چلے کہ اسلام علیکم کہا ہے یا اسام علیکم کہہ رہے ہیں لیکن ان منافقین سے زیادہ بدتر وہ ہیں کہ کہیں گے زبان سے اسلام علیکم' دل میں یہ ہوگا کہ تمہارا بیڑہ غرق کر کے رہونگا' یہ ہم ہیں۔

## معاشرتی طور پر آج ہماری حالت اور پھر مہلت کا وقفہ خدا کا ایک ابدی اصول

کسی پہ کسی دوسرے کا آج اعتماد ہی نہیں رہا۔ آپ کو کبھی اطمینان نہیں ہوتا کہ جو کچھ یہ کہہ رہا ہے' واقعی ایسا کر کے بھی دکھائے گا۔ کہا کہ اسے کہا گیا تھا کہ یہ نہ کرنا' یہ کرتے ہیں۔ یہ آ کر کہتے ہیں تو اس کے بعد دل میں خوش ہوتے ہیں کہ کسی کو پتہ نہیں چلا۔ اگر یہ خدا ان کا ایسا ہی جانتا ہے سب کچھ تو وہ ہمیں سزا کیوں نہیں دیدیتا۔ کہا کہ ٹھیک ہے یہ روز کی باتیں ہم سنتے ہیں لیکن ہم اس قانون کے پابند ہیں جس کی رو سے عمل اور اس کے نتیجے کے درمیان ایک مہلت کا وقفہ ہوتا ہے اور ہم نے یہ کہہ رکھا ہے کہ ہم اپنے قانون کے خلاف خود بھی نہیں کریں گے۔ جانتے ہیں تم کیا کرتے ہو یہ طنز آمیز بات بھی سنتے ہیں' ہم جو کہہ رہے ہوتے ہیں اگر واقعی خدا کو یہ معلوم ہے تو پھر وہ ہمیں سزا کیوں نہیں دیتا' پکڑتا کیوں نہیں ہے' ہمیں یہ بھی سن رہے ہیں اس کی وجہ وہ ہے جو ہم تمہیں بتا دیتے ہیں۔ وہ وقت آئے گا جب یہ پختہ نتائج ہو جائیں گے اور وہ محسوس طور پر سامنے آنے کا وقت ہوگا۔ اس وقت تم دیکھو گے کہ خدا جانتا ہے اور گرفت کرتا ہے یا نہیں؟ کہا

کہ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ يَصْلَوْنَهَا فَبِئْسَ الْمَصِيرُ (58:8) پھر اس وقت وہ جو جہنم ہوگا' وہ تمہیں بتائے گا کہ خدا واقعی جانتا تھا' وہ اس میں داخل کیے جائیں گے اور دیکھ لیں گے کہ وہ کیسا برا ٹھکانا ہے۔

## کچھ ذکر جماعت مومنین کا

اب قرآنِ کریم جماعتِ مومنین کی طرف آ گیا۔ کہا کہ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ (58:9) اے جماعتِ مومنین! جب تم نے باہمی مشورے کرنے ہوں' تو جرائم کے ارتکاب اور نظامِ خداوندی کے خلاف سرکشی سے مشورے مت کرو۔ ہمیشہ بھلائی اور تقویٰ یعنی قوانین خداوندی کی نگہداشت سے متعلق امور میں مشورے کرو۔ اس میں تمہیں بھی آپس میں باہمی مشورے کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ کہا کہ ٹھیک ہے' مشورہ کرنا گناہ یا جرم نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ کسی مقصد کے لیے مشورہ کیا جاتا ہے۔ یہ مخالفین اس نظام کی' اس مملکت کی' اس دعوت کی' تخریب کے لیے' مخالفت کے لیے' اثم کے لیے' عدوان کے لیے' معصیت رسول کے لیے' مشورہ کرتے ہیں۔ یہ ہے جو چیز منع ہے۔ تم بھی مشورہ کر سکتے ہو لیکن مشورہ کرو تو ان باتوں کے لیے نہیں کرو۔ کہا ہے کہ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى (58:9) یہ قرآن حمید کی اصطلاحیں ہیں۔ عام طور پہ ان کا ترجمہ نیکی تقویٰ پرہیزگار ہوتا ہے لیکن میں مختلف مقامات میں بتاتا چلا آ رہا ہوں کہ ان کے صحیح معنی کیا ہیں۔ بہر حال اچھے کاموں کے لیے کہہ لیجیے۔ جنہیں قرآن حکیم اچھا قرار دیتا ہے' ان کے لیے مشورے کرو جو تم نے مشورے کرنے ہیں۔ کہا کہ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ (58:9) خدا کے احکام اور قوانین کی خلاف ورزی سے محتاط رہو کیونکہ یہ چیز یونہی نہیں ہے کہ تم نے کیا' معاملہ ختم ہو گیا' یہ تو ان تمام چیزوں کے نتائج ایک وقت پہ سامنے آئیں گے۔ اس پر ایمان رکھ کر پھر یہ کچھ کرو۔

## تخریب کاری کے لیے خفیہ مشورے کرنا شیطان کا عمل ہے اور شیطان کا قرآنی مفہوم

کہا ہے کہ اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْئًا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (58:10) یہ خفیہ مشورے جو ان لوگوں کی طرف سے ہوتے ہیں' وہ تخریب کے جذبات کے ہوتے ہیں' کہا کہ درحقیقت ان کا محرک جذبہ تخریب ہوتا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ شیطان کی ایک اصطلاح ہے۔ قرآن حکیم کی رو سے شیطان تخریب کاری کرتا ہے۔ ''یہ انسان کے وہ جذبات ہیں جو اُسے قرآن حکیم کے' خدا کے احکام کی سرکشی پر آمادہ کرتے ہیں' بلکہ یوں کہیے کہ وہ اس چیز کے محرک ہوتے ہیں''۔ وہ ہیں جسے قرآن حمید شیطان کہہ کر پکارتا اور جو اس قسم کی سازشوں کے سرغنے ہوتے ہیں انہیں بھی شیاطین کہہ کر پکارتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ جو ان کے ہاں کے خفیہ مشورے ہیں' جو وہ تخریب کے لیے کرتے ہیں' اس کا محرک' ان کا یہ جذبہ ہوتا ہے۔ تخریب کا جذبہ ہے' یہ تمہیں نقصان پہنچانے کا

جذبہ ہے' یہ اس دعوت کے راستے میں روڑے اٹکانے کا جذبہ ہے' یہ ان کے ذہن میں ہے کہ اس سے ہم نقصان پہنچا دیں گے۔

## لفظ اذن کا مفہوم یعنی ''خدا کا مقرر کیا جانے والا قاعدہ'' زیادہ مناسب ہے

اب یہاں وہ لفظ اذن آیا ہے. کہا ہے کہ وَلَیْسَ بِضَآرِّهِمْ شَیْـًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (58:10). تو اذن کا عام طور پہ ترجمہ ہمارے ہاں اجازت یا حکم کیا جاتا ہے یعنی خدا کے حکم سے۔اذن کے عام معنی بھی یہی لیے جاتے ہیں۔تو میں نے یہ عرض کیا تھا کہ قرآن کریم میں مختلف مقامات پر یہ لفظ بھی استعمال ہوا ہے' زبانی بھی یہ آتا ہے۔اس کے معنی بھی یوں ہیں: ''خدا کا مقرر کیا ہوا قاعدہ۔ نقصان جو پہنچتا ہے وہ تو اس کے مطابق پہنچتا ہے''۔ چونکہ یہ جماعتِ مؤمنین اس کی خلاف ورزی نہیں کرتی ہے اس لیے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔کہا کہ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (58:10) مومن اسی لیے خدا کی ان چیزوں کا بھروسہ کرتا ہے' ان قاعدوں' قوانین کی خلاف ورزی نہیں کرتا کہ اسے پتہ ہے کہ اس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔

## توکل کا حقیقی مفہوم اور مجلس میں منافقین کی غلط سوچ سے محفوظ رہنے کا طریق کہ الگ الگ بیٹھا کرو

کیا بات ہے صاحب! بھروسہ (Confidence) جسے توکل کہا جاتا ہے' اسی پہ کیا جاتا ہے جس کے متعلق آپ کو یقین ہو کہ جو کچھ یہ کہتا ہے' اس کی خلاف ورزی نہیں ہوگی' تو جب خدا نے یہ کہا ہے کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں تو مومن کو تو یقین ہوتا ہے' اس لیے اسے اس بات کا یہ اعتماد ہوتا ہے کہ وہ اپنے کہنے کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔تو یہ ہے جو توکل کے معنی ہوتے ہیں صاحب! اور آپ کو پتہ ہے کہ اب ہمارے ہاں جو تصوف میں توکل ہے' وہ تو یہ پوچھو نہیں کہ کسی چیز کا جو ہر سبب' ہر ذریعہ ہے' اُسے ختم کرتے چلے جایئے' مثلاً یہاں پر توکل کرتے جایئے مسلمان یہ ہوتے ہیں کہ دوسرے کما کر لائیں اور تمہیں روٹی دیتے چلے جائیں۔ یہ ان کے ہاں خدا پہ توکل ہوتا ہے۔کہا ہے کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِیْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا یَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ وَاِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ (58:11) . اب یہ پھر یہ کچھ کرتے تھے' آ کر بیٹھتے تھے تو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ بیٹھتے تھے کہ اِدھر سے کچھ باتیں ہوں تو اُدھر سے کچھ کانا پھوسی کہتے ہیں۔ یہ وہی ہے جسے ہمارے ہاں سرگوشی کہتے ہیں تو وہ ساتھ ساتھ بیٹھنے میں آسانی رہے۔ یہ نہ کرنے سے حکم یہ دیدیا کہ آ کر بیٹھو تو ذرا کھل کر بیٹھا کرو' ایک دوسرے سے ہٹ کر بیٹھا کرو۔اب اس سے وہ جو ان کے ہاں کی کانا پھوسی تھی' سرگوشیاں تھیں' اس کا تو ازالہ ہو گیا کہ ذرا ہٹ کر بیٹھا کرو' اپنے لوگوں سے بھی کہہ دیا کہ تم بھی آ کر بیٹھو تو ذرا ہٹ کر بیٹھا کرو۔اب وہ حکم عام کر دیا جب کہ اس پہ یہ نہ ہو کہ وہ کہیں گے کہ صاحب! ہمارے ہی لیے یہ کہا گیا ہے' ایک عام حکم ہوا کہ مجلس میں آ کر بیٹھو تو ذرا کھل کر بیٹھا کرو تو اگلی بات یہ ہے کہ جب کہا جائے کہ مجلس

برخواست ہوتی ہے تو اُٹھ کر چلے جایا کرو تو یہ نہیں ہے کہ ہم یہ بھی کہیں اور ہم تم الگ الگ ٹکڑیاں بنا کر تین یہاں' دو وہاں' اور ایک یہاں' وہ بیٹھے ہوئے ہیں' پھر یہی کچھ کرتے چلے جائیں۔

## کسی دوسرے کے گھر جانے سے پہلے وقت حاصل کر لینا چاہیے کیونکہ یہ چیز باعث رفعت ہے اور معاسرتی احکامات

میں نے عرض کیا تھا کہ یہ تھا وہ معاشرہ جس میں اس دعوت کی ابتدا ہوئی تھی جس میں نبی اکرمؐ نے یہ عظیم انقلاب برپا کیا تھا' یہ تھے وہ لوگ جن کو یہ کچھ بھی کہنا پڑ رہا تھا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن حکیم نے تو یہ بھی کہا ہے کہ ملنے کے لیے آنا ہو تو پہلے سے Appointment لیا کرو' کسی کے گھر جانا ہو تو اجازت لیا کرو' دعوت کے لیے بلایا جائے تو پہلے ہی آ کر نہ بیٹھ جایا کرو کہ ہانڈی ابھی چولہے پہ رکھی ہوئی ہے اور تم بیٹھ گئے' ہو کھانا کھا کر اپنے گھر چلے جاؤ اور صاحبِ خانہ کو بڑی کوفت ہوتی ہے کہ تم اس کے بعد بھی بیٹھے ہوئے باتیں کرتے ہو یعنی معاشرہ وہ تھا' کہ ان لوگوں کو یہ چیزیں بھی وحی کے ذریعے تعلیم کرنی پڑ رہی تھیں۔ یہ تھے وہ لوگ جن کی تعلیم و تربیت اس طرح سے کی کہ انہوں نے ایران اور روما کی ہزار ہا سال کی تہذیب کو الٹ کر رکھ دیا' یہ تھا انقلابِ نبوی ﷺ۔ تو انہیں یہ کہنا پڑا کہ یہ چیزیں کیا کرو اور یہ چھوٹی چھوٹی باتیں جو ہم کہتے ہیں' ان کو چھوٹی چھوٹی نہ سمجھو' یہ حقیقت میں بہت بڑی باتیں ہیں' جو ایمان والے ہیں انہی کے ذریعے سے ان کو بلند مقام عطا ہونگے اور جو صاحبِ علم ہونگے ان کو خدا درجات عطا کرے گا تو گویا ان چیزوں کی اطاعت سے' اتباع سے' بھی درجات ملتے ہیں' رفعت ملتی ہے' بلندیاں ملتی ہیں' یہ چھوٹے چھوٹے نہیں ہیں' یہ چھوٹی چھوٹی سی باتیں جو قرآن کریم نے کہی ہیں ہم اپنے معاشرے میں ان سے ابتدا کریں تو آپ دیکھیے کہ کس قدر معاشرے کے اندر تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ ان سے رفعت بھی ملتی ہے' درجات کی بلندی بھی ملتی ہے۔

## حضورؐ سے پرائیویٹ گفتگو کرنے کے لیے طریق کار کا تعین

اب یہ تو آپس میں مشورے کرنے کی بات ہے اور نبی اکرم ﷺ سے بھی بعض امور پہ پرائیویٹ گفتگو کرنے کی ضرورت پڑ جاتی تھی کہا ہے کہ **یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً** (58:5). اب وہ لوگ بھی آ کر اسی طرح سے کرتے تھے کہ صاحب! ہمیں رسول ﷺ سے کچھ تھوڑی سی پرائیویٹ باتیں کرنی ہیں' ہمیں اس کے لیے وقت دے دیجیے صاحب! اب اگر تو وہ سازش کے ماتحت آتے تھے ور وہ اسی طرح سے آتے رہیں اور حضور ﷺ کا جو وقت ہے' اس طرح سے ضائع کرتے رہیں تو آپ ﷺ تو کسی اور کام کے رہیں ہی نہیں' اس پہ بھی پابندی کی ضرورت تھی اور پابندی کیا لگائی جائے! یا تو یہ ہو کہ

صاحب! اس کی اجازت ہی نہیں دی جاسکتی' نہ کوئی اس طرح سے آئے' یہ تو ہو نہیں سکتا بعض بڑے اہم معاملات ہوسکتے ہیں کہ جو پرائیویٹ گفتگو حضورﷺ سے کی جائے' علیحدگی میں حضورﷺ سے گفتگو کی جائے' ضرورت پڑے گی تو اس کے لیے ایک چھوٹی سی پابندی لگائی کہ لو بھئی! اس طرح سے اجازت لینی ہو تو تم تھوڑا سا عطیہ دیدو' کچھ غریبوں کی محتاجوں کی مدد کے لیے چلو' کچھ تو پابندی عائد ہوئی۔ وہ جو یونہی آ کر بیٹھ جاتے ہیں اور بیٹھ کے وقت ضائع کرتے ہیں یا شرارت کے ماتحت ایک سازش کرتے ہیں تو ان پہ کچھ تو پابندی عائد ہوگئی' کچھ تو دینا پڑ گیا۔ کہا کہ ذٰلِکَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ وَ اَطۡہَرُ (58:12) یہ بڑی بہتر بات ہوگی اور دل کی پاکیزگی کا موجب بھی بنے گی۔ کچھ دینا پڑے گا تو اس کے اندر کچھ تو کمی ہوگی اور تمہارے ہاں تو یہ چیز ہوگی کہ جس کو واقعی ایک صحیح کام کے لیے کوئی بات کرنی ہوگی' وہی آئے گا۔ اب یہ بات آگے آ گئی کہ حکم تو یہ دیدیا' وہ جو جماعت تھی' خواہ انہوں نے مثال کے طور پر ایک آنہ ہی کیوں نہ مقرر کیا ہو' کہ اس صندوقچی میں پہلے ڈال دیا کرو' ان کے اندر ایسے بھی تھے کہ جو ایک ''آنے''❶ کی بھی استطاعت نہیں رکھتے تھے تو اس حکم سے تو ان پہ یہ راستہ بند ہوگیا۔ اب اس کے اندر اس کا تفاوت ہوگیا جو مالی اعتبار سے Afford کرسکتا ہو۔ وہ پرائیویٹ بات کرسکے اور وہ جو نہ کرسکتا ہو' اس کے اندر دو طبقات آ گئے۔ کہا کہ اگر فَاِنۡ لَّمۡ تَجِدُوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ (58:12) اگر تمہارے ہاں پیسے نہ ہوں تو کوئی بات نہیں' رسول سے آ کر کہہ دیا کرو تو اللہ تمہاری حفاظت کردے گا' کوئی بات نہیں' وہ بڑا غفور بھی ہے' رحیم بھی ہے' وہ حفاظت بھی کرتا ہے' ہماری نشو ونما بھی عطا کرتا ہے۔ اب اس نے اس Exception (استثناء) سے آپ دیکھیے بات کہی ہے صاحب! وہ طبقات کی بات نہیں رہی کہ نہیں ہیں ہے' تو پھر تم یہ کچھ کر ہی نہیں سکتے' بیٹھے رہو' کہیں سے چار پیسے لے آؤ تو پھر آ کر ملاقات کرسکتے ہو۔ یہ ان کے لیے ہے جو کرسکتے ہیں' جو نہیں کرسکتے تو کوئی بات نہیں۔ کہا کہ ءَاَشۡفَقۡتُمۡ اَنۡ تُقَدِّمُوۡا بَیۡنَ یَدَیۡ نَجۡوٰىکُمۡ صَدَقٰتٍ (58:13) وہ لوگ جو Afford نہیں کرسکتے تھے' ان کے دل میں اس سے یہ چیز پیدا ہوئی کہ ہمارے لیے تو یہ مشکل ہوگیا' ہم کیا کریں گے' پھر ہم محروم کردیئے گے۔ اس لیے کہ ہم غریب ہیں۔ کہا کہ فَاِذۡ لَمۡ تَفۡعَلُوۡا وَ تَابَ اللّٰہُ عَلَیۡکُمۡ (58:13) کوئی بات نہیں' یہ نہ کرسکو تو ہم نے قانون میں پہلے ہی تمہارے لیے گنجائش رکھ دی ہے کہ اگر نہیں ہے تو کوئی بات نہیں' جا کر یہ بات کہہ دیا کرو' تمہیں معافی مل جائے گی۔ اگر یہ صورت نہ ہو تو پھر کیا کرو؟ کہا کہ وہ نظام قائم کرو جس میں اس کی ضرورت ہی نہ پڑے صاحب! جو نظامِ اسلامی ہے اس میں یہ چیز ہے۔ کہا کہ وَ اَمۡرُہُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَہُمۡ (42:38)۔ یہ تمہارے باہمی مشورے سے تمام معاملات طے ہوں گے اور وہاں ہے کہ فَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ (58:13) اور اس کے ساتھ اقامتِ صلوٰۃ کہا گیا ہے۔

---

❶ یاد رہے کہ یہ بات مائی 1983ء کو کہی گئی تھی جب 16 ''آنے'' کا ایک روپیہ ہوا کرتا تھا۔

## نظامِ صلوٰۃ کی اہمیت جس میں نماز کا پڑھنا ایک جز ہے

عزیزانِ من! آپ بہرحال کسی طرح سے بھی سمجھیے میں نے تو شروع سے یہ کہا ہے کہ یہ صلوٰۃ کا ایک نظام ہے جس میں حضور ﷺ کی مملکت کے جو احکامِ خداوندی یا فیصلے ہوں ان کے پیچھے پیچھے چلنے کا نظام قائم کرنا ہے۔ اس میں یہ جو ہم نماز پڑھتے ہیں' وہ بھی اس کا ایک جزو ہے۔ یہ وہی نہیں ہے بلکہ اس کا ایک جزو ہے۔ یہ پورے نظام کا نام ہے جس میں ہر فرد ان احکام کا اتباع کرتا ہے۔ یہ اتباع اطاعت سے بھی آگے ہوتا ہے اور پھر وہ نظام قائم ہوتا ہے تو کہا کہ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ [1] (42:38)۔

## حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں کسی علاج کے دوران ڈونڈی پیٹتے وقت الصلوٰۃ جامعۃ الصلوٰۃ کے الفاظ کا استعمال

عزیزانِ من! وہاں یہ چیز اکٹھی چیز آئی ہے۔ ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے ہونگے اور یہ اقامتِ صلوٰۃ کریں گے۔ تو اگر یہ نظام ہو' جس میں باہمی مشاورت اس طرح سے ہو جیسی کہ تاریخ میں ہمارے ہاں ہے کہ جب کوئی اہم معاملہ آتا تھا تو امیر المومنین خلیفہ حضرت عمرؓ کے متعلق خاص طور پہ یہ ہے کہ جب کوئی اہم معاملہ آتا تھا تو ایک جسے وہ ہمارے ڈونڈی پیٹنا ہوتا تھا' اس دفعہ ڈونڈی پیٹ دی جائے' اعلان کرنے والا وہ اعلان کرتا تھا کہ الصلوٰۃ جامعۃ الصلوٰۃ جامعۃ صلوٰۃ کے لیے اکٹھے ہو جاؤ' صلوٰۃ کے لیے اکٹھے ہو جاؤ' اور وہ آتے تھے تو پہلے یہ اسی طرح سے جیسے ہم تلاوتِ قرآنِ کریم سے ابتدا کرتے ہیں' وہ صلوٰۃ کی رکعتوں سے ابتداء کرتے تھے اور پھر وہ امیر المومنین کہتا تھا کہ تمہیں اس لیے بلایا گیا ہے کہ یہ معاملہ درپیش ہے اور اس میں تمہارے مشورے کی ضرورت ہے۔ تو کہا کہ جب اس کھلے نظام میں' اس طرح سے وہ سارے مشورے ہونگے تو خود ہی اس کی ضرورت نہیں رہے گی۔ کہا کہ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (58:13). اب یہ دیکھیے اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ! اور اس کے بعد ہے کہ اطاعت کرو اللہ اور رسول کی تو گویا وہ کوئی الگ چیز نہیں ہے۔ یہ جو پہلے دو چیزیں کہی گئی ہیں' یہ بھی تو اطاعت ہے اللہ اور رسول کی۔ تو گویا حقیقت میں یہ مقصد اطاعت ہے تمام جملہ احکام قرآنیہ کی جو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائے اور نبی اکرمؐ نے جن کو نافذ کیا ان سب کی اطاعت ہے جس کے اندر اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ آجاتا ہے۔ کہا ہے کہ یہ کرو تو وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (58:13). جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کا علم ہے' وہ ان چیزوں کو بھول نہیں جاتا۔

## قبائلی زندگی کے دوران اسلام لاتے وقت دو قوموں کا وجود اور ایمان کے اشتراک پر علیحدگی کا مسئلہ

اب آگے ایک اور حکم آیا اور یہ بڑی اہم چیز ہے۔ یہ جو معاشرہ قائم ہوا یا نظام قائم ہوا' اس میں جتنے لوگ تھے وہ اس سے پیشتر ایک

---

[1] تمام امور کے فیصلے قوانینِ خداوندی کی حدود میں رہتے ہوئے' باہمی مشاورت سے ہونے چاہئیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن ص 1136)

ہی قوم تھے‘ ایک برادری تھے‘ ایک معاشرہ تھا‘ ان کے ہاں تو قبائلی زندگی تھی‘ ایک ایک قبیلہ جو تھا‘ وہ الگ الگ ایک قوم کہلاتا تھا‘ ان میں آپس میں دوستانہ معاہدتے ہوتے تھے‘ ماں باپ بہن بھائی رشتے دار‘ اہلِ خاندان انہی کا نام وہاں قبیلہ ہوتا تھا۔ اب ان میں سے کچھ وہ ہوئے کہ جنہوں نے اسلام قبول کر لیا‘ دوسرے وہ ہوئے جنہوں نے نہ صرف قبول نہیں کیا‘ بلکہ ان کی مخالفت بھی شروع کی۔ اب یہ دو الگ الگ قومیں بن گئیں ہیں۔ اس دور کی تاریخ کے اندر ہے کہ انہی میں سے یہ لوگ جو تھے‘ اس گروہ میں شامل ہو گئے اور دوسرے جو تھے اس کے مخالفین میں ہو گئے لیکن وہ باپ تو باپ ہی تھا‘ بیٹا بیٹا ہی تھا‘ بھائی بھائی ہی تھا‘ آپس میں جو یہ تعلقات نسبی تھے وہ تو اسی طرح سے قائم تھے حتیٰ کہ میاں بیوی وغیرہ عقدی تعلقات تھے ان میں ایسے بھی وہ ہیں کہ وہ بیوی مسلمان ہو گئی ہے اور میاں نہیں ہوا‘ یا تو میاں ہو گیا ہے بیوی نہیں ہوئی ہے یعنی یہ ایک عجیب قسم کی تفریق پیدا ہوئی۔ وہیں کے رہنے والے ہیں اور اسی معاشرے میں‘ انہی قبائل کے اندر رہ رہے ہیں‘ انہی قریش میں سے کچھ حضورؐ کے وہی ہیں‘ کچھ مخالفین ہیں۔ یہ بڑا اہمت طلب مرحلہ تو کیا صورت پیدا ہو‘ پھر ان کے ساتھ اگر ان کے ساتھ تعلقات وہی قائم رہتے ہیں جو پہلے سے تھے ان کو قدم قدم کے اوپر آپس میں مناقشت ہوگی‘ وہ تو ایک گھر کے اندر آپ دیکھیے دو بھائیوں میں یا میاں بیوی میں عام طور پہ خیالات یا اعتقادات کا اختلاف ہو‘ ہر وقت سر پھٹول ہوتا رہتا ہے‘ وہاں وہ تو ہم آہنگی کی ضرورت ہے کہ یہاں کیا کیا جائے۔ تو طے یہ کیا گیا کہ جو لوگ اس طرح سے اسلام لا کر اس دعوت کے ساتھ شامل ہوتے ہیں‘ اُن کا اِن کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ بڑی اہم چیز تھی۔ آج بھی ہم جو برادریوں کی زندگی بسر کرتے ہیں‘ وہ اس کو سمجھ سکتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں۔ برادری چھوڑ دینا‘ خاندان چھوڑ دینا‘ یہ سب کچھ چھوڑ دینا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اور ان سے کہا کہ نہیں‘ ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات نہیں رہ سکتے۔ تو اب بیویوں نے خاوند چھوڑ دیئے۔ میں نے جیسا عرض کیا ہے‘ بھائی سے بھائی الگ الگ ہو گیا‘ باپ سے بیٹا الگ ہو گیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ پہلے سے تعلقات کی ایک نوعیت مختلف ہو گئی پہلے وہ چیزیں نسبی ہوتی تھیں‘ عقدی ہوتی تھیں‘ اب یہ ایمان کے اشتراک کی بنا پر ایک نئی برادری بن رہی ہے اور اسی کا نام دوقومی نظریہ ہے۔

## ایمان کی اشتراک پر دوقومی نظریہ کے وجود کا خاصہ اور منافقین کی ذہنیت

عزیزانِ من! ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات بھی نہیں رکھے جا سکتے: بھائیوں کے ساتھ نہیں‘ باپ کے ساتھ نہیں‘ بیوی کے ساتھ نہیں۔ انہیں چھوڑنا پڑے گا۔ ہجرت تو نام ہی اسی کا ہے۔ انہوں نے صاحب پھر چھوڑا‘ عجیب انقلاب تھا‘ جو ایمان نے پیدا کیا تھا۔ وہیں رہ رہے ہیں‘ وہی اس کی رشتے داریاں ہیں انہیں چھوڑنا پڑا۔ کہا کہ **اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ تَوَلَّوۡا قَوۡمًا غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ مَا ہُمۡ مِّنۡکُمۡ**

**وَلَا مِنْهُمْ** ❶ (58:14)۔اب ان لوگوں کا ذکر ہے۔ آگے کہا ہے کہ **وَيَحْلِفُونَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُونَ** [58:14] **اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** (58:14-15)۔پہلے ان لوگوں کا یہ ذکر ہے پھر منافقین کا آ گیا۔تمہارے ساتھ آ کر کہتے ہیں کہ ''ہم ایمان والے ہیں' تمہارے ساتھ ہیں' تمہاری برادری کے افراد ہیں۔کیفیت یہ ہے کہ ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم ہیں تو جو تمہارے مخالف ہیں یہ ان کی روشِ زندگی ہے۔کہا کہ ایسی روشِ زندگی کا نتیجہ تو عذاب کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا''۔کہا کہ **اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** (58:15) انہیں بہت برا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔یہاں آ کر قسمیں کھاتے ہیں' تمہارے اوپر بہتان لگاتے ہیں اور جب وہاں جاتے ہیں تو ان کے ساتھ اپنے وہی تعلقات قائم رکھے ہوئے ہیں۔یہ ایمان نہیں ہے۔کہا کہ **اتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ** (58:16) یہ اپنی قسموں کو سپر بناتے ہیں۔ڈھال بناتے ہیں۔یہ تفاوت کیلیے دھوکا دے کر جھوٹ بول کر' کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ان کے لیے بڑی ذلت آمیز سزا ہے۔جب یہ نقاب اُٹھے گا' حقیقت بے نقاب ہو گی' تو پھر اس وقت دیکھیے کہ کتنی ذلت اور رسوائی ہو گی کہ کل تک ان میں بیٹھے ہوئے قسمیں کھا کھا کر جو کہتے تھے' حقیقت اس کے برعکس ثابت ہوئی۔عذاب مہین ہے۔اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا۔کہا کہ **لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا** (58:17) ان کا مال و دولت' ان کی اولاد' یہ رشتہ داریاں' اس انقلاب میں کچھ کام نہیں آ سکیں گی' جو خدا برپا کرنا چاہتا ہے۔آگے کہا کہ **اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ** (58:17) تباہ ہو کے رہیں' اس روش کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہیں۔کہا کہ **يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ** (58:18) جب یہ خدا ان کو اکٹھا کرے گا یا اٹھائے گا' جب یہ نقاب سے اُٹھ جائیں گے' حقیقیں جو ہیں بے نقاب ہو جائیں گی تو اس وقت بھی یہ قسمیں کھائیں گے۔کس کے سامنے قسمیں کھائیں گے؟ یہ خدا کے سامنے قسمیں کھائیں گے۔جو ان کے خیالات اور نگاہ کی خیانتوں تک سے واقف ہے یہ ان کی کیفیت ہے اور اپنے ذہن میں یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ کوئی بات نہیں جیسا ہم نے ان مومنین کو دھوکا دیدیا تھا' خدا کو بھی اس طرح سے دھوکا دیدیں گے۔کوئی بات نہیں یہ روش چل جائے گی۔وہ اس معاملے کے اندر بڑے کامیاب ہیں۔یہ اس قسم کے منافق تھے۔

تحریکِ پاکستان کے زمانے میں عجیب بات ہے' نام کیا لینا' علامہ اقبالؒ کے ساتھ ایک دفعہ ذکر ہوا۔وہ کہنے لگے کہ ان کو کسی نے کہا کہ یہ منافق ہیں۔کہنے لگے کہ یہ خالص منافق ہیں۔وہ یہ ہے کہ **وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ** (58:18) خدا کے سامنے کھڑے ہو کر بھی سمجھ رہے

---

❶ ان کی حالت یہ ہے کہ یہ ان لوگوں کے ساتھ دوستی کے رشتے جوڑتے ہیں جو نظامِ خداوندی کی مخالفت اور سرکشی کی وجہ سے مجرم اور سزا کے مستحق قرار پا چکے ہیں۔یہ نہ تو نیک نیتی کے ساتھ تمہارے ساتھ شامل ہوئے ہیں' اور نہ ہی کھل کر تمہارے مخالفین کے ساتھ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 1291)

ہیں کہ ہم دھوکا دے سکتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کی قسمیں ان کا اعتماد قائم رکھتی ہیں۔ کہا کہ اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ الْکٰذِبُوْنَ(58:18) یہ بہت جھوٹ بولنے والے ہیں۔

## دنیا جہاں کی خرابیوں کے لیے قرآن حکیم کا ایک لفظ شیطان یعنی انسان کے اپنے سرکش جذبات

کہا کہ یہ کیفیت کیوں ہوگئی؟ ایک لفظ ہے صاحب! کہا کہ اِسْتَحْوَذَ عَلَیْھِمُ الشَّیْطٰنُ فَاَنْسٰھُمْ ذِکْرَ اللّٰہِ(58:19)۔ یہ لفظ شیطان آیا ہے۔ کیا جامع لفظ ہے شیطان! میں نے عرض کیا ہے کہ انسان کے اپنے پست جذبات' خواہشات ہیں۔ آرزوئیں' مفاد پرستیاں' مطلب پرستیاں ہیں۔ دھوکا دہی' فریب دہی' کے یہ جتنے اس قسم کے جذبات ہیں' انہیں آپ اکٹھا کریں' تو یہ ایک ہی لفظ شیطان کے اندر آجاتے ہیں۔ کہا کہ یہ جو کچھ کرتے ہیں' اس کا جو محرک جذبہ ہے' وہ ان کے جذبات ہیں۔ اس ایک لفظ کی مثال سے بتایا کہ وہ کرتا کیا ہے۔

## شیطان کا طریقۂ واردات

یہ جو گائے' بھینسیں وغیرہ مویشیوں کو چراتے کے لیے آپ باہر لے جاتے ہیں' آپ نے دیکھا ہوگا کہ یہ جو بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے' وہ ان کے پیچھے ہوتا ہے' ڈنڈا اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور وہ ان کو پیچھے سے ڈنڈا مارتا ہے اور وہ پھر اس کے مطابق چلتے چلے جاتے ہیں۔ چلانے کا ایک طریقہ یہ ہے۔ اب یہ جو لفظ ''استحوذ'' استعمال ہوا ہے' یہ جو ڈنڈا مارنے والا ہے' یہ اس کی نگاہوں سے پوشیدہ ہوتا ہے کیونکہ وہ پیچھے ہوتا ہے اور مارتا چلا جاتا ہے' وہ جانور اس کی مدافعت بھی نہیں کرسکتے' وہ سامنے سے مارے تو ایک تو یہ ہے کہ اسے دیکھ بھی لیا پھر کوئی سینگ وینگ تو مارے گی' یہ پیچھے سے مارتا ہے۔ یہ جو عربی زبان کا لفظ ہے استحوذ' اس کے معنی یہ ہیں۔ کہا کہ اِسْتَحْوَذَ عَلَیْھِمْ (58:19) پیچھے سے ڈنڈا مار کر دوسرے کو اس اپنے راستے پہ چلنے کے لیے مجبور کردینا۔ کہتا ہے کہ ان کے جذبات اتنے سرکش ہو کر ان پر مسلط ہو چکے ہوئے ہیں کہ یوں سمجھو جیسے یہ پیچھے سے کسی کو ڈنڈے مار کر ان کو اس قسم کی روش پر چلاتے ہیں تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ آہستہ آہستہ یہ خدا کے ذکر کو' خدا کے قانون کو' خدا ہی کو' بھول جاتے ہیں اور اپنے ہی اس مفاد پرستیوں کے راستے پہ چلتے رہتے ہیں۔ تھوڑے عرصے کے بعد یہ اسے By Habit (عادتاً) کرنے لگ جاتے ہیں' یہ جانور اس طرح سے اسی راستے پہ چلنے لگ جاتا ہے پھر اس کو اس قسم کے ڈنڈے مارنے کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔ اُولٰٓئِکَ حِزْبُ الشَّیْطٰنِ(58:19) یہ شیطانی پارٹی کے افراد ہیں۔

## قرآن حکیم نے اپنے ہاں حزب اللہ کے اندر پارٹی بازی یا فرقہ بندی کو شرک کہا ہے اور حزب اللہ اہل جنت میں

عزیزانِ من! اب آئے وہ دو گروہ' جو میں نے ابھی عرض کیا ہے۔ کہا کہ یہ حزب ہیں' قرآن حکیم نے دو گروہوں کا ذکر کیا ہے۔

ایک ہے حزب الشیطٰن اور دوسرا ہے حزب اللہ یعنی اللہ کی پارٹی اور شیطان کی پارٹی۔ یہ دو ہی پارٹیاں ہیں۔ اللہ کی پارٹی جو یہ اپنے آپکو کہتے ہیں یا ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں' خدا والے کہتے ہیں' خدا پرست کہلاتے ہیں' یہ ان کے اندر وہ دیگر پارٹیاں سب سے بڑا دھوکا ہے۔ قرآن کی رو سے دو ہی پارٹیاں ہیں یا حزب اللہ ہے یا حزب الشیطٰن ہے۔ یہ اس کے اندر مختلف پارٹیاں ہیں۔ حزب اللہ میں مختلف پارٹیوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ شرک ہے' عذاب الیم ہے۔ حزب اللہ کے اندر دوسری پارٹی ہو ہی نہیں سکتی۔ قرآن حکیم نے ان تمام کو اکٹھے کر کے اپنی پارٹی کہا ہے اور کسی کی پارٹی کے اندر پھر چھوٹی چھوٹی پارٹیاں بنانے والے' آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کیا ہوتے ہیں تو شرک تو اسی لیے کہا کہ ہماری پارٹی نام کے اعتبار سے اور اندر سے اس کی بھی پارٹی فلاں صاحب کی پارٹی' فلاں صاحب کی؟ پارٹی کو شرک اس لیے قرار دیا ہے۔ کہا ہے کہ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (58:19) اعلان کر دیا کہ اب بنالیں جتنا بڑا جتھہ انہوں نے بنانا ہے' اپنی پارٹی بنانی ہے' آخر الامر نقصان اٹھائیں گے۔ کہا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اُولٰٓئِكَ فِى الْاَذَلِّيْنَ (58:20) یہ وہی مھین والی بات کہ خدا اور رسول' اسلامی نظام' اسلامی مملکت' قرآنی نظام' کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے والے' ان کی مخالفت کرنے والے' آخر الامر دیکھو گے کہ ذلیل ہو کر رہیں گے۔

کہا کہ كَتَبَ اللّٰهُ (58:21) خدا نے لکھ دیا ہے۔ یہ عام الفاظ میں جو کہا جائے گا' تو ہمارے ہاں تو یہ سب سے بڑی چیز ہوتی ہے کہ لکھ دیا جائے' ورنہ معنی تو اس کتب کے معنی ہیں قانون بنا دیا' قانونِ خداوندی ہے جسے غیر متبدل کہا ہے۔ کیا ہے؟ کہا کہ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِىْ (58:21) خدا اور اس کے رسول ہمیشہ غالب رہیں گے صاحب! تو بات آ گئی ہے اس میں کہ جب ختمِ نبوت کے بعد تو رسول رہیں گے نہیں' پھر آئیں گے نہیں' تو یہ جو کہا ہے کہ خدا ہم اور ہمارے رسول غالب آئیں گے' تو پھر تو رسول تو ہوں گے ہی نہیں' پھر اس کے کیا معنی ہوئے؟ وہی چیز جو میں نے بار بار سمجھائی ہے کہ یہ جو فریضہ ہے۔ اس میں ایک تو نبوت تھی' خدا کی طرف سے وحی پانا' سلسلہ وحی مکمل ہو کر ختم ہو گیا۔ وحی قرآن حکیم میں محفوظ ہو گئی۔ دوسرا سلسلہ ہے اس وحی کے مطابق نظام قائم کرنا' اس کو آگے چلانا' اس کی پیغام رسانی کرنا' یہ فریضہ رسالت ہے۔ قرآن حکیم میں حضورﷺ کی وفات کے بعد کہا کہ اس کتاب کے وارث ہم نے جماعتِ مومنین کو بنایا۔ یہ جو رسالت کا' فریضہ تھا' حضورﷺ کے بعد یہ لوگ اس کو سرانجام دیں گے۔ جب حضورﷺ کے بعد جہاں یہ آیا ہے کہ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِىْ (58:21) خدا اور یہ جماعتِ مومنین جس کو قرآنِ حکیم ابھی حزب اللہ کہے گا' یہ ہیں' جن کے اوپر کوئی دوسرا غالب نہیں آ سکتا۔ اب آئی وہ بات: ان سے کہا کہ وہ منافق تمہارے ساتھ بھی آ کر مل رہے ہیں اور ادھر سے اپنے ان لوگوں کو بھی دوست رکھ رہے ہیں۔ کہا کہ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (58:22) اللہ اور آخرت پر ایمان والوں کی ایک پہچان بتائی اور وہ یہ ہے کہ لَا تَجِدُ وا (58:22) تم کبھی نہیں پاؤ گے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں کو کیا نہیں پاؤ گے؟ کہا کہ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ (58:22) وہ ان لوگوں کے ساتھ دوست داری کے تعلقات قائم رکھیں جو خدا اور رسول کے مخالف ہوں۔ کہا ہے کہ وَلَوْ کَانُوْٓا اٰبَآءَ ھُمْ اَوْ اَبْنَآءَ ھُمْ اَوْ اِخْوَانَھُمْ اَوْ عَشِیْرَتَھُمْ (58:22) خواہ وہ ان کے ماں باپ کیوں نہ ہوں، خواہ ان کے بیٹے بیٹیاں کیوں نہ ہوں، خواہ ان کے بہن بھائی کیوں نہ ہوں، خواہ ان کے عزیز رشتہ دار کیوں نہ ہوں۔ یہ انہیں اپنا دوست نہیں بنائیں گے۔ اب یہ اس جماعت کی ایک نشانی، علامت بتا دی۔ اُدھر ان کی بتا دی کہ نام اسلام کا لیں گے؟ دوست داری کے تعلقات ان سے قائم کریں گے، اِدھر ان کی یہ نشانی بتا دی۔ کہا کہ اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْاِیْمَانَ وَاَیَّدَھُمْ بِرُوْحٍ مِّنْہُ ط (58:22) اور روح کے معنی قرآن حکیم کی رو سے وحی بھی ہیں، عزیزانِ من! تو نصرت اور تائید سے خدا ان کو تقویت بہم پہنچائے گا۔ خدا اس جماعت کو اپنے قوانینِ وحی کے ذریعے مظفر و منصور کرے گا۔ وہ اس کی اطاعت کریں گے تو ان کو تقویت حاصل ہوگی۔ کہا کہ وَیُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا (58:22) اور ان کے لیے ان کی جدوجہد کا انجام، وہ فردوسیں، وہ جنتیں ہوں گی، جن کی شادابیاں کبھی خزاں دیدہ نہیں ہوں گی، ہمیشہ بہار ہوگی، ان کے اوپر۔ وہ معاشرہ کے اندر شادابیاں اور سرسبزیاں دائم اور قائم رہیں گی، جب تک یہ اس طرح سے خدا کے احکام کی اطاعت کرتے رہیں گے، اس میں کبھی خزاں نہیں آئے گی، اس میں کسی قسم کی کمزوری نہیں آئے گی۔

## خدا کے غضب کے معنی غصہ آنا اور رضا کے معنی راضی کچھ مناسب نہیں بلکہ ان کے معنی قوانین کے ہیں

کہا ہے کہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ (58:22) . یہ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ یہ ہم عام الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ترجمہ ان کا کرتے ہیں کہ راضی ہو گیا اللہ ان سے، وہ ان سے راضی ہو گئے۔ یہ راضی ہونا اور یہ جو غضب ہونا ہے کہ خدا ان سے ناراض ہو گیا تو راضی اور ناراض ہونا تو انسانی جذبات ہیں، عزیزانِ من! خدا ان سے بہت بلند ہے۔ غضب کے تو معنی کرتے ہیں ''غصہ آ گیا خدا کو''۔ غصہ آنا، راضی ہونا، یہ انسانوں کے جذبات ہیں۔ جب خدا کے متعلق ہوگا تو وہی ہے جو اس نے قاعدہ بتایا ہے۔ رضا کے معنی ہوتا ہے ''ہم آہنگ ہو جانا کسی چیز کے ساتھ''۔ انہوں نے قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگی اختیار کی، قوانینِ خداوندی کے نتائج نے ان سے ہم آہنگی اختیار کی۔ بنیادی معنی ہی یہ ہیں رضا کے۔ یہ معنی کیجیے تو یہ ساری دشواریاں ختم ہو جاتی ہیں جو اُن معنی کے اعتبار سے پیدا ہوتی ہیں۔ پہلے ہم وہ معنی پیدا کر لیتے ہیں پھر اس کے بعد بحثیں شروع کر دیتے ہیں، پھر ہم فلسفے کی رو سے ان کے لیے ان کے خلاف دلائل دیتے ہیں، اصل تو یہ ہے کہ یہ لوگ قوانین خداوندی سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں اور یہ خدا کے قوانین سے ہم آہنگ ہو جانا بڑی چیز ہے اور یہ کون لوگ ہیں؟ کہا کہ اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ (58:22). یہ خدا کی پارٹی ہے، وہ شیطان کی پارٹی تھی۔ یہ خدا کی پارٹی ہے .

## دنیا بھر کے انسانوں یہ سن رکھو کہ آخر کار کامیابی حزب اللہ کی یعنی قوانین خداوندی کی ہی ہوگئ' حزب شیطان کی نہیں

کہا ہے کہ اَلَآ (58:22) . یہ اَلَآ بہت زبردست چیز ہے۔ سن رکھو! ساری دنیا میں اعلان کیا جا رہا ہے۔ اسے سن رکھو! کیا سن رکھو؟ کہا کہ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (58:22) یہ حقیقی بات ہے' یقینی بات ہے کہ حزب اللہ ہی کامیاب ہوگی' یہ کامیاب نہیں ہونگے اور اب ساری دنیا میں ناکام' یہ ایک ارب مسلمان ہے' جو اپنے ذہن میں' بزعمِ خویش' سمجھے ہوئے ہیں کہ ہم حزب اللہ ہیں اور پارٹیاں تو پوچھو نہیں کہ کتنی ہیں' قومیں کتنی ہیں ان کے اندر' حزب اللہ کے اندر' ایک قوم کے اندر' پارٹیاں کتنی ہیں' پارٹیوں کے اندر جتھے کتنے ہیں' برادریاں کتنی ہیں' پھر ان کے اندر ان کی مختلف تحریکیں ہیں' ان کے اندر کتنی ان کی جاذبیتیں ہیں' ہم تو فرد کی حیثیت سے جی رہے ہیں' حقیقت میں پارٹیوں میں بھی ہر فرد اپنے اپنے مفاد کے پیچھے لگا ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (58:22). یاد رکھو! سن رکھو! اہلِ علم! کہ خدا کی پارٹی ہی آخرالامر کامیاب ہوگی۔

سورۃ المجادلۃ کی آخری آیت بھی آ گئی' عزیزانِ من! اگلے درس میں جو سورۃ الحشر 59 ویں سورۃ ہے اس سے ہم شروع کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀......❀......❀

# سورة الحشر

# پہلا باب: **سورۃ الحشر** ( آیات 1 تا 10 )

**بسم اللہ الرحمن الرحیم**

عزیزانِ من! آج جون 1983ء کی 10 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الحشر سے ہو رہا ہے: (59:1)۔

## قرآنی اصطلاحات صرف جہانِ فردا کے لیے ہی نہیں ہیں' امروز کے لیے بھی ہیں

آپ کو یاد ہوگا کہ میں اکثر یہ کہا کرتا ہوں کہ قرآنِ کریم میں یہ جو ساعت' قیامت' حشر الفاظ آئے ہیں' ہمارے ہاں

عام تصور تو یہی ہے کہ یہ جو مرنے کے بعد کی زندگی ہے' یہ اس سے متعلق ہیں۔ لاریب کہ یہ اس سے بھی متعلق ہیں۔ اسے بھی ذہن میں رکھیے کہ ان کا تعلق اس زندگی سے بھی ہے۔ وہ تو جب یہ جو ہماری زندگی تھی' اربابِ اختیار نے اسے اپنے قبضے میں رکھا تو پھر ہمارے لیے انہوں نے دوسری دنیا کی جو زندگی تھی' اسے سپرد کر دیا کہ لیجیے خوش رہیے' جنتیں ہیں' باغات ہیں' نہریں ہیں' یہ سب کچھ ہے' یہاں یہ چار دن کی زندگی ہے۔ اگر فاقے بھی آ رہے ہیں تو کوئی حرج نہیں' بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی' تو یہ اس زمانے کے اسلام کے متعلق تصور ہے اور ان الفاظ اور اصطلاحات کو اسی زمانے کے یہ معنی پہنائے گئے ہیں۔ یہ اس دنیا کی باتیں بھی ہیں اور قرآن کریم تو اس دنیا ہی میں آپ کو رہنا کے لیے' سکھانے کے لیے' آیا تھا کہ اس دنیا میں کیسے رہا جائے تا کہ اس کے بعد کی' مستقبل کی زندگی بھی' آپ کی خوشگوار گزرے یعنی مقدم یہ چیز تھی کہ یہاں کیسے رہنا ہے۔ تو یہ جو الفاظ ہیں یا یہ جو اصطلاحات ہیں' اس پہ میں نے عرض کیا تھا کہ قیامت قامۃ سے ہے۔ یہ اٹھ کھڑے ہونا ہے لیکن وہ جو آخر میں ایک گول ت لگی ہوئی ہے' عربی زبان کے قاعدے کی رو سے' اس کے معنی ہوتا ہے کہ جو کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ ہو' اس طرح سے کوئی اٹھ کھڑا ہو۔ یہ خالص انقلاب کا تصور ہے اور یہی وہاں ہوا تھا۔

## صدرِاوّل کے مومنین کی زندگی جب حق کو قائم کرنے کی خاطر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور حشر کے قرآنی معنی

صدرِاوّل میں جب قرآن حمید پہ عمل کیا گیا ہے تو یہ قوم' جن بیچاروں کی کیفیت یہ تھی کہ ان کا کھجوروں کی گٹھلیوں پہ گزارا ہوا کرتا تھا' وہ پانی کی تلاش میں مارے مارے پھرا کرتے تھے' یہ اس طرح سے اٹھ کھڑے ہوئے کہ رومۃ الکبریٰ اور ایران جیسی تہذیبیں جو صدیوں سے قائم ودائم چلی آ رہی تھیں' انہوں نے الٹ کر رکھ دیا' یہ قیامت برپا کی گئی۔ یہ جو سورۃ ہے' جس کو میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ اس کا نام ہی الحشر ہے' یہ وہ حشر نہیں جو مرنے کے بعد کی زندگی کا ہے۔ یہاں کے حشر کے متعلق یہاں گفتگو کی گئی ہے۔ حشر کے معنی ہوتا ہے ''جمع ہونا' اکٹھے ہونا' میدانِ جنگ میں جمع ہونا اور پھر شکست خوردہ قیدیوں کو کسی طرح ہانک کر لے جانا۔'' یہ جنگ کا ذکر ہے۔

## مدینہ میں یہودی معاشی شعبہ میں اپنا تسلط قائم رکھے ہوئے تھے یہ تھی سپر پاور

یہاں جو سورۃ کا نام الحشر ہے' جب نبی اکرمؐ مدینہ تشریف لائے تو یہاں کے مالیات پر یہودیوں کا تسلط تھا۔ یہودیوں میں شروع سے ہی مالیات پر تسلط تھا اور اپنی حالت یہ ہے کہ مار کھا رہے ہیں' پٹ رہے ہیں' خانہ بدوشی ہے' کہیں ٹھکانہ نہیں۔ یہ Wandering Jews ہیں لیکن جہاں بھی گئے' انہوں نے دیکھ لیا کہ انسان کی جو رگِ جاں ہے یہ معاش کے اندر ہے۔ روٹی اپنے قبضے میں لے رکھو تو پھر اس کے بعد یہ سلطنت ان کی ہے' مملکت ان کی ہے' حکومت ان کی ہے' کچھ بھی ہو' آج اس ساری دنیا کی حکومتیں

بڑی بڑی طاقتوں کی ہیں مگر ان کو ساری دنیا سپر پاورز کہتی ہے' حقیقت میں دنیا کے اندر سپر پاور ایک ہی ہے اور وہ یہودی ہیں اور انہوں نے شروع سے ہی اپنے لیے مدینے میں یہ روش' یہ مسلک' یہ نصب العین' رکھ لیا تھا۔ مکے میں تو یہ پنپ نہیں سکتے تھے کہ قریش کعبے کے متولی ہونے کی وجہ سے برسرِ اقتدار تھے۔ مدینے میں ان کی آبادی بھی کافی تھی اور وہاں کی معاشیات کا جو شعبہ ہے یہ ان کے قبضے میں تھا۔

## یہودیوں کی طرف سے جنگ بدر ایک بہت بڑی سازش تھی

اس لیے جب ہجرت کر کے حضور ﷺ وہاں مدینے میں تشریف لے گئے تو ان کے لیے مشکل کا سامنا ہوا۔ مشکل کیا تھی' کون سی چیز تھی جو انہیں بہت ناگوار گزرتی تھی؟ سورۃ توبہ میں ہے' وہاں بھی ان کا سارا ذکر آیا ہے۔ کہا ہے کہ یہ بات انہیں بڑی ناگوار گزرتی ہے کہ یہ مدینے کے مسلمان خوشحال کیوں ہو گئے ہیں۔ ہر سرمایہ دار کو یہ بات ناگوار گزرے گی کہ مفلس اور محتاج خوشحال کیوں ہو گیا۔ آپ اندازہ لگائیے' قرآنِ کریم چار چار لفظوں میں کتنی بڑی حقیقت کہہ جاتا ہے۔ اب یہ اپنے اسی تصور کو Recover (از سرے نو بار آور) کرنے کے لیے سازشیں کرتے تھے۔ اس قسم کی قومیں ہمیشہ سازشیں کرتی ہیں' کھل کر کبھی نہیں سامنے آتے۔ بدر کی جنگ میں اس امت کے اوپر جو نازک ترین لمحہ آیا ہے۔ نوزائیدہ امت ہے' مہاجروں کی قسم کی ہے۔ مدینے میں آ کر بسی ہوئی بے سروساماں ہے اور ادھر سے قریش یورش کر کے پورے پورے اہتمام اور انتظامات کے ساتھ ہجوم کر کے آ گئے۔ مدینے میں ان بیچاروں کو ابھی بیٹھنے کی فرصت بھی نہیں ملی۔ وہ کیسے آ گئے؟ کیا ہو رہا تھا؟ یہ یہودی ان کے ساتھ سازش کر کے ملے ہوئے تھے۔ وہاں انہیں شکست ہوئی تو اس کے بعد انہوں نے یہاں اندر ہی اندر مدینے میں قبائل کو اپنے ساتھ ملانا شروع کیا یعنی وہی زیرِ زمین سازشیں' وہی کمینہ حرکتیں' پسماندگی' کھل کے میدان میں آنے والی بات نہیں ہے' جو کھل کے میدان میں آتا ہے' دشمن کی حیثیت سے آتا ہے' اس سے نپٹ لینا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ مشکل یہ ہے کہ سانپ ان کی آستینوں میں ہوتے ہیں۔

## مدینے کے دو مشہور قبیلے اور نبی اکرم کی کشادہ نگہی

حقیقت میں تو مدینے میں ان کے دو مشہور قبیلے تھے [1] بنی قریش اور بنی نضیر [2] تو ان میں سے بنی نضیر نے کچھ زیادہ ہی سرکشی

---

[1] یثرب کا شہر (جو مدینۃ النبی کے ممتاز لقب سے باعثِ فروغ نورِ دیدۂ عالمیان ہوا اور پھر مختصر ہو کر مدینہ کے نام سے وجہ تسکینِ خاطر (نام) ایک قدیم بستی تھی' جہاں یہودی ایک مدت سے آباد تھے۔ جب یمن میں مشہور سیلاب آیا ہے تو وہاں کے کچھ لوگ یہاں آ کر آباد ہوئے۔ ان میں سے اوس اور خزرج دو بھائی مشہور سردار تھے۔ انہی دو کے نام سے دو خاندانوں کی بنیاد پڑی۔ یہودیوں کے علاوہ یثرب کی آبادی انہی دو خاندانوں پر مشتمل تھی (پرویزؒ: معراج انسانیت (1968ء) ص ص 202-201۔

[2] یثرب (مدینہ) اور اس کے اطراف میں یہود آباد تھے اور ان کا اثر و اقتدار بھی کافی تھا۔ یہ تین قبیلے تھے بنو قینقاع' بنو نضیر اور بنو قریظہ (ماخوذ از پرویزؒ: معراج انسانیت (1968ء)۔ ص۔ 227۔

شروع کردی تو پھران کی مدافعت کے لیےٗ ان کے مقابلے کے لیےٗ امتِ مسلمہ کو اٹھنا پڑا ٗ جماعتِ مومنین کو اٹھنا پڑا لیکن یہ تو اب کی بات ہے کہ یہ کہیں میدانِ جنگ میں آنے کے قابل ہوئے۔ چھوڑیئے اس تاریخ کو کہ کیسے آنے کے قابل ہوئے۔ یہ میدان میں کھڑے نہیں ہوسکتے تھے۔ یہ سامنے آئے تو فوراً ہی شکست کھائی لیکن نبی اکرم ﷺ کی کشادہ نگہی ملاحظہ فرمایئے۔ انہیں صرف یہ کہا گیا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ ٗ ہمارا پیچھا چھوڑ دو ٗ تم اپنی خصلتوں سے باز نہیں آ ؤ گے چنانچہ اس شکست کے بعد یہ قبیلہ بنونضیر خاص طور پر کچھ ان میں سے شام میں آ گئے اور کچھ خیبر میں چلے گئے تو پھر خیبر میں سے جب ان کو نکالنا پڑا ہے تو وہ جنگِ خیبر بھی مشہور ہے اور پھر حضرتِ عمرؓ کے زمانے میں ان کو عرب سے ہی دربدر کر دیا گیا تھا ٗ ملک بدر کر دیا گیا۔ اس کے بعد وہاں ان کا نام ونشان نہیں رہا جبھی پھر انہوں نے چار دن امن اور چین کی زندگی بسر کی تو یہ جو سورۃ ہے ٗ اس کا آغاز ہی اسی سے ہوتا ہے۔ سابقہ سورۃ المجادلۃ کی آخری آیات میں یہ کہا گیا تھا کہ یہ جماعتِ مومنین یا جو بھی قرآنی نظام کی تشکیل اور استحکام کے لیے پوری پوری کوشش کرے گی ٗ پوری پوری ہمت سے کام لے گی ٗ سرفروشی اور سرگردانی سے کام لے گی ٗ اس کو وہ چیزیں ملیں گے جنہیں وہ جنّت عدم کہتا ہے۔ یہ حزب اللہ ہیں ٗ یہ ہر حزبِ شیطان کا مقابلہ کریں گے۔ یہاں سے وہ بات ختم ہوئی۔

## سبح یا تسبیح کا نتیجہ اور ہمارے ہاں کا ثواب

اب اس سورۃ الحشر کی ابتداء ہوگئی۔ کہا کہ **سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ** (59:1) یہ انسانوں کی دنیا کی بات ہے جو ہم کہہ رہے ہیں کہ یہ بڑی Creditable چیز ہے۔ یہ جو اس طرح سے اس مقصد کے حصول کے لیے سرگرداں پھر رہے ہیں یعنی یہ سَبَّحَ ہیں۔ یہ تسبیح ہے۔ آپ کو اب تسبیح تو معلوم ہی ہے۔ کہا کہ یہ بات ٹھیک ہے ٗ یہ کر رہے ہیں لیکن یہ کوئی انوکھی بات نہیں ٗ کائنات کی ہر شے یہ کر رہی ہے اور اس تسبیح کا نتیجہ کیا ہے جو جماعتِ مومنین نے کی؟ نتیجہ یہ ہے کہ **ھُوَ الَّذِیْٓ اَخْرَجَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ مِنْ دِیَارِھِمْ** (59:2) ان کی اس تسبیح کا نتیجہ آپ سوچ رہے ہیں۔ تسبیح کا نتیجہ ہے۔ ہمارے ہاں تسبیح دا نتیجہ تے تہانوں پتہ اے کی ہوندا ہیگا۔ اس میں گن گن کے وہ جیسے وہاں بنک کے اندر حساب کھلا ہوا ہے۔ اس میں اس لیے ہوتا ہے کہ دانے گنے ہوئے ہوتے ہیں تا کہ وہ اللہ میاں ثواب نہ مار جائے ٗ معاذ اللہ کہ تیرے ول اینیاں تسبیحاں ہوگیاں (ہمارے ہاں تسبیح کا نتیجہ تو آپ کو معلوم ہے کہ کیا ہوتا ہے۔ اس میں تو گویا وہ بنک کا کھاتہ کھلا ہوا ہوتا ہے کہ یہ تسبیح کے دانے گنے ہوتے ہیں تا کہ اللہ میاں ثواب ختم نہ کر دے)۔

## قرآن حکیم کی بنیادی اصطلاحات کے مفہوم کو بدلنے کے نتیجہ نے قرآنی نظام حیات کے خدوخال کو ہی بدل کر رکھ دیا۔ یہ تھا تسبیح کا نتیجہ

عزیزانِ من! یہ لوگ بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔ الفاظ نہیں بدلے' ویسے رہنے دیئے کہ قرآن حکیم کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے جی! آپ اسے محفوظ رکھتے پھریئے۔ اس کے الفاظ کو دیکھیے تو سہی' ہم اس کے ساتھ کرتے کیا ہیں۔ کرتے یہ ہیں کہ اُس نے کہا تھا کہ تسبیح کے معنی کسی مقصد کے حصول کے لیے انتہائی کوشش سے سرگرداں رہنا ہے اور انہوں نے اس کے بعد' بدھوں کے ہاں سے' عیسائیوں کے راستے سے' ایک تاگے میں پروئے ہوئے دانے لیے اور قوم کو اس میں الجھا دیا کہ خدا نے تسبیح کا حکم دیا ہے' بیٹھو اور تسبیحاں پھیرتے رہو. یہ ہے سَبَّحَ لِلّٰہِ. اس کا نتیجہ یہ تھا کہ یہ اہلِ کتاب میں سے' جنہوں نے اعلانیہ سرکشی اختیار کی' یہاں کفر کے معنی سرکشی ہو جائے گا' سرکشی اختیار کی' ان کے ساتھ کیا کیا جائے؟ کہا کہ اَخْرَجَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِیَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ(59:2). یہ آ گیا حشر کا لفظ۔ جنگ میدان کے اندر جب یہ پہلے ہی جمع ہونگے اور ان کے ساتھ مڈبھیڑ ہو گی تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کو ان کے شہروں سے نکال دیا۔ جائے گا' ان کی بستیوں سے نکال دیا جائے گا ❶ یہ ہے وہ حشر جو یہاں برپا ہوتی ہے تو وہاں سے ان کو نکال دیا کہا کہ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ یَّخْرُجُوْا وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ (59:2). یہ سمجھتے یہ تھے کہ ہم نے جو اپنے قلعے بنا رکھے ہیں' محفوظ دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں اور ہمیں یہاں سے کوئی نہیں نکال سکتا۔ کہا کہ انہیں پتہ نہیں ہے کہ غلط روشِ زندگی کے جو تباہ کن نتائج آتے ہیں تو وہ پھر دیواروں اور قلعوں کو نہیں دیکھا کرتے' وہ ان حفاظتی دیواروں کو پھاند کر بھی چلے جایا کرتے ہیں . فَاَتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَیْثُ لَمْ یَحْتَسِبُوْا (59:2) . لفظ تو یہی ہے کہ اللہ ان کے اوپر پھر ان مقامات سے آیا جن کا یہ سان گمان بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اللہ تو نہ کہیں آتا ہے' نہ کہیں جاتا ہے۔ یہ کون آئے تھے؟ یہ یہ حزب اللہ آئے' خدا کی پارٹی آئی' جسے خدا نے خود اپنی جماعت' اپنا لشکر' اپنی پارٹی کہا ہے۔ جہاں جہاں آپ قرآن حکیم میں دیکھیں گے کہ خدا نے یہ کیا: اللہ آیا۔ اللہ نے یہ کہا کہ یہ اس کے قوانین کو نافذ کرنے والی جو جماعت تھی' یہ سب کچھ اس کے ہاتھوں سے ہوتا تھا۔ تو یہ جنگ ان کے ساتھ ہوئی۔ انہوں نے انہیں شکست دی۔ ان کے ہاتھوں سے وہ آگے گئے۔

---

❶ ان اہل کتاب (یہود) کو اپنی قوت پر بڑا ناز تھا لیکن ہوا یہ کہ ابھی پہلا ہی لشکر ان کے مقابلہ کے لیے گیا تھا کہ انہوں نے میدان چھوڑ دیا۔ اس پر انہیں ایک اور موقعہ دیا گیا کہ وہ فتنہ وفساد سے باز آ کر اپنی اصلاح کر لیں چنانچہ ان کے خلاف اور کوئی کارروائی نہ کی گئی' بجز اس کے کہ' بطور حفظِ ماتقدم انہیں ان کی اس بستی سے نکال کر دوسری جگہ آباد کر دیا گیا۔ (ماخوذ از پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص1294)۔

## خدا کے قانون کی عمل داری انسانوں کے ہاتھوں پوری ہوتی ہے

اب اگلی آیت کے اندر یہ بات صاف ہوگئی ہے کہ مومنین نے یہ کیا ہے لیکن آپ دیکھیے قرآنِ کریم نے یہاں یہ کہا کہ خدا ان کے خلاف ان مقامات سے آیا جن کا یہ سان گمان بھی نہیں کرتے تھے:

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ

انسانوں کی دنیا کے اندر خدا جو اپنی Responsibility (ذمہ داری) پوری کرتا ہے، وہ ہمیشہ ان انسانوں کے ہاتھوں سے کراتا ہے، خود نہیں آتا، لیکن ان کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے اور ٹھیک ہے، جنگ میں فتح ہوتی ہے تو کمانڈر انچیف کی فتح ہوتی ہے یا کمانڈر کی فتح ہوتی ہے، فوج کی فتح ہوتی ہے، وہاں ایک ایک فرد کا نام نہیں لیا جاتا۔ تو ان مقامات سے خدا ان کی طرف آیا جن کا یہ سان گمان بھی نہیں کرتے تھے۔ کہا کہ وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ (59:2). اور اصل شکست یہ ہے کہ ان کے دلوں میں تمہارا رعب پیدا ہو گیا۔ اصل شکست یہ ہوتی ہے۔ میدانِ جنگ میں یہ بڑی بڑی پاورز آئیں گی لیکن جتنی بھی چھوٹی چھوٹی زیر دست کمزور قومیں ہیں، ان کے دلوں میں ان کا اتنا رعب طاری ہو گیا ہے کہ امریکہ میں الیکشن ہونے لگتا ہے تو ہر ایک اپنی اپنی جگہ تھر تھراتا ہے کہ پتہ نہیں نیا صدر جو آئے، اس کی پالیسی کیا ہوگی۔ تم تیس ہزار میل کے فاصلے پہ ہو، تمہارا اس سے واسطہ کیا ہے، لیکن واسطہ تو بڑا ہوتا ہے، یہ جو قرآن کریم نے کہا ہے کہ اصل فتح یہ ہے کہ اب ان کے دلوں میں تمہارا رعب طاری ہو گیا ہے اس لیے یہ اس طرح سے نہیں کر سکیں گے۔

## فرد ہو یا قوم وہ اپنی تباہی کا سامان خود اپنے ہاتھوں سے اکٹھا کرتی ہے یہ ہے گھروں کی ویرانیاں

اگلی بات یہ ہے کہ یُخْرِبُوْنَ بُیُوْتَهُمْ بِاَیْدِیْهِمْ وَاَیْدِی الْمُؤْمِنِیْنَ (59:2). شکست کی انتہا یہ ہے، ذلت کی انتہا یہ ہے کہ تم نے تو جو کچھ ان کے ساتھ مدافعت میں، جنگ میں کرنا تھا، یہ اپنے ہاتھوں سے اپنے گھروں کو ویران کر رہے ہیں۔ کسی قوم کا سب سے بڑا عذاب یہ ہے، عزیزانِ من! کہ وہ قوم اپنے ہاتھوں سے اپنے گھروں کو ویران کرے، دشمن نے تو ویران کرنا ہی تھا۔ اب یہاں جو وہ کہا تھا کہ اللہ ان کے اوپر ایسے مقامات سے آیا کہ ان کے وہم گمان میں بھی نہیں تھا تو یہاں ہے کہ اَیْدِی الْمُؤْمِنِیْنَ (59:2). یہ مومنین کے ہاتھوں سے ہوا لیکن کہا یہ کہ ان سے زیادہ چیز جو باعث ذلت تھی، حقیقی شکست یہ تھی کہ یہ اپنے ہاتھوں سے اپنے گھروں کو ویران کر رہے تھے۔ سوچتے جایئے، عزیزانِ من! کہ کتنے ابدی حقائق ہیں جو قرآن حکیم بیان کرتا ہے۔ کسی قوم کی انتہائی شکست اور ذلت یہ ہے کہ وہ قوم اپنے ہاتھوں سے، اپنے گھروں کو ویران کرنے لگ جائے اور اسی لیے کہا کہ فَاعْتَبِرُوْا یٰۤاُولِی الْاَبْصَارِ (59:2). اے صاحبانِ عقل و بصیرت! اسے یہودیوں اور صدرِ اول کے مسلمانوں کا تصادم نہ سمجھیے اس میں بڑی دور کی

باتیں ہم کہہ رہے ہیں۔ کیا بات ہے یہ فاعتبروا کی! ہمارے ہاں اسے عبرت کہتے ہیں۔ وہ تو الفاظ عربوں کے لائے جائیں تو یہ لفظ پل کے لیے آتا ہے کہ درحقیقت یہ بات جو ہم کہہ رہے ہیں وہ ہے' جو ادھر سے وہاں پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ کیا بات ہے صاحب! یہ اس زمانے کی جنگ کی بات نہیں ہے بلکہ یہ تاریخ کا ایک پل ہے کہ جو اِدھر سے اُدھر پہنچنے کا ذریعہ بنتا ہے جو ہم کہہ رہے ہیں. کہا ہے کہ **فَاعْتَبِرُوْا يٰۤاُولِى الْاَبْصَارِ** (59:2). صاحبانِ عقل وبصیرت کے لیے کہا گیا ہے اور کہا یہ گیا ہے کہ جب کوئی قوم اپنے گھر کو اپنے ہاتھوں سے اجاڑنا شروع کردے تو سمجھ لیجیے کہ **وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ** (2:61) پھر وہ دنیا میں جہاں بھی جائے گی ذلیل وخوار ہوجائے گی۔ جس قوم نے اپنے گھر کو اپنے ہاتھوں سے ویران کرنا شروع کردیا' گھروں کی ویرانی اینٹوں اور پتھروں کو برباد کرنا نہیں ہوتا۔ عزیزانِ من! گھروں کی ویرانیاں تو آپ جانتے ہیں۔

## تباہی وبربادی کا پہلا مرحلہ اور نظامِ خداوندی کے لیے اللہ اور رسول کی اصطلاح کا ذکر اور درخت کاٹنے کا معاملہ

جب ایک قوم اپنے گھر کو ویران کرنے لگ جائے تو اس گھر کو پھر کون آباد کرسکتا ہے۔ کہا ہے کہ **وَلَوْلَاۤ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِى الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ**[1] (59:3) . اگر یہ بات طے نہ ہوتی کہ ان کو صرف یہاں سے نکال ہی دینا ہے تو پھر تو ان کے اوپر اس قسم کی تباہی آتی کہ ان کا نام ونشان مٹ جاتا لیکن یہاں یہی مناسب سمجھا گیا ہے کہ اس آخری سزا تک بات نہ پہنچنے پائے۔ یہ یہاں سے چلے ہی جائیں تو اچھا ہے تاکہ بعد میں یہ نظام امن سے تو رہ سکے . **ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَمَنْ يُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ**[2] (59:4). یہ بات بھی آپ کے سامنے آچکی ہوئی ہے کہ قرآنِ کریم میں جہاں ''اللہ اور رسول کا'' اکٹھا ذکر آتا ہے تو اس کے معنی ''نظامِ خداوندی'' ہوتا ہے۔ یہاں جو کہا ہے کہ انہوں نے بہت ستایا' تنگ کیا' اللہ کی مخالفت کی' اللہ کو تو نہ کوئی ستا سکتا ہے' نہ تنگ کرسکتا ہے۔ انہوں نے کسے ستایا تھا' کسے تنگ کیا تھا' کس کی مخالفت کی تھی؟ یہ اللہ اور رسول ﷺ کا جو ذکر آیا ہے تو وہ مخالفت کس کی تھی؟ کس نے مخالفت کا جواب دیا تھا؟ کون

---

[1] اگر ان کے لیے اس جلاوطنی کا فیصلہ نہ کیا جاتا' تو انہیں بڑی ہی سخت سزا دی جاتی۔ یہ سزا انہیں اسی دنیا میں مل جاتی۔ باقی رہی اخروی زندگی' سو اس میں ان کے لیے بڑا تباہ کن عذاب ہوگا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1295)

[2] یہ اس لیے کہ انہوں نے اس نظام خداوندی کے خلاف سرکشی اختیار کی جسے (نوع انسانی کی فلاح وبہبود کے لیے) اس کا رسول قائم کررہا تھا (ہر ایک کو سن رکھنا چاہیے کہ) جو شخص بھی اس نظام حق وانصاف کے خلاف سرکشی اختیار کرے گا' خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے اس کا انجام بہت بُرا ہوگا۔ یہ قانون مجرمین کا پیچھا نہیں چھوڑا کرتا (پرویزؒ: مفہوم القرآن ص۔1295)

مدافعت میں میدانِ جنگ میں گیا؟ وہ یہی نظام تھا۔ پھر نظام جو خدا کے احکام کے مطابق کچھ کرتا ہے تو خدا اسے اپنی طرف منسوب کر لیتا ہے اور یہ بڑی چیز ہے۔ حقیقت میں بڑی باعثِ فخر چیز ہے کہ ان کے کارناموں کو خدا یہ کہے کہ یہ تم نہیں تیر چلا رہے تھے، ہم چلا رہے تھے۔ کیا بات ہے اس مقام کی! کہا کہ **مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ** ❶ (59:5) جنگ کا میدان تھا، اس میدان کے لیے تو پھر جو جو بھی Strategy (حکمتِ عملی) اختیار کرنی چاہیے وہ کی جاتی ہے اور وہ کی گئی تھی۔ پہلی چیز یہ تھی کہ ان کے ہاں کی یہ کھجوریں، ان کے درخت، یہی زیادہ متاع ہوتی تھی، اسی کے سہارے پر جو قومیں تھیں، وہاں معاشی طور پر آگے ہوتی تھیں۔ تو پہلی چیز یہ تھی کہ ان کے درختوں میں سے بعض کو کاٹنا پڑا، بعض کو اسی طرح سے رہنے دیا گیا۔ اب پھر کہا گیا کہ یہ سب کچھ تم **بِـاِذْنِ الـلّٰـهِ** (59:5) کر رہے تھے۔ آپ کے لیے یہ بات سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہوگا کیونکہ آپ اب اس مسلسل درس سے یہ سمجھ گئے ہیں کہ جب یہ اذن اللہ کہا جائے گا تو اس کے معنی ہونگے ''قانونِ خداوندی کے مطابق'' لیکن ہمارے ہاں تو ان تنکوں کے پل بنا کر اس پہ سے ہاتھی گزارتے رہتے ہیں۔ آپ کو یہ معلوم ہے اور بار بار تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

## قرآن حکیم کی وحی کے علاوہ روایات کے لیے وحی مثلہ معہ کا غیر قرآنی تصور اور جنگ کی تفاصیل

آپ احباب مسلسل یہ کچھ سنتے چلے آرہے ہیں کہ وہ جو عقیدہ ہے کہ ایک تو وہ وحی ہے جو قرآنِ کریم کے اندر آ گئی اور اس کے بعد ہمارے دورِ ملوکیت میں اور ایک عقیدہ وضع ہوا کہ ان کے ان کارناموں کے لیے وجہ جواز مل جائے کہ رسول اللہ ﷺ پہ ایک اور بھی وحی تھی وہ آیا کرتی تھی۔ وہ قرآن حکیم میں نہیں ہے۔ اس کا انتخاب امام بخاری نے کیا تھا۔ وہ ہے مثلہ معہٗ قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ اور پھر جب اس قسم کی چیزوں پہ یہ احباب بحث کرنے کے لیے آتے ہیں تو عجیب عجیب دلیلیں دیتے ہیں۔ معاف رکھیے، مجھے اس لیے یاد پڑتا ہے کہ میں ان وادیوں سے گزرا ہوا ہوں۔ ان کا ایک یہ اعتراض ہوتا تھا کہ اگر وہ یہ مثلہ معہ دوسری وحی قرآن حکیم کے علاوہ نہیں آتی تھی تو یہ جو قرآن حکیم نے باذن اللہ کہا ہے کہ وہ خدا کے اذن سے، خدا کے حکم سے، ان کھجوروں کو کاٹ رہے تھے یا میدانِ جنگ میں یہ کچھ کر رہے تھے تو بتائیے قرآن حکیم میں کہاں لکھا ہے۔ یہ اس وحی کی رو سے نہیں ہے تو یہ ایک دوسری جو وحی تھی وہ یہ ہے۔ یعنی دلائل ملاحظہ فرمائیے کہ کس قسم کے دلائل دیئے جاتے تھے، اس لیے کہ جب قرآن حکیم کو ایک طرف اٹھا کر رکھ

---

❶ تم نے (محاصرہ کے وقت، جنگی ضروریات کے تحت) ان کے جن کھجور کے درختوں کو کاٹ ڈالا یا جنہیں ان کی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا، تو تم نے یہ سب کچھ قانونِ خداوندی کے مطابق کیا جس کی رو سے، اس نے تمہیں ایسے لوگوں کے خلاف جنگ کرنے کی اجازت دی (22:39)۔ مقصد اس سے یہ ہے جو لوگ غلط راہوں پر چلیں، وہ دیکھ لیں کہ اس طرح انہیں کس قدر ذلت اُٹھانی پڑتی ہے (پرویزؔ: مفہوم القرآن، ص 1295)

دیا جائے تو پھر جو دلائل دیئے جائیں قرآن حکیم پہ ان کی نگاہ ہی نہیں ہوتی اور ان کو معلوم ہو جاتا ہے۔

قرآنِ کریم نے اصولاً جہاں جنگ کرنے کے لیے اجازت دی ہے' جنگ کی جتنی آگے Details (تفاصیل) ہوں گی وہ اس اجازت کے تابع آ جائیں گی۔ اب بھی جہاں آرمی کو حکم دیا جاتا ہے کہ جاؤ' وہاں حملہ کرآؤ' تو وہاں پھر جو اس کی ساری Details (تفاصیل) ہوتی ہیں' وہ اس حکم کے تابع خود آ جاتی ہیں' ہر سپاہی کو الگ الگ کہنا نہیں ہوتا کہ اب حکم دیا جاتا ہے کہ تم گولی چلاؤ' اب حکم دیا جاتا ہے کہ تم بیٹھ جاؤ' اب حکم دیا جاتا ہے کہ تم پیچھے جاؤ' یہ محض کمانڈر کے لیے حکم دے دیتا ہے' وہ اس کا اجرا کرتا ہے' پھر جو کچھ وہ اس کے لیے کرتے ہیں وہ جو اصلِ حکم ہوتا ہے اس کے تابع آ جاتا ہے۔ کہا کہ صاحب! یہ اذن اللہ کا بتاؤ۔ میں نے کہا کہ! جی بہت اچھا ہے جو سب سے پہلے جنگ کرنے کی اجازت دی گئی تھی وہاں اللہ تو علیم وحکیم ہے' اسے تمہارے اعتراض کا پتہ تھا' اس نے لفظ ہی یہ استعمال کیا ہے۔ کہا ہے کہ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (22:39) جو لوگ اب تمہاری مخالفت میں حد سے بڑھ گئے اللہ تمہیں اذن دیتا ہے کہ تم ان کے خلاف جنگ کرو۔ میں نے کہا کہ یہ وہ اذن ہے جس کے تابع یہ جنگ ہوئی اور جنگ کی ساری Details (تفاصیل) اس کے تابع آ گئیں۔ اب آپ کیا ایک ایک بات کے لیے کہیں گے کہ اس کی گولی چلی ہے تو اس کے لیے اذن اللہ کہاں ہے؟ وہ اذن تو پہلے سے موجود ہے' یہ جتنی جنگیں لڑی گئیں وہ اذن خدا کے ماتحت تھیں اور پھر اس نے کچھ شرائط مقرر کیں' کچھ اصول مقرر کیے' ان کے مطابق یہ کرتے رہے۔ انہوں نے اتنی جنگیں لڑیں تو ہر جنگ کے لیے الگ الگ تو کوئی اذن نہیں تھا۔ اس کی Strategy (حکمت عملی) تو حضور نبی اکرم ﷺ نے اور جو بھی وہاں کے جرنیل وکرنیل اور سپہ سالار تھے انہوں نے اللہ کی مقررہ حدود کے تحت اپنی بصیرت کے مطابق طے کی۔ یہ مقرر کی اللہ کے مطابق۔ یہ تھا اذن۔

## جنگ کے سلسلہ میں مالِ غنیمت کی کیفیت' الفاظ کے معنی بدلنا اور غنیمت کے قرآنی معنی نیز اس کے متعلق انقلابی احکامات

کہا کہ وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ[1] (59:6). آپ کو یاد ہوگا' شاید میں نے مالِ غنیمت کے متعلق کہا تھا کہ یہ بہت بڑا انقلاب یا اصلاحی تدبیر ہے' جو قرآن کریم نے جنگ کے سلسلے میں اٹھائی' وہ مالِ غنیمت سے شروع کرتا ہے۔ عربوں کی معیشت کا

---

[1] اور اس لشکر کشائی میں' مخالفین کا جو ساز و سامان تمہارے ہاتھ آیا' تو یہ بغیر جنگ کیے تمہارے قبضے میں آ گیا۔ اس کے لیے نہ تمہیں گھوڑے دوڑانے پڑے' نہ اونٹ۔ اللہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق' اپنے رسولوں میں سے جسے چاہے' اس طرح بھی مخالفین پر غلبہ وتسلط عطا کر دیا کرتا ہے۔ اللہ نے ہر شے کے اندازے مقرر کر رکھے ہیں اور ان پر اسے پورا پورا کنٹرول حاصل ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص 1296-1295)

مدار ہی غنیمت پہ تھا' تو شاید وہ اب آپ کو یاد ہو کہ یہ لفظ غنیمت کیا ہے؟ ان کا سارا مال یہ بھیڑ بکریاں ہوتی تھیں۔ وہ بھیڑوں کو غنم کہتے تھے۔ تو یہ غنم' جو ان کے ہاں دشمن کا ہاتھ آتا تھا' ان کو بھیڑ بکریاں ہاتھ آتی تھیں' تو بھیڑ بکریوں کا لفظ غنم تھا۔ وہاں سے یہ لفظ غنیمت بنا۔ اب وہ اس کے بعد غنیمت کے اندر بھیڑ بکریاں ہی نہیں' پھر تو مال و دولت اتنا کچھ آنا شروع ہوا' ایران فتح ہوا ہے تو پوچھو ہی نہیں کہ بے حساب وہاں سے یہ سب کچھ آیا ہے' لیکن اصطلاح جو غنیمت کی تھی' وہ اسی طرح سے جاری رہی۔ تو آپ کو پتہ ہے کہ ایک تو لفظ غنیم یہاں سے بنا' جس کے معنی دشمن ہو گئے اور پھر ہمارے ہاں تو یہ کہا کہ جناب ''غنیمت ہے کہ یہاں دو چار دوست بیٹھے ہیں'' اور ''غنیمت ہے''، یعنی الفاظ کہاں سے کہاں پہنچتے ہیں۔ کہاں وہ بھیڑیں جو میدانِ جنگ میں آئیں۔ یہاں یہ ہے کہ جب کہیں دوبارہ ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ''صاحب! غنیمت ہے جو تم آ گئے''۔

## علامہ پرویزؒ نے قرآن حکیم کو کیسے سمجھا؟

عزیزانِ من! بہر حال میں نے جو فہم قرآن کی بنیاد رکھی' پتہ نہیں زندگی کتنے دن باقی ہے' عرض کر دوں' گو کہ میں پچاس سال سے یہ عرض کر رہا ہوں کہ قرآن حکیم الفاظ کے وہ معنی سمجھو جو نزولِ قرآن حکیم کے زمانے میں عرب جو معنی لیتے تھے' وہ لو' اسی طرح اپنے ہاں جو معنی وہ غنیمت کے لیتے تھے' وہ لو۔ یہ ہے قرآن حکیم کے سمجھنے کا طریق اور یہ ہے اس کی حفاظت کی ذمہ داری کا معاملہ کہ یہ انہوں نے لاکھ ان معنی میں تبدیلیاں کیں' نزولِ قرآن کے زمانے میں عرب جو ان کے معنی لیتے تھے' وہ بھی محفوظ ہیں عربوں کی شاعری کے اندر' اور وہاں سے سمجھ میں بات آتی ہے کہ قرآن حمید کہتا کیا ہے۔

## قرآن حکیم نے مالِ غنیمت کے جذبہ محرکہ کو ہی بدل کر رکھ دیا

میں کہہ رہا تھا کہ ان لوگوں نے یہ بہت بڑی تبدیلی کی۔ عربوں کی معیشت کا دارومدار ''غنیمت'' پہ تھا اور ظاہر ہے کہ جب یہ مدار ہو' تو وہ جنگ اگر کہیں لمبے عرصہ تک بند ہو جائے' تو وہ تو ان کی روٹی بند ہو جاتی تھی تو یہ جسے کہتے ہیں کہ آنے بہانے یہ جنگ چھیڑتے ہی رہتے تھے اور پھر ہوتا یہ تھا کہ جو کسی کے ہاتھ میں آ جائے وہ اس کا ہوا۔ وہ اس کا جنگ میں جانے کا جذبہ محرکہ مالِ غنیمت یا لوٹ کا مال تھا' جسے ہم کہتے ہیں کہ یہ ان کی جنگ کی معیشت تھی' یہ اصطلاح ابھی پہلی جنگ سے پہلے یہ بات تھی۔ انہی عربوں سے یہ کہا کہ مالِ غنیمت' لوٹ کا مال نہیں ہے' جو کسی کے ہاتھ میں آئے وہ لے جائے۔ یہاں ایک سوئی تک کوئی سپاہی نہیں Touch کرے گا' یہ سارا مال مملکت اور نظام کا ہے۔ یہ وہ تقسیم کرے گا ضرورتوں کے مطابق۔ یہ ہے پہلا اصلاحی انقلاب۔

پوچھتے ہیں کہ قرآن کا نظامِ معاشی کیا ہے وہ تو ایک ایک قدم پہ بتاتا ہے کہ وہ کیا ہے۔ پہلی اصلاح میں بتایا کہ یہ نظام کیا ہے۔

ان کا ذریعہ آمدنی مالِ غنیمت تھا۔ اب ان سپاہیوں کو جو صدیوں سے اس کے خوگر چلے آ رہے تھے کہ جنگ میں جو کسی کے

ہاتھ آئے، خاص طور پر جو کسی کو قتل کرے اس کا تو سب کچھ ہی اس کا ہو جاتا تھا، انہیں یہ کہنا کہ ان میں سے ایک پائی بھی تمہاری اپنی نہیں ہو سکتی۔ وہ جذبہ محرکہ جو جنگ کا تھا، وہ پہلے ختم کر دیا۔ ایک بلند ترین جذبہ محرکہ پیدا کیا تو یہ ختم ہو سکتا تھا، ورنہ سیدھی بات تھی کہ اگر ہم نے وہاں لوٹنے کے، مارنے سے، کچھ ملنا نہیں تو ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہاں جا کر لڑیں، گھروں میں اچھے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اب جو یہ گئے ہیں تو اس شان کے ساتھ گئے۔ گھر سے نکل کر یوں یہ میدانِ جنگ میں گئے اور جذبہ محرکہ ختم کر دیا۔

## ایران سے ملنے والے مالِ غنیمت کی قابلِ تقلید ایک ابدی حقیقت

عزیزانِ من! پہلے دن ایران کا مالِ غنیمت جب آیا ہے تو یہ تو ان کا ہزار سال کا تھا تو ان عربوں کے تو، جیسے کہتے ہیں دیدے پھٹ گئے، ان کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ کیا کچھ ہے اور وہ سارے کا سارا وہاں سے مرکز میں، مدینہ میں، بابِ خلافت میں، بھیجا گیا اور اس کے سپہ سالار سعد بن وقاص نے ساتھ خط لکھا تھا کہ اس مال کو دیکھ کر آپ بہت خوش ہونگے لیکن خوش ہونے کی بات اس سے الگ کچھ اور ہے۔ یہ مال سارے ملک میں بکھرا پڑا تھا۔ یہ سپاہ سارے ملک میں گئی تھی، ان سپاہیوں کے سامنے یہ سب کچھ پڑا ہوا تھا، ان میں سے کسی نے ایک سوئی بھی اپنے لیے نہیں رکھی، ایک ایک چیز لا کر مرکز میں جمع کر دی۔ تو یہ ہے وجہ مسرت بات ہونا، اور واقعی جب یہ خط دیکھا ہے تو آپؓ حضرت عمرؓ فاروق کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آپؓ نے کہا کہ واقعی جس شخص کو اس قسم کی رعایا نہیں، بلکہ رفقاء مل جائیں، وہ قابلِ فخر اور باعثِ مسرت ہے۔ حضرت علیؓ ساتھ کھڑے تھے۔ انہوںؓ نے کہا کہ عمر! تمہیں پتہ ہے کہ یہ جو سپاہ ہیں، سپاہی ہیں وہ اس قدر امین اور دیانتدار کیوں ہو گئے؟ کہنے لگے کہ بتایئے تو اس پر حضرت علیؓ کہنے لگے کہ یہ اس لیے ہے کہ تم امین اور دیانتدار ہو۔ ان کا تو ایک ایک نقشِ قدم تاریخ مرتب کر جاتا ہے۔ عزیزانِ من! اتنی سی بات آپ دیکھ لیجئے، اس کے اندر ابدی حقیقت ہے کہ جیسے تم ہوں گے، اسی قسم کے یہ ہوں گے۔

تو پہلی چیز تو یہ چیز تھی کہ یہ جو مالِ غنیمت تھا، جو جذبہ جنگ لڑنے کا تھا وہ ختم کر دیا اور جنگ کا جذبہ محرکہ یہ بنا کہ اللہ کی بات غالب آ جائے۔ یہ جذبہ محرکہ تھا تو پھر یہ اتنا زیادہ قوی جذبہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ جو مال حاصل کرنے کا جذبہ ہے، وہ اس سے پست رہ جائے۔ اس جذبے کے نہ ہونے کے باوجود یہ اس طرح سے میدانِ جنگ میں گئے، ایک ایک جنگ میں گئے قریباً اسّی بیاسی جنگیں حضورﷺ کے اس سات سال کے عرصے کے اندر چھوٹی اور بڑی ہوئی تھیں۔ پہلی چیز تو یہ تھی کہ یہ تو مالِ غنیمت تھا۔ اب یہاں یہ آیا ہے کہ یہ ایک ایسا مال ہے، جہاں جنگ نہیں ہوئی، وہ چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اس کے لیے ان کے ہاں ایک الگ اصطلاح آئی۔ اسے مالِ فے بھی کہتے ہیں۔ یہ ویسے تو ایک آیت سورۃ انفال بھی ہے وہ سورۃ الانفال کی 41ویں آیت ہے مالِ فے یہاں آیا ہے کہ جو مال جنگ کیے بغیر ہی دشمن چھوڑ گئے کچھ وہ بھی اسی طرح سے مملکت کے حصے میں آیا۔ یہ مملکت کے حصے میں یہاں بھی وہی چیز آ رہی

ہے۔ یہ کہا ہے کہ یہ سارے کا سارا یہ جتنا بھی آیا ہے یہ سارا مملکت کی تحویل میں جائے گا' یہ سپاہی نہیں لے سکیں گے۔

## قرآن حکیم کے لفظ کو بھی مبہم یا Abtract نہ رہنے دینے کے لیے کاشتکاری کی مثال

کہا ہے کہ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ (59:7) جسے پہلی چیز کہیے وہ یہ ہے کہ یہ صاحب! اللہ کے لیے ہو جائے گا۔ تو میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن حکیم یہ جو اللہ کی Abtract (غیر محسوس) چیز ہے' وہ اس کو نہیں رہنے دیتا' اس کے معنی کچھ نہیں ہوتے۔ اللہ کو کہاں جا کے دیں؟ اس نے وہ خود بتا دیا ہے کہ جب ہم کہیں کہ ہمیں دو' تو مراد کیا ہوتی ہے۔ وہ سورۃ جو آئی ہے' جس میں کہا ہے کہ جو تم یہ کاشت کرتے ہو' زمین میں فصلیں پیدا کرتے ہو' اس میں دیکھ لو کہ کتنا حصہ تمہارا ہوتا ہے' تم تو صرف اس میں محنت کرتے ہو۔ اور یہ جتنی باقی چیزیں ہیں جن پہ تمہارے بیج کے فصل بننے کا دارومدار ہے یہ سورج کی گرمی ہے' یہ بادلوں کا پانی ہے' یہ ہوائیں ہیں' یہ زمین ہے یہ تو سارا ہمارا ہے۔ اسی طرح تمہارا اور ہمارا یہ مشترکہ کاروبار ہوا' یہ (سورۃ لواقعہ کی آیات 63 تا 73 میں) وہاں کہا گیا ہے کہ جب یہ فصل آئے تو بھئی! ایماندار کاروباری کی طرح یہ ہونا چاہیے کہ تم اپنا حصہ لے لو' محنت کا معاوضہ تو تم لے لو اور باقی جو چیزیں یہ مفت ہم نے دی ہیں۔ یہ ہمیں دیدو۔ تو پوچھا گیا کہ صاحب! یہ تو ہم نے لے لیا' یہ جو آپ کا حصہ ہے' یہ کسے دیدیں؟ مولوی صاحب تو کہیں گے کہ ہمیں دیدو' اللہ کے نمائندے سے پوچھا کہ کسے دیدیں؟ کہا کہ بھوکوں کو [1] دیدو' ہمیں مل جائے گا۔

## اللہ اور رسول کا حصہ کن کو دیا جائے گا' کی وضاحت

یہاں کہا کہ یہ سارا جتنا مال ہاتھ آیا ہے یہ فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ (59:7) یہ وہی اللہ اور رسول ﷺ کے الفاظ ہیں۔ نہ یہ رسول ﷺ کی ذات کے لیے تھا' نہ یہ اللہ کے پاس پہنچنے کے لیے تھا' پھر یہ کاہے کے لیے تھا؟ کہا کہ یہ ہے لِذِى الْقُرْبٰى (59:7) میدان جنگ میں جو گئے ہیں' کچھ ان میں سے شہید ہو گئے ہیں' کچھ مصیبتوں میں ہیں' ان کے عزیز رشتہ دار بے یارو مددگار رہ گئے' محتاج رہ گئے یہ ان کا حصہ ہے۔ آگے کہا کہ وَالْيَتٰمٰى (59:7) جو معاشرے کے اندر تنہا رہ گئے ہیں' یہ ان کا حصہ ہے نیز وَالْمَسٰكِيْنِ (59:7) جن کے چلتے ہوئے کاروبار رک گئے ہیں' یہ ان کا حصہ ہے اور پھر آگے بڑھے تو کہا کہ وَابْنِ السَّبِيْلِ (59:7) راہ چلتا مسافر بھی تمہاری مملکت میں سے گزرتا ہوا محتاج ہو جائے' اس کا بھی اس میں حصہ ہے۔ ہمارا حصہ یوں بٹے گا۔ وہ اس طرح سے بٹا کرتا تھا۔ کہا کہ یہ ہم نے یہاں معاشیات کا ایک اصول بنا دیا ہے۔

---

[1] حوالہ ہے (56:73)

## ایران سے ملنے والے مال غنیمت کا ذکر اور اس کی تقسیم کا معاشی اصول

عزیزانِ من! پھر آ گیا ابدی حقیقت کا سوال۔ کہا کہ یہ اتنا مال آیا تھا' اسے خود رسول ﷺ نے اپنے لیے نہیں رکھ لیا۔ تمہارے لیے بھی یہ صورت نہیں تھی کہ لُوٹ کا مال ہے' جس کے ہاتھ میں آ جائے۔ یہ جو ہم نے یہاں چھوٹے چھوٹے حصے کر دیئے ہیں' یہ کاہے کے لیے کیے ہیں؟ یہ ہے وہ اصول کہ کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ (59:7) یہ Economical Principle یا اصولِ معیشت ہے کہ دولت صرف اوپر کے طبقے میں ہی گردش نہ کرتی رہے' اسے ساری مملکت میں گردش کرنا چاہیے۔ یہ اصول ہے چار لفظوں میں' عزیزانِ من! ہمارے ہاں تو کسی کو یہ پڑی نہیں کہ اس کو دیکھتا پھرے اور پھر وہ دیکھے اس لیے بھی نہیں کہ اس میں تو ان کے مفاد پر زد پڑتی ہے۔ ملوکیت کے دور کے اسلام میں تو اوپر کا طبقہ ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ یہاں یہ کہہ رہا ہے کہ ہم نے اس لیے یہ اس طرح بانٹ دیا کہ اس کو پوری رعایا کے اندر یا پورے افرادِ معاشرہ کے اندر گردش کرنا چاہیے۔ یہاں رعایا کا لفظ بھی نہیں آنا چاہیے۔ یہ بانٹ دیا ہے تا کہ یہ نہ ہو کہ یہ مال اوپر کے طبقے میں ہی گردش کرتا رہے۔ یہ تو خون کی طرح پورے جسم میں گردش کرے گا۔ اگر خون کسی ایک مقام پہ پورے کا پورا رک جاتا ہے تو یہ تو رہا ایک طرف رہا' عزیزانِ من! اگر اس کا ایٹم کے برابر ذرہ (Thrombus) رک جائے' جسے ہارٹ اٹیک (Heart Attack) کہتے ہیں' تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہ قوموں کی موتیں اس لیے واقع ہوتی ہیں کہ یہ جو چیزیں ذریعہ زیست کی ہیں' وہ کسی خاص طبقے میں رک جاتی ہیں' سارے بدن میں گردش نہیں کرتیں۔ کہا کہ کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ (59:7) یہ تم میں دولت مندوں کے طبقہ میں ہی نہ گردش کرتی ہے۔ کہا کہ پھر اب تقسیم ہے آگے کہا ہے کہ وَمَاۤ اٰتٰکُمُ الرَّسُوۡلُ فَخُذُوۡہُ وَمَا نَہٰکُمۡ عَنۡہُ فَانۡتَہُوۡا (59:7) تقسیم' جو ہو رہی ہے' وہ مملکت کی طرف سے ہو رہی ہے' سربراہ مملکت اپنے لیے کچھ بھی نہیں لے رہا' وہ دے رہا ہے ضرورتوں کے مطابق۔

## کام صلاحیت کے مطابق اور دام ضرورت کے مطابق کے فارمولے کو اپنانے میں مارکس کی مشکلات کا ذکر

عزیزانِ من! یہ جو ہمارے ہاں کمیونزم کے معاشی نظام کی بات چلی' اس میں ایک چیز تو واقعی بڑے فخر سے پیش کرتے ہیں' اگر وہ چیز اسی مارکس کی ہوتی تو قابلِ فخر ہے۔ یہ اصول مارکس نے دیا تھا کہ یہ جتنی بھی معیشت کی خرابیاں ہیں' ان کا حل یہ ہے کہ ہر شخص سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جائے اور اس کی ضرورت کے مطابق اس کو اس کا معاوضہ دیا جائے۔ یہ ہے اس کا جو اصول تھا۔ دو فقروں میں اگلی بات بھی یہ کر دوں کہ خود اس کی پارٹی کے جو رفیق لوگ تھے' جسے Commarades کہتے ہیں' انہیں بڑی

خوشی ہوئی کہ بڑا حل مل گیا اور اس کے بعد اس سے ❶ کہا کہ جب یہ حل آپ نے دیا ہے تو اب اس کو آپ نافذ کیوں نہیں کرتے؟ کہنے لگے کہ یہی مشکل ہے' مارکس نے معذرت کر لی' معذرت کرنے کے معنی یہ ہونگے کہ جو میرا حل ہے کہ ایک شخص صبح سے شام تک جان مار کر محنت کرتا رہے' ایک دو دن میں نہیں' عمر بھر تو اس میں یہ کرے اور اس میں سے اتنا لے جتنی اس کی ضرورت ہے۔ اگر اس کی ضرورت دو روٹیوں میں پوری ہوتی ہے اور کمائی کرتا ہے بیس کی' اٹھارہ روٹیاں روز اس کو دوسروں کو دینی پڑیں گی۔ میں وہ جذبہ محرکہ Incentive (کہاں سے لاؤ)۔ اس نے کہا ہے کہ میں وہ Incentive نہیں پا رہا ہے کہ یہ شخص ساری عمر ایسا کیوں کرے' تو جب تک مجھے یہ Incentive نہیں ملتا میں اس کو نافذ نہیں کر سکتا۔ پارٹی کے ممبر جو تھے وہ اس کے مخالف ہو گئے لیکن میں سمجھتا ہوں وہ دیانتدار شخص تھا' اس نے منافقت نہیں برتی' جس چیز کو وہ سمجھتا تھا کہ وہ قابلِ عمل نہیں ہے' اس نے اعتراف کر لیا کہ اصول تو یہی ہے۔ کہا کہ یہ اصول اس وقت نافذ ہوگا جب کوئی اس کے لیے جذبہ محرکہ تلاش کر لے گا۔

## معاشیات کا وہ فارمولہ جو آج مارکس پیش کر رہا ہے وہ تو 14 سو سال پیشتر نبی اکرمؐ نے بیان کر دیا تھا

یہ چیز تھی جذبہ محرکہ جو قرآن کریم نے دیا۔ تاریخ بتا رہی ہے کہ کسی کو اجازت نہیں کہ ایک پائی بھی اس میں سے خود لے سکے' تقسیم کرنے والے کی صورت بھی یہی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ مارکس نے یہ بات کہی۔ ٹھیک ہے یہ مارکس نے کہاں سے بات لی؟ یہ نبی اکرم ﷺ نے جو یہ تقسیم کی' جو حضورؐ نے کی' اس کا عملاً یہ اصول تھا کہ وہ سپاہی جو مجرد ہوتا تھا Un-married ہوتا تھا' فیملی نہیں ہوتی تھی' اس کو آدھا دیتے تھے' فیملی والے کو دوگنا دیتے تھے۔ یہی تھی وہ تقسیم' یہی تھا تقسیم کا اصول جو پھر حضورؐ کے بعد بھی جاری رہا۔

## اسلام کی خدمت کرنے والا کا صلہ خدائے علیم وخبیر کے ہاں محفوظ ہے

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا تو وہ قول موجود ہے اس اصول کے مطابق یہ تقسیم مملکت کی ضروریات کے مطابق ہوتی ہے۔ کہا گیا حضرت ابوبکر صدیقؓ سے کہ صاحب! جن مجاہدین نے ابتدائے اسلام کے اندر اتنی مصیبتیں جھیلیں' اتنی قربانیاں دیں' اتنی ایثار ہوا ان کی خدمات کے معاوضے میں ان کو زیادہ ملنا چاہیے یہ کیا چیز ہوئی کہ ان میں سے اگر ایک شخص ہے اس کی ضرورت دو روٹیوں کی ہے تو وہ دیا جائے اور یہ ابھی حال ہی کے اندر جو لوگ آئے ہیں ان کو اتنا دیا جائے کہ اگر وہ بال بچے دار ہیں ان کی ضروریات زیادہ ہیں تو اس کے مطابق یہ ہو۔ تقسیم کا یہ اصول صحیح نہیں ہے۔ انہوں نے یہ خدماتِ اسلام کے لیے دی ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ قول ہے۔ کیا بات تھی' کہاں پہنچا دیا تھا وحی نے اور تربیتِ نبویؐ نے! آپؓ نے کہا کہ ان کی خدمات' ان کا صلہ خدا ان کو الگ دے

---

❶ یہ لینن نے کہا تھا۔

گا۔ میں معیشت کی بات کر رہا ہوں۔ یہاں روٹی کا سوال ہے' آہاہاہا آہاہاہاہا! کہا کہ وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (59:7)- ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یعنی آپ سوچیے کہ کہاں سے اس قوم کو اٹھا کر کہاں لے گئے ہیں۔ یہ اصول ہے کہ دولت کی تقسیم اوپر کے طبقے میں ہی نہ ہو سکے' یہ مملکت کے ہاتھ میں آتی ہے' وہ اسے تقسیم کرتی ہے تو وہ ان کے تصور میں بھی نہیں آتا کہ صاحب! جنہوں نے زیادہ خدمات کی ہیں ان کو تو زیادہ ملنا چاہیے انہوں نے کہا کہ یہ خدمات کا معاوضہ نہیں ہے' وہ اور جگہ ہوتی ہے' یہ ضرورت ہے۔

## حضرت ابوبکرؓصدیق کا آواز بلند اعلان نیز نکاح نامے میں خیانت اور پھر چار چار بیویوں والا معاملہ

آپ نے فرمایا کہ یاد رکھو! کہ تمہیں یہ اصول نیا لگے گا لیکن جو کچھ رسول دے' دل کی رضامندی سے اس کو قبول کرلو' جو چیز وہ تم سے روک لے دل میں کبھی گرانی نہیں گذرنی چاہیے جو رسولؐ دے اس کو لو' جس سے روکے اس سے رک جاؤ اور ابھی جو میں نے عرض کیا ہے کہ وہ جو بات آیا کرتی ہے۔ وہ دوسری وحی کی حدیثوں کی ہے۔ اس میں اسے بھی پیش کیا کرتے ہیں۔ وہ خدا نہیں تھا جو رسولؐ دے وہ لو اور جس کو روکے رک جاؤ تو گویا یہ تو رسولؐ کے احکام کی بات ہے۔ ان لوگوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے یا تو ان بیچاروں نے قرآن حکیم کبھی کھول کر دیکھا نہیں ہوتا' کہیں سے یہ چاروں لفظ سن پائے۔ یہ ہمیشہ آیتوں میں سے کچھ ٹکڑے لے کر اپنی مرضی کے' اتنا حصہ پیش کرتے ہیں۔ یہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ نکاح کے وقت مولوی صاحب جو خطبہ پڑھتے تھے حتیٰ کہ نکاح نامہ جو چھپا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے اوپر ایک آیت ہوتی ہے [1]۔ یہ جو ایک سے زیادہ بیویوں کا قرآن کریم کے اندر ایک اصول تو دیا ہے' وہ سورۃ النسآء کی آیت شروع ہی یہاں سے ہوتی ہے کہ وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی (4:3) اگر کہیں یہ ہو جائے تو عورتوں کی اتنی بہتات ہو کہ ان کے مسئلہ کا کوئی اور منصفانہ حل نہ تلاش کر سکو' یہ پہلے ہے۔ اگر یہ صورت پیدا ہو جائے تو اس کے لیے مملکت سوچ سکتی ہے کہ وہ ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت دیدے۔ یہ ہے جی! پوری آیت۔ یہ حضرات اپنے خطبے میں بھی اور وہ جو نکاح نامہ چھپا ہوا جس کا جی چاہے دیکھ لے' جس نے ابھی نکاح کرانا ہے' وہ ضرور دیکھ لیں' باقیوں کا نہیں میں کہہ رہا' وہاں یہ آج بھی فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ (4:3) سے شروع ہوتی ہے [1]۔ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (4:3) چار چار بیویاں کرتے رہو اور پہلا حصہ جو ہے وہ اس میں حذف کر دیا گیا ہے۔ اتنی جرأتیں بے باک ہیں۔

عزیزانِ من! خدا کی کتاب کے ساتھ یہ کچھ مذاق کرنا ہے۔ انہیں کوئی اور دلیل نہیں مل سکی ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی۔ دیکھیے! قرآن حکیم میں ہے کہ جو اچھی لگیں عورتیں ایک ایک دو دو تین چار چار اتنا ٹکڑا لیا' اس میں پہلا ٹکڑا حذف ہے۔ اس میں بھی

---

[1] اب یہ آیت نہیں دی جاتی۔

یہ اتنا ٹکڑا لیا۔ یہ آیت آ رہی ہے کہ جو کچھ مالِ خیر فے ملے وہ ایک ایک سپاہ جھپٹ کر نہ لے جائے۔ وہ یہاں مملکت کے نظام مرکز میں جمع کرائے۔ یہاں تقسیم اس طرح سے ہوگی کہ یہ مال اوپر کے اور ہی گردش نہ کرتا رہے۔ اس اصول کے تابع سر براہِ مملکت جو جس کو دے وہ بطیّبِ خاطر اسے قبول کرے جو اس سے روک دے وہ رک جائے یہ تھا جی اصول۔ یہ وہ کہتے ہیں یہ حدیث کے متعلق ہے کہ رسول اللہ ﷺ جو حدیث دیں اس کے مطابق عمل کرو جو حدیث نہ دیں اس کے مطابق نہ کرو یعنی اتنا ہی ٹکڑا پیش کرتے ہیں۔

## قرآن حکیم ایک ایسی فصیل ہے کہ کوئی شخص بھی اس کی گرفت سے باہر نکل ہی نہیں سکتا

آپ دیکھیں گے کہ یہ جو بڑے بڑے علامہ کہلاتے ہیں ان کے ہاں بڑے بڑے جو مجاور ہیں وہ اتنا ہی ٹکڑا پیش کرتے ہیں۔ کیا کہا جائے صاحب! بہرحال یہ جانیں اور قرآن والا جانیں ہم کیا کہہ سکتے ہیں. وَاتَّقُوا اللّٰهَ (59:7) . آہاہاہا! کیا بات ہے! یہی بات ہے جو درمیان میں نہیں رہی لڑو اس پہ جو کچھ تم حرکتیں کرتے ہو. کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (59:7). اس کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے:

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

یہ بڑی سخت ہیں بلکہ گرفت ہی نہیں کسی کا پیچھا کرنا ہو مفرور مجرم کو جس طرح سے پکڑتے ہیں کہا ہے کہ جاؤ تو کہاں جاتے ہو جا نہیں کہیں سکو گے صاحب! اس کے احاطے سے باہر نہیں نکل سکو گے۔

## قرآن حکیم کی طرف سے مکے کے مہاجرین کے لیے تحسین کا اظہار اور اہل مدینہ کی قربانیوں کا ذکر

پھر آگے آیئے کہ یہ کن کا حصہ ہے۔ کہا کہ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ[1] (59:8) یہ ان کا حصہ ہے جو پہلے بتایا اور یہ جو مہاجر آئے ہیں وہ اپنا سب کچھ وہاں تیاگ کر چھوڑ کر یہاں آ کر اس عسرت کی زندگی بسر کرتے ہیں وہ آ کر بیٹھے ہی ہیں کہ انہیں میدانِ جنگ میں جانا پڑ گیا تو کہنے لگے کہ تم بیچاروں کا اس مال متاع اور ساز و سامان کے اندر حصہ ہے۔ یہ ان کی ضرورت کے مطابق ہے جو کچھ انہیں وہاں سے دیا جائے گا یا اپنے گھر بار سے نکالے گئے انہیں سب کچھ چھوڑنا پڑا۔ کاہے کے لیے انہیں یہ سب

---

[1] اس مال میں ان نادار مہاجرین کا بھی حصہ ہے جنہیں ان کے گھروں سے بھی نکال باہر کیا گیا اور جن کا مال و متاع اور ساز و سامان سب چھین لیا گیا۔ انہیں معاشی سہولتوں کی سخت ضرورت ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ان کے دل میں قوانین خداوندی سے ہم آہنگ رہنے اور نظام خداوندی کی ہر ممکن مدد کرنے کی آرزو بھی موجزن ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے دعوائے ایمان کو اپنی قربانیوں سے سچ کر دکھایا (اور اسی ''جرم'' کی پاداش میں مخالفین نے ان پر اس قدر سختیاں کیں (22:40) (پرویزؒ: مفہوم القرآن ص۔ 97-1296)

کچھ چھوڑنا پڑا؟ یہ بات نہیں تھی کہ یہ وہاں رہ نہیں سکتے تھے۔ کہا کہ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا (59:8) یہ چاہتے یہ تھے کہ وہ قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگی کی زندگی بسر کریں اس کے لیے انہوں نے یہ سب کچھ قبول کیا تو یہاں اگر یہ کسی طرح مملکت کے پاس چار پیسے آ گئے ہیں تو ان بیچاروں کا یہ پہلا حصہ ہے۔ کیونکہ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ(59:8) یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنے عمل سے' اپنے ایمان کو سچا کر دکھایا ہے۔ اب ایک تو وہ تھے جو وہاں سے آئے۔

کہا کہ وَالَّذِیْنَ تَبَوَّؤُا الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِھِمْ یُحِبُّوْنَ مَنْ ھَاجَرَ اِلَیْھِمْ وَلَا یَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِھِمْ حَاجَۃً مِّمَّآ اُوْتُوْا [1] (59:9) کیا بات ہے! کہنے لگے کہ یہ تو آنے والے ہیں' اس اسکیم کو' خدا کے پروگرام کو' کامیاب بنانے کے لیے' بروئے کار لانے کے لیے' یہ سب کچھ چھوڑ کر آ گئے اور مدینے کے اندر بسنے والے' یہ نسبتاً غریب کاشتکار لوگ تھے۔ کہا کہ ان کی یہ کیفیت ہے کہ ابھی وہ یہاں پہنچے نہیں ہیں' انہوں نے سن پایا کہ اس طرح سے' یہ اس حالت میں آنے والے ہیں' تو انہوں نے اپنے ہاں گھروں کے دروازے کھول دیئے۔ پہلی چیز تو یہ تھی کہ جو کچھ کسی کے پاس اس کی ضرورت سے زیادہ تھا' وہ سارا اس نے دے دیا اور اتنی بات ہی نہیں' عزیزانِ من! قرآن کریم جو انقلاب برپا کرتا ہے' وہ تو اس سے آگے جاتا ہے۔ کہا کہ وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ وَلَوْ کَانَ بِھِمْ خَصَاصَۃٌ (59:9) خود تنگی میں گزارا کر لیا' ان کی ضرورتوں کو پہلے پورا کر دیا۔ یہ انقلاب ہے' یہ قلب کا انقلاب ہے' یہ Incentive کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔ دنیا کی کوئی مشینری' کوئی قانون' یہ نہیں کر سکتا۔

## اگر قلب کی تشنگی بجھانا مقصود ہو تو اپنی پیاس پر دوسروں کی پیاس کو ترجیح دینا ہوگی

عزیزانِ من! کیا مثال دی ہے۔ کہا ہے کہ وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ [2] (59:9) آؤ تمہیں بتائیں کہ پیاس کس کی بجھتی ہے؟ آہاہاہا! ایک لفظ قرآن کریم کا آ گیا ہے۔ وہ ہے یُّوْقَ شُحَّ (59:9) لفظی ترجمہ تو ہوگا کہ ''شحِّ نفس سے بچایا گیا'' یہ وہ ہے جو اصل میں کامیاب ہے۔ یہ ہے شحِّ نفس۔ یہ پہلے ہمارے ہاں تو اب بات بڑی آسانی سے سمجھ میں

---

[1] دوسری طرف' وہ لوگ بھی اپنے دعوائے ایمان میں اسی طرح سچے ہیں جنہوں نے ان لوگوں کی ہجرت سے پہلے ہی اپنے ایمان کو مستحکم کر لیا اور اپنے گھروں میں ان کے لیے جگہ بنا رکھی تھی۔ ان (انصارِ مدینہ) کی کیفیت یہ ہے کہ جو مومن بھی ہجرت کر کے ان کے پاس آتا ہے' یہ اس سے بڑی محبت سے پیش آتے ہیں اور انہیں (مہاجرین کو) جو کچھ بھی دیا جائے' اس کے متعلق ان کے دل میں کبھی خیال تک بھی نہیں گزرتا کہ یہ انہیں ملنا چاہیے تھا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1297)

[2] یاد رکھو! جو لوگ اپنے اندر ایسی تبدیلی پیدا کر لیں کہ اپنی پیاس بجھانے کے لیے دوسروں کو دھکا دے کر خود آگے نہ بڑھیں' بلکہ اگر دیکھیں کہ ان کی پیاس کی شدت زیادہ ہے تو خود پیچھے ہٹ جائیں اور انہیں آگے بڑھ کر پیاس بجھا لینے دیں' تو یہی لوگ ہیں جن کی کھیتیاں سرسبز ہوں گی (64:16)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1297)

آ جائے گی۔ گرمیاں آ گئی ہیں، عذابِ خداوندی ہے۔ یہ نلکے جو پبلک کے لیے باہر لگے ہوتے ہیں ان کے نیچے بالٹی رکھی ہوئی ہوتی ہے اور ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوتے ہیں کہ دے جا بابا! قطرہ قطرہ ٹپکتا ہے، پانی لینے والوں کی لائن لگی ہوئی ہوتی ہے۔ کہا کہ اس میں پیچھے والے کی بڑی کوشش ہوتی ہے کہ پہلے مجھے مل جائے، میری بالٹی آگے چلی جائے۔ کہنے لگے کہ یہ جذبہ کہ جو اگلا ہے، وہ یہ لے لے۔ اس لفظ کے لفظی معنی یہ ہیں کہ جو اگلا ہے، اُسے دھکا دے کر ایک طرف کر کے اپنی بالٹی نیچے رکھ دی جائے۔ کہنے لگا کہ جو اس جذبے سے محفوظ رہا، اس کی پیاس بجھی:

لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے

اپنی پیاس پر دوسرے کو ترجیح دینے والے، یہ شحِ نفس سے بچنے والے ہیں، عزیزانِ من! کمیونزم وہاں کیا پہنچ سکے گی! اسی لیے میں نے جو لکھا تھا کہ 'جہاں مارکس ناکام رہ گیا' اس سے آگے"[1]۔ وہ ٹھیک ہے کہ جذبہ اس کا[2] سچا تھا لیکن اس نے صحیح کہا تھا کہ میں Incentive (جذبہ محرکہ) نہیں پاتا جس سے یہ نظام کامیاب ہو سکے گا۔ جذبہ محرکہ یہ دیا گیا صاحب! کہ یہی نہیں کہ ان آنے والوں کے لیے اپنی ضرورت سے زائد جو کچھ تھا وہ محفوظ رکھ لیا بلکہ اپنی ضروریات پر انہیں ترجیح دی اور یہ نہیں کیا ہے کہ اپنی پیاس خواہ کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو، اس کی وجہ سے اگلے بالٹی والے کو دھکا دے کر اپنی بالٹی آگے کر دی جائے۔ یہ نہیں ہے۔ یہ ہوئے مہاجرین انصار۔

## خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں مہاجرین اور انصار کے مقام بلند کا ذکر

عزیزانِ من! قرآن کریم میں مہاجرین اور انصار ہی کو یہ نہیں کہا کہ وہ رضی اللہ عنہ و رضوا عنہ خدا ان سے راضی ہوا وہ خدا سے راضی۔ ان کے لیے جنّت ہیں، ان کے لیے مغفرت ہے، رزقِ کریم ہے بلکہ یہ کہا کہ ان کے بعد بھی جو آئے، اسی نقشِ قدم پہ چلنے والے جو تھے، ان کے لیے بھی یہ کچھ ہے، تو یہ تو نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں، ان کے زمانے میں، صدرِ اول میں، جتنے بھی یہ جماعت مومنین تھے وہ سب کے لیے قرآن کریم یہ بتاتا ہے ہر ایک کے لیے کسی کی استثناء نہیں ہے، اور ہمیں اس کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ ہم یہاں بیٹھ کر فہرستیں مرتب کرنی شروع کر دیں کہ کون کون تھا، ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ان کے نام لے کر یہ کہیں کہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ تمام کے تمام مہاجرین انصار اور ان کے بعد بھی جو جذبہ ایمان سے ان کے ساتھ شامل ہوئے۔ قرآن کریم ان کی شہادت دیتا ہے، تصدیق کرتا ہے۔ ان کو وہ کہتے ہیں کہ یہ مومن حقہ تھے، یہ سب کے سب پکے سچے مومن، خدا ان سے راضی، وہ خدا سے راضی،

---

[1] اسے پمفلٹ کی صورت میں بھی شائع کیا گیا ہے۔

[2] یہ کارل مارکس کی طرف اشارہ ہے۔

جنت ان کے لیے لکھ دی گئی' مغفرت ان کے حصے میں آ گئی' یہ سب کے لیے ہوا تو ہمارا تو ایمان یہ ہے۔ قرآن ہم سے یہ ایمان کے طور پہ منواتا ہے' ہم اس میں استثنا نہیں کر سکتے کہ فلاں سچا مومن تھا' فلاں پکا مومن نہیں تھا اور یہ تو ہمارے ذمے ہی نہیں لگایا۔

## ہم سے یہ پوچھا ہی نہیں جائے گا کہ انہوں نے کیا کیا تھا

قرآن کریم نے تو یہ کہا ہے کہ اس کا واسطہ ہی نہیں ہے' یہ لوگ اپنے اپنے وقت میں گزر گئے' جو کچھ انہوں نے کیا تھا' وہ ان کے لیے تھا' جو تم کرو گے وہ تمہارے لیے ہوگا: وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (2:134) ہم تم سے پوچھیں گے بھی نہیں کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ یہ تمہارے نصاب میں ہی نہیں ہے' Text میں ہی نہیں ہے' یہ کتاب یہ اس پیپر میں بات آئے گی ہی نہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ جی! پتہ کیا ہے اس کا کہ سوال Out of Text (کتاب کے باہر سے) بھی تو آ جاتے ہیں۔ ہزار برس سے یہ قوم آوٹ آف ٹیکسٹ جو سوالات ہیں' انہی کے حل کرنے میں لگی ہوئی ہے اور ٹیسٹ کا پتہ ہی نہیں کہ کہاں چلا گیا ہے۔ جناب! اور ہر امتحان میں فیل ہو رہی ہے' شخصیتوں کی بحثیں چل رہی ہیں۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ ہم پوچھیں گے ہی نہیں۔ خدا کہتا ہے' عزیزانِ من! کہ وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (2:134) ہم بالکل نہیں پوچھیں گے کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ یہ کہتے ہیں کہ صاحب! وہ کیا پتہ ہے تمہارا' پوچھ بیٹھو' تو پھر اسیں تے تیار ہو کے جانا اے (ہم نے تو تیار ہو کر جانا ہے) یہ سوال ہی نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم نہیں پوچھیں گے۔ ان کی ساری زندگی ہے۔ ان کی پوری تاریخ ہے مجھ سے پوچھو جوان وادیوں میں سے گزرا' کمرے بھرے ہوئے ہیں' ان کتابوں کے' ان بحثوں کے اوپر کہ فلاں صحابیؓ کیسے تھے اور فلاں صحابیؓ کیسے تھے۔ یہ سارا کا ہے کے لیے ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم پوچھیں گے ہی نہیں تم سے' تو اب پوچھو اس طالب علم سے جس نے کبھی محنت کی ہو اور وہ کچھ پڑھ کر جائے امتحان میں جو وہاں سوال ہی نہیں آنا کہ کیا ہو گا صاحب!

## ہمارے لیے گزرے لوگوں کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد

کہا کہ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ

---

❶ (اس میں شبہ نہیں کہ جو لوگ ایسے نامساعد حالات میں ہجرت کر کے آئے تھے' ان کے درجات بہت بلند ہیں لیکن) جو لوگ ان کے بعد آئے ہیں' (ان کا ایمان بھی بڑا محکم ہے) ان کی آرزو یہ ہوتی ہے کہ اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو ہمارے لیے بھی سامانِ حفاظت عطا فرما دے اور ہمارے ان بھائیوں کے لیے بھی' جو ایمان میں ہم پر سبقت لے گئے اور ہمارے دل میں کسی مومن کے لیے ذرّہ بھر کدورت نہ پیدا ہونے دے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' 1297)

**قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا** (59:10) [1] جو بعد میں بھی آنے والے ہیں' ان کی دعا ہوگی کہ یا اللہ! یہ جو پہلے گزر گئے ہیں' بڑے اچھے لوگ تھے' وہ ایمان کے ساتھ گزر گئے' تو یہ مغفرت کے ساتھ گزر گئے اور یہ کہا کہ یا اللہ! ان کے متعلق ہمارے دل میں کدورت نہ پیدا کر دینا۔ آہاہا! جو مومن سامنے ہیں' انہی کے متعلق یہ بات نہیں ہے' وہ جو گزر گئے ہیں' ان کے متعلق بھی دعا یہ ہے کہ ان کے متعلق ہمارے دل میں کہیں کدورت نہ پیدا ہو جائے۔ وہ آپ کو جنت کے متعلق معلوم ہے۔ یہ لفظ آیا تھا کہ وہاں داخل ہونے والوں کے لیے ہو جو گیٹ کیپر کھڑا ہوگا' وہ دلوں کو ٹٹولے گا کہ اس کے اندر کسی مسلمان بھائی کے خلاف کدورت کا جذبہ تو نہیں ہے' اسے وہ اندر جانے دے گا۔ جہاں اس نے دیکھا کہ صاحب! اس نے تو نیفے میں پستول چھپا رکھا ہے' وہ باہر نکال دے گا اسے۔

عزیزانِ من! سورۃ الحشر کی آیت 10 تک ہم آئے اور میں تو زائد وقت بھی چاہتا تھا لیکن کیا کریں یہ ان کے پیمانے اپنے ہیں' ان کا فیتہ [1] ختم ہو جاتا ہے ریکارڈ کرنے کا' تو اس پہ حکم آ جاتا ہے کہ ختم کر دو لیکن خیر یہ اتنا ہو گیا تو ہم سورۃ الحشر کی آیت 11 سے اگلے جمعے کو لیں گے۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ** (2:127)

❀......❀......❀

---

[1] ٹیپ

# دوسرا باب: **سورۃ الحشر** ( آیات 11 تا 23 )

عزیزانِ من! آج جون 1983ء کی 17 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الحشر کی آیت 11 سے ہو رہا ہے: (59:11)۔

## انسانی معاشرے میں منافق کا کردار بڑا نقصان دہ ہوتا ہے اور ذکر مدینے کے منافقین کا

سابقہ آیات میں آپ کو یاد ہوگا کہ حضور ﷺ کی مدینے کی زندگی میں منافقین کی ریشہ دوانیوں، سازشوں اور مقاعدوں کا سلسلہ کلام چلا آ رہا تھا کہ وہ اس نظام کی، اس انقلاب کی، اس تاریخ کی، اس دعوت کی، کس کس انداز سے نقاب پوشانہ مخالفت کرتے

تھے اور کتنی اذیتیں پہنچاتے تھے اور وہ سلسلہ جاری ہے۔ یہ دعوت تو ان کے خلاف تھی' آپس میں بھی منافقین کی جو کیفیت ہوتی ہے' اگلی آیات میں قرآن کریم نے اب ان کا ذکر کیا ہے۔ منافق تو منافق ہوتا ہے۔ وہ کسی کا بھی نہیں ہوتا' خود اپنے ہاں بھی منافق ہوتا ہے۔ منافقت تو ایک ذہنیت کا نام ہے۔ Mentality کا نام ہے۔ بھڑ ڈنک رکھتی ہے' وہ ہر جگہ ڈنک مارتی ہے' تو اب ان کے اپنے اندر جو ایک دوسرے کے ساتھ کیفیت ہوتی ہے' اس کا بھی ذکر آئے گا۔

کہا ہے کہ **اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ** ❶ (59:11) یہ یہودی' اس اہلِ کتاب کے منافقین میں سے تھے' کہتے ہیں۔ کہ کچھ تو اعراب تھے' خود عربی قبائل کے لوگ تھے اور دوسرے یہ اہلِ کتاب میں سے تھے۔ اگرچہ عیسائی بھی وہاں تھے لیکن یہ زیادہ یہودی تھے جو ان حرکات کے مرتکب ہوتے تھے تو پھر یہ دونوں آپس میں منافقین سے مل جاتے تھے۔ دوسرے یہ کہ یہ منافقین دوسرے منافق سے کہتے ہیں کہ تم مسلمانوں سے بھڑ جاؤ' ہم تمہارا ساتھ دیں گے' تمہارے خلاف کسی کی بات نہیں مانیں گے۔ اگر تم یہاں سے نکالے گئے تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکل جائیں گے۔ اگر تم نے جنگ کی تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔ یہ ان سے کہتے ہیں اور یہ ان کا سارا کچھ بیان قرآنِ کریم نے نقل کرنے کے بعد کہا کہ **وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ** (59:11) خدا ابھی سے یہ گواہی دیتا ہے کہ یہ بالکل جھوٹ بولتے ہیں یعنی ان کے ساتھ بھی جھوٹ بولتے ہیں' ہمارے ساتھ یا تمہارے ساتھ تو ایک طرف رہا' یہ جھوٹ بولتے ہیں اور وہ اس کے بعد کے واقعات نے بھی ثابت کر دیا کہ واقعی وہ ان سے بھی جھوٹ بولتے تھے۔

کہا کہ **لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ** ❷ (59:12) ان کو یہاں سے نکال دیا تو یہ کبھی یہاں سے نہیں جائیں گے۔ اگر انہوں نے جنگ چھیڑی تو یہ کبھی ان کی مدد نہیں کریں گے۔ اگر مرتے مراتے ساتھ چلے بھی گئے تو میدانِ جنگ میں یہ پیٹھ دکھا کر بھاگ آئیں گے اور پھر ان کا کوئی والی

---

❶ (یہ تو سچے مومنین کی حالت ہے۔ ان کے برعکس) تُو نے منافقین کی حالت پہ بھی غور کیا ہے؟ وہ اہل کتاب میں سے ان لوگوں کو' جنہوں نے نظامِ خداوندی سے انکار اور سرکشی اختیار کر رکھی ہے' اور جن کے ساتھ انہوں نے رشتۂ اخوت استوار کر رکھا ہے' کہتے ہیں کہ اگر تمہیں اپنے گھروں سے نکالا گیا تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکل جائیں گے' اور تمہارے معاملے میں ہم کسی کے حکم اور فیصلہ کی پروا نہیں کریں اور تم سے جنگ کی گئی تو ہم ضرور تمہاری مدد کریں گے (پرویزؒ: مفہوم القرآن ص ص 98-1297)

❷ اگر ان اہل کتاب کو گھروں سے نکالا گیا تو یہ کبھی اپنے گھروں کو چھوڑ کر ان کے ساتھ نہیں جائیں گے اور اگر ان کے ساتھ تمہاری جنگ ہوئی تو یہ کبھی ان کی مدد نہیں کریں گے۔ اور اگر طوعاً و کرہاً ان کی مدد کے لیے جائیں گے بھی تو عین لڑائی کے وقت' میدان سے بھاگ کھڑے ہوں گے۔ لہٰذا یہ ان کی مدد نہیں ہوگی (اُلٹی مخالفت ہوگی)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 1298)

وارث نہیں ہوگا' کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ کہا کہ ان کی کیفیت یہ ہے۔ اب جماعتِ مومنین سے مخاطب ہیں کہ **لَاَنۡتُمۡ اَشَدُّ رَهۡبَةً فِیۡ صُدُوۡرِهِمۡ مِّنَ اللّٰهِ** (59:13). کیا بات ہے صاحب! کہا کہ یہ قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی سے تو نہیں ڈرتے' تم سے ڈرتے ہیں اور آیئے! ہم اپنے سینوں کو ٹٹولیں کہ ہم انسانوں سے کتنا ڈرتے ہیں۔

## خدا کے قوانین سے ڈرنے کی بجائے انسانوں کا خوف

قانونِ خداوندی سے نہیں ڈرتے' چور چوری کرنے جاتا ہے تو وہ قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کر رہا ہوتا ہے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ کہیں سپاہی تو نہیں ہے یعنی اس کے دل میں' وہ جس کو یہ خدا کا ڈر کہتے ہیں' وہ خدا کا ڈر نہیں ہے' وہ خدا کے جو قوانین ہیں' ان کا جو نتیجہ تباہی اور بربادی نکلتا ہے' اصل میں وہ ہے' عذاب۔ یہ وہ چیز ہے کہ اس کا تو انہیں خیال نہیں ہوتا۔ خیال یہی ہوتا ہے کہ کہیں کوئی سپاہی تو نہیں دیکھ رہا۔ کسی قسم کی غلط حرکت کرنے سے پہلے یہ اطمینان کر لے کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا' کسی کو پتہ تو نہیں چل رہا۔ ساری فریب انگیزیاں اس پہ ہوتی ہیں کہ انسانوں کو پتہ نہ چل جائے اور اگر اس کے مقابلے میں ایمان کی بات کہیے' ایمان کے معنی یہ ہیں کہ یہ نہ ہو کہ کسی انسان کو پتہ چل رہا ہے یا نہیں' سپاہی دیکھ رہا ہے یا نہیں' جسے عام الفاظ میں کہتے ہیں کہ خدا دیکھ رہا ہے۔ وہ دیکھ یہ رہا ہوتا ہے کہ اس کے قانون کی خلاف ورزی کرنا جو ہے' وہ کوئی انسان دیکھے یا نہ دیکھے' اس کی گرفتاری ہو یا نہ ہو' عدالت سزا دے یا نہ دے' یہ سوال ہی نہیں ہے' وہ تو جو میں آپ احباب کے سامنے مثالیں دیا کرتا ہوں کہ سنکھیا اگر کمرے کے اندر بیٹھ کر بھی کھا لیا جائے' جہاں کوئی بھی نہ دیکھتا ہو' وہ اپنا ہلاکت انگیز اثر کر کے رہتا ہے' وہ اس کا محتاج نہیں ہوتا کہ وہ سپاہی پکڑے' عدالت میں لے جائے' وہاں سے سزا ملے' پھر وہ پھانسی کی کوٹھڑی میں جائے' وہاں سے پھر کوئی تارہ صبح اس کو تختہ دار کے حوالے کر دے۔ اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اپنا اثر کرتا ہے' وہ اپنا کام کرتا رہتا ہے' اس کا نتیجہ اٹل ہوتا ہے۔ کہا کہ ان لوگوں کی یہ کیفیت دیکھیے کہ یہ صرف انسانوں سے ڈرتے ہیں۔

## خدا دیکھتا ہے کا حقیقی مفہوم تو انسانی معاشرے کو جنتِ ارضی میں بدل دیتا ہے

میں نے ابھی عرض کیا ہے' عزیزانِ من! آیئے تو ہم اپنے دل کو ٹٹولیں۔ وہ جو اعلانیہ ہم جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں ان کو چھوڑ دیجیے' اپنے آپ کو ہی لیجیے یا ان لوگوں کو ہی لیجیے جو بظاہر بڑے بھلے مانس نظر آتے ہیں' کیا ان کی جو احتیاط ہے یا اس قسم کے جرائم یا اس قسم کی غلط کوششوں سے جو بچنا ہے' اس میں یہی بات تو نہیں ہے کہ وہ انسانوں کے ڈر کی وجہ سے ایسا نہیں کرتے۔ اگر یہ بات ہے جسے ایمان کہتے ہیں' اور خدا پر ایمان کے معنی یہ ہیں اس بات پر یقین کہ اس کے احکام اور قوانین کی خلاف ورزی کرنے کا نتیجہ میری تباہی اور بربادی ہوگی' سزا ہوگی' عذاب ہوگا' یہ ہے ایمان خدا پر۔ سوچیے عزیزانِ من! کہ اگر یہ ایمان دلوں کے اندر راسخ

ہو جائے' تو پھر یہ اتنی بڑی پولیس اور اتنی بڑی فوج اور یہ عدالتیں اور یہ محکمے اور یہ چھاپے مارنے والے اور یہ پھر عدالتوں میں گھسیٹ کر لے جانے کے لیے کسی کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے' حکومت کو نہ کوئی آرڈیننس نافذ کرنا پڑتا ہے' نہ پولیس متعین کرنی پڑتی ہے' نہ کوئی عدالت بٹھانی پڑتی ہے' نہ اس کام کے لیے کوئی جیل خانہ کھڑا کرنا پڑتا ہے کہ سنکھیا نہ کھاؤ۔ کسی قانون میں آپ نے یہ دیکھا یہ تو الگ بات ہے کہ کہا جائے گا کہ خودکشی نہ کرو' اس کے لیے ضرورت نہیں پڑتی اتنے انتظامات کی اس لیے کہ یہ ہمارا ایمان ہے کہ سنکھیا ہمیں مار دے گا اور اگر یہ ایمان ہو کہ دوسرے کی جو فریب دہی ہے' یہ بھی مجھے مار دے گی' تو پھر آپ اسی طرح سے اس سے بھی محتاط رہیں گے' جس طرح سنکھیا کھانے سے محتاط رہیں گے۔ یہ ہے خدا پر ایمان۔

میں نے عرض کیا کہ ہم میں سے جو بہرحال جرائم کے مرتکب نہیں بھی ہوتے' تو ذرا دیکھیں کہ وہ انسانوں کا ڈر ہوتا ہے' خدا کا ڈر نہیں یعنی خدا کے قوانین کی خلاف ورزی کے جو نتائج ہیں' ان کا خوف نہیں ہوتا' انسانوں کا ڈر ہوتا ہے تو بات تو قرآن حمید اس زمانے کے منافقین کی یہ کہہ رہا ہے۔ اور مسلمانوں سے جماعتِ مومنین سے کہتا ہے کہ تمہارا ڈر ان کے دل میں قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کے ڈر سے کہیں زیادہ ہے' اس سے ڈرتے ہیں' یہ لوگ قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی سے نہیں ڈرتے اور اسی لیے تباہ ہو جائیں گے۔ جہاں تمہارا ڈر ان کے سینے سے اٹھا' یہ تمام حرکات کرتے رہیں گے۔ اب وہ انسانوں کا ڈر اٹھا ہوا ہوتا ہے۔

## معاشرتی طور پر تمام تر مصائب کی بنیادی وجہ غور و فکر کی مفلوج کرنا ہے اور منافقین کا طرزِ عمل

یہ جو اتنے جرائم عام ہو جاتے ہیں تو یہ کیوں ہوتا ہے؟ کہا کہ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (59:13)۔ آپ دیکھیے! کہ قرآن کریم کس طرح توجہ دلاتا ہے کہ یہ غور و فکر سے کام نہیں لیتے۔ تو یہ جو چیز ہے کہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت ضروری ہے' وہ غور و فکر سے کام لینے سے اس نتیجے پہ انسان پہنچے گا۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ اس لیے ایسا کرتے ہیں اور ہمارے ہاں تو پھر شریعت کے معاملے میں عقل و علم اور غور و فکر جو ہے' اس کی تو ممانعت ہے' ان کا دخل ہی نہیں ہے۔ وہ ان منافقین کو کہتا ہے کہ یہ غور و فکر سے کام نہیں لیتے' تفکر سے کام نہیں لیتے' یہ يَفْقَهُوْنَ ہے۔ یہاں سے فقہ کا لفظ نکلا ہے۔ کہا ہے کہ لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ [1] (59:14)۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ جنگ میں بھی اگر یہ تمہارے سامنے آئیں گے تو منافقانہ جنگ کریں گے' یا تو قلعوں کے اندر بند ہو کر لڑیں گے یا گھر کی دیواروں کے پیچھے سے لڑیں گے۔ ان میں تو اتنی بھی جرأت نہیں ہے کہ کھل کر میدانِ جنگ میں تمہارے سامنے آ کر تم سے لڑیں۔

---

[1] (ان کے دل میں تمہارا رعب اس قدر ہے کہ) اگر یہ سب کے سب متحدہ محاذ بنا کر بھی تمہارے مقابلے کے لیے نکل کھڑے ہوں تو بھی کھلے میدان میں تمہارے سامنے آ کر مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں کر پاتے۔ یہ یا تو اپنی بستیوں کے قلعوں میں بیٹھ کر' یا شہر کی فصیل کی اوٹ میں' لڑائی کریں گے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1298)۔

## دیکھنے کے لیے تو ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد ہے لیکن گول ہر ایک کا مختلف' منزل ہر ایک کی جدا ہے

عزیزانِ من! دو ٹکڑوں میں بیان کی ہے۔ میں پھر عرض کرونگا کہ پہلے بھی میں نے عرض کیا تھا کہ ہمیں اپنے دلوں کو ٹٹولنا چاہیے کہ کیا یہ ہمارے ہی متعلق نہیں کہا جارہا؟ ارے دل! یہ تو اپنی داستان معلوم ہوتی ہے۔ وہ کیا داستان ہے کہ بَأْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ ❶ (59:14). یہ کیوں اتنے بزدل ہیں؟ کیوں ان کی جرأتیں مسلوب ہو چکی ہیں؟ اس لیے کہ ان کی آپس میں ایک دوسرے کیساتھ دلوں کے اندر لڑائیاں ہیں. تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتّٰى ❷ (59:14). اس ٹکڑے کو تو ہمارے ہاں عزیزانِ من! جگہ جگہ لکھا ہونا چاہیے۔ یہ اپنی داستان ہے۔ انہیں تم دیکھو گے کہ ہزاروں کی تعداد میں' لاکھوں کی تعداد میں' شاید ایک جگہ اکٹھے بیٹھے ہوئے ہیں' جمیعت ہے' جماعت ہے' پارٹی ہے' محاذ ہیں۔ کہا ہے کہ یہ اکٹھے نظر آئیں گے مگر دل ایک دوسرے سے الگ الگ ہونگے۔ کیا' جسے آج ہم امتِ مسلمہ کہتے ہیں' وہاں سے بات شروع کیجیے ساری دنیا میں ایک ارب کے قریب مسلمانوں کی آبادی کہا جاتا ہے' جسے ہم کسی ایک ملک کے اندر بسنے والے مسلمان کہیں گے' ان کو لیجیے کروڑوں کی تعداد میں ہونگے' اس ملک کے اندر بھی' جسے آپ ایک پارٹی کے افراد' ایک جماعت کے افراد' ایک فرقے کے پیراؤ بھی اگر آپ لے لیں گے' ان کو بھی لے لیجیے' سوچیے' تو سہی کہ ہماری جمیعت جو اتنے انسانوں کی نظر آئے گی بیٹھے ہوئے' ان میں سے کتنے ہونگے جن کے دل بھی ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہونگے۔ تو قرآن حکیم نے یہ جوامت بنائی تھی' ان کے لیے کہا تھا کہ فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ (3:102) اس نے دلوں کو جوڑا۔ فَأَلَّفَ کا لفظ دیکھیے یہ لفافہ لفظ تو آپ جانتے ہیں۔ وہ دلوں کو جوڑ کر حکومت بنا رہا ہے۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا (59:14). آپ Physically دیکھیں گے' اجسام کے طور پر ان کے جتنے پیکر بھی ہیں' وہ آپ کو لاکھوں کی تعداد میں' ایک جگہ بیٹھے ہوئے نظر آئیں گے۔ ان میں سے دو کے دل بھی آپس میں ملے ہوئے نہیں ہونگے۔ کہا کہ یہ ہے وجہ اس بات کی کہ ان کی جرأتیں مفقود ہو چکی ہوئی ہیں' حوصلے پست ہو چکے ہیں کھلے بندوں کفر پر بھی نہیں آتے۔ یہ منافقت اختیار کیے ہوئے ہیں۔

## اس قدر باہمی عناد اور شرک کا علاج ایک نصب العین کے اشتراک کے سوا اور کچھ نہیں

آپ نے غور فرمایا کہ آج ہمارے زوال کا باعث کیا ہے۔ یہاں سے وہاں تک' مراکش سے ملائشیا تک' بحر ذخار ہے ایک

---

❶ یہ اس لیے بھی ہے کہ ان کی باہمی مخالفت بڑی سخت ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1298)۔

❷ یہ اگرچہ سب اکٹھے دکھائی دیتے ہیں (اور معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بڑا اتحاد اور یگانگت ہے) لیکن ان کے دل' ایک دوسرے سے الگ ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 1298099)۔

مسلمان نام رکھانے والوں کا' کتنے ہیں جن کے دل آپس میں ملے ہوئے ہیں' عزیزانِ من! اور یہ پھر اگلی بات آ گئی کہ **ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْقِلُوْنَ** (59:14) یہ اس لیے ہے کہ یہ عقل وفکر سے کام نہیں لیتے۔قرآن حکیم کا درجہ تو آگے آئے گا۔پہلی چیز یہ ہے کہ وہاں لا یفقھون کہا۔یہاں **لَّا یَعْقِلُوْنَ** کہا۔بات تفقہ کی ہے سوچنے کی ہے اور آپ اپنے علم وعقل سے غور وفکر سے کام لیں گے تو اسی نتیجے پہ پہنچیں گے کہ تقویت تو ایک دوسرے افراد کی ان کی ہوگی جن کے دل ملے ہوئے ہونگے' ہم آہنگی ہوگی قلب ونظر کی' مقصد کی وحدت ہوگی' نصب العین کا اشتراک ہوگا وہ ایمان کی حدتک اس کے اوپر مشترک اس نصب العین کے اوپر اشتراک رکھے ہونگے' وہ ہونگے جو ایک دوسرے کے بازو بنیں گے' وہ ہونگے جن میں جرآتیں بیباک ہونگی' یہ عقل وفکر کی رو سے غور کرنے سے بھی قرآن حکیم کہتا ہے تم اس نتیجے پہ پہنچ جاؤ گے۔

## دلوں کی کدورت اور ذہنی انتشار افراد کی بلندظرفی اور جرأت کو مفقود کر دیتا ہے یہ ہے شیطان کی مثال

پھر وہ عقل وفکر کی بات آ گئی۔کہا کہ **کَمَثَلِ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ قَرِیْبًا ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِھِمْ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ** (59:15) یہ لوگ ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا' یہ دیکھ چکے ہیں کہ انہی جیسی ایک جو پارٹی تھی' اس کا انجام کیا ہوا تھا۔وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔اس کے باوجود وہ اپنی عقل وفکر سے کام نہیں لے رہے اس لیے یہ بات بھی انہیں صحیح راستے پہ نہیں لاسکتی کہ جو کچھ انہوں نے کیا تھا' ابھی ابھی ہمارے ہی ایک گروہ نے' ان کا نتیجہ' ان کا حشر کیا ہوا تھا۔ان کی کیفیت بھی انہی (یہود) کی سی ہے کہ وہ عقل وفکر سے کام ہی نہیں لیتے۔کہا کہ یہ آپس میں ان لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ یہ ایک دوسرے کے ساتھ لگائی بجھائی کرنے والے ہیں' اس کو کچھ کہا' اس سے کچھ کہا' دل میں کچھ ہے' باہر کچھ ہے' اسے اس نے کہا' بتایا کہ **کَمَثَلِ الشَّیْطٰنِ** (59:16) یوں سمجھو اس کی یہ مثال شیطان کی سی ہے کہ **کَمَثَلِ الشَّیْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اکْفُرْ فَلَمَّا کَفَرَ قَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْکَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰہَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ** [1] (59:16) وہ ادھر اس کے کان میں پھونک کے آ کے کہتا ہے کہ بھڑ جاؤ' اسے دھوکا دیدو۔اس کو اُکساتا ہے۔جب وہ یہ کر چکتا ہے تو اس کے بعد یہ کہتا ہے کہ نہ بابا! میرا تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔میں اللہ سے ڈرتا ہوں' توبہ توبہ! میں بالکل تمہارے ساتھ نہیں۔قرآن حکیم کہتا ہے کہ ان کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔

---

[1] (باقی رہے ان کے یہ حمایتی' یعنی منافقین جو ان سے مدد کرنے کے دعوے کر رہے ہیں تو) ان کی حالت اس شیطان کی سی ہے جو پہلے تو انسان سے کہہ دیتا ہے کہ حق کی مخالفت کرو' اور جب وہ اس کی مخالفت کرتا ہے اور (اس کے نتائج سامنے آتے ہیں تو) وہ الگ جا کھڑا ہوتا ہے اور صاف کہہ دیتا ہے کہ جو کچھ تم نے کیا ہے' میں اس سے بری الذمہ ہوں۔میں تو اپنے اللہ' رب العالمین' سے ڈرتا ہوں (منافقین کے وعدوں پر بھروسہ کرنے والوں کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے)۔(پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص1299)

## قرآن حکیم کے نزدیک کوئی سازشیں کرنے والا ہو یا بدعملی کرنے والا دونوں برابر ہیں

عزیزانِ من! آپ دیکھتے ہیں کہ معاشرے کے اندر یہ کچھ کرنے والے کتنے شیاطین ہوتے ہیں' اور کتنا بڑا پھر نیکوکار مومن متقی پرہیزگار بنتا ہے۔ کہتا ہے کہ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰہَ (59:16) نہ بابا! میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں۔ جب وہ کچھ کر رہا تھا' تو اس وقت اللہ سے نہیں ڈر رہا تھا۔ جب ایک کو دوسرے کے ساتھ بھڑا رہا تھا' سرگوشیاں کر رہا تھا' سازشیں کر رہا تھا۔ وہ اس وقت کہ نہیں' ڈرتا تھا وہ کہتا ہے نہیں' بابا! میں تو اللہ سے بالکل ڈرتا ہوں۔ اور قرآن حکیم کا فیصلہ یہ ہے کہ فَکَانَ عَاقِبَتَہُمَاۤ اَنَّہُمَا فِی النَّارِ خٰلِدَیۡنِ فِیۡہَا (59:17). یہ دونوں کے دونوں جہنم میں جانے والے ہیں۔ بظاہر تو یہ نظر آتا ہے کہ جرم اسی کا ہی ہے جس نے یہ سازش کی' کانا پھوسی کی' اکسایا' اس کو آمادہ کیا۔ چلیے! اس کا یہ جرم ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دونوں کے دونوں مجرم ہیں' دونوں جہنم کے اندر جانے والے ہیں۔ تم نے عقل و فکر سے کام کیوں نہ لیا؟ کیوں اس کی بات میں آ گئے؟ تو وہ جو اکسانے والے کی بات میں آ جاتا ہے' وہ بھی تو مجرم ہوتا ہے۔ یہ دونوں مجرم ہیں۔ یہ اسی لیے تفقہ اور عقل کی بات کی ہے کہ اتنی سی بھی تم اس وقت سوچ لیتے تو پھر اس کے فریب میں تم نہ آ جاتے۔

## حضرت عمر فاروقؓ کا قول: مومن نہ کسی کو فریب دیتا ہے اور نہ ہی کھاتا ہے

عزیزانِ من! پھر مجھے وہی فقرہ یاد آ جاتا ہے حضرتِ عمرؓ کا کہ جب ان سے کسی نے کہا تھا کہ مومن وہ ہے جو کسی کو فریب نہیں دیتا' انہوں نے کہا تھا کہ فقرہ پورا کرو' مومن وہ ہے جو کسی کو فریب نہیں دیتا اور کسی سے فریب کھاتا بھی نہیں ہے۔ مومن میں علیٰ حدِ بشریت صفاتِ خداوندی ہوتی ہیں۔ خدا اگر کسی کو فریب نہیں دیتا تو خدا فریب کھاتا بھی نہیں ہے۔ مومن بھی وہی ہے تو تم فریب کیوں کھا گئے' تم نے کیوں نہیں کیا۔ یہ وہی یفقھون اور یعقلون والی بات ہے جو قرآن کریم کہہ رہا ہے کہ خود تم نے اس بات کے لیے کیوں نہیں سوچا؟ اس کی بات میں کیوں آ گئے؟ تو عزیزانِ من! آپ غور کیجیے کہ خود یہ چیز جو ہے کہ غور و فکر سے آپ کسی نتیجے پہ نہ پہنچنا اور دوسرے کی بات میں آ جانا اور اسکے مطابق کچھ کر گزرنا' یہ خود جرم ہے اور ہم تو ہزار برس سے وہ دوسرے کی باتوں میں آ کر سب کچھ کر رہے ہیں خواہ وہ آپ کا مذہب ہو' خواہ وہ آپ کی دنیا ہو۔ جسے آپ تقلید کہتے ہیں' جسے اسلاف پرستی کہتے ہیں۔ یہ کیا ہے؟ کہ کسی نے کچھ کہا ہے جو آپ سے کہا جا رہا ہے کہ صاحب! یہ گناہ ہے' یہ ثواب ہے' یہ اسلام ہے' یہ غیر اسلام ہے' یہ جائز ہے' یہ ناجائز ہے' کبھی آپ نے عقل اور تفقہ سے خود کام لیا ہے کہ واقعی یہ ایسا ہے یا نہیں' مان لیتے ہیں اس کی بات۔ کسی کی بات کو بغیر سندِ خداوندی مان لینا' بنیادی جرم ہے۔ جو بات سامنے آئے تو عقل و فکر سے غور کرو' سند اس میں خدا کی دو۔ یہ ہے صحیح روشِ زندگی۔ کیا بات ہے کہ یہ دونوں مجرم ہیں۔ کہا ہے کہ وَ ذٰلِکَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیۡنَ (59:17). یہ دونوں ظالم ہیں۔

## سورۃ الحشر کے آخری رکوع کی اہمیت کے پیشِ نظر علامہ پرویزؒ کا تبصرہ

اس کے بعد عزیزانِ من! سورۃ الحشر کا آخری رکوع آ رہا ہے۔ یہ وہ رکوع ہے جسے عام طور پہ آپ دیکھیں گے کہ اس کی عام تلاوت ہوتی ہے۔ یوں تو قرآنِ کریم کا ایک ایک لفظ اپنی اپنی جگہ بے نظیر اور بے مثل ہے لیکن بعض مقامات اس میں ایسے آتے ہیں کہ جہاں اس کی فکر کی، حقائق کی، گہرائی اور اسلوب بیان کی رعنائی، بڑی ہی درخشندہ ہوتی ہے اور یہ وہ رکوع ہے جہاں کیفیت یہی ہے صاحب! میں بھی ساری عمر اس کی خاص طور پہ تلاوت کرتا رہا ہوں، اس کے اندر ایک خاص لذت ہے۔ آپ بھی دیکھیں گے، یہ اتنی جامع ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ اگر واقعی میں اس کے درس کے اوپر آؤں، جس کو نصاب کہتے ہیں، ٹیکسٹ کی طرح، ٹیکسٹ بک کی طرح پڑھانا کلاس کو، تو شاید یہ مہینوں میں بھی ختم نہ ہو۔ اس کا ایک ایک لفظ اتنا غور طلب، تشریح طلب ہے لیکن ہمارے پاس تو اتنا وقت نہیں، اتنی فرصت نہیں، اس لیے میں ان کے مفہوم تک ہی اکتفا کرونگا اور گزرتا چلا جاؤنگا، زیادہ توجیہات میں نہیں آؤنگا کہ وقت نہیں ہے .

## قرآن حکیم کی مختلف اصطلاحات کے متعلق ہمارے ہاں کے تراجم کی نوعیت اور ان کا حقیقی تصور

کہا ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ (59:18)۔ بات یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ عام ترجموں میں ہے کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ مفہوم ذہن میں نہیں آتا کہ یہ کیا تقویٰ اختیار کرو اور جب آگے پوچھو تو یہ کہ متقی بن جاؤ اور متقی اور پرہیزگار کا جو تصور ہمارے سامنے ہوتا ہے، وہ تو آپ کو پتہ ہی ہے کہا کہ صاحب! اتَّقُوا اللّٰهَ (59:18) یہ تو اللہ کے متعلق کہا ہے۔ اس کا ترجمہ ہو گیا ''ڈرو اللہ سے'' وہ جو اللہ کا ڈر ہے جو ڈر والی بات ہے وہ آپ کے قدم قدم پہ آئے گی اور خدا یہ کہتا ہے کہ جو مومنین کا صحیح معاشرہ ہے وہ یہ ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (2:62) انہیں کوئی خوف اور حزن نہیں ہوگا۔

میں نے عرض کیا تھا کہ یہ جو لفظ تقویٰ ہے، اس کے معنی کے لیے، اس کی تشریح کے لیے، پھر وہی حضرتِ عمرؓ کا بیان ہے۔ وہ بڑا عجیب جامع ہے اور وہ ایسا Graphic ہے کہ ذہن میں آ جاتا ہے کہ تقویٰ کسے کہتے ہیں۔ پوچھا گیا تھا کہ تقویٰ کیا ہوتا ہے۔ کہا کہ تم کہیں پگڈنڈی پہ گزرے ہو جس کے ادھر دوہری طرف خاردار جھاڑیاں ہوں۔ انہوں نے کہا کہ جی! ہاں کہا کہ سمجھ لو، پھر کیسے گزرتے ہو تو عربوں کا لباس تو آپ جانتے ہیں، وہ ٹینٹس ہوتے ہیں، وہ جو پہنے ہوئے تھے، اتنا اتنا کھلا سا وہ لباس ہوتا ہے۔ کیسے گزرتے ہو؟ کہنے لگے کہ جی! وہ ادھر سے یوں سمیٹتا، ادھر سے یوں سمیٹتا ہوں، پھر بیچ میں سے جاتا ہوں۔ کہا کہ اسی کو تقویٰ کہتے ہیں۔ کیا بات ہے صاحب! یہ اتنا احتیاط برتنا ہے غلط کاموں سے، کانٹوں سے، کہیں دامن الجھ نہ جائے اور اللہ کا لفظ ہے۔ یہ خدا کے قوانین کی اس طرح سے احتیاط کرنا، احتیاط برتنا ہے، یہ محتاط ہو کر غلط راستوں سے گزرتا ہے کہ کہیں میں کانٹوں میں الجھ نہ جاؤں اور

راستہ وہ ہے جو خدا نے متعین کیا ہوا ہے۔ اتَّقُوا اللّٰهَ (59:18) تم ہر حال میں قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو' قوانینِ خداوندی کی احتیاط برتو کہ کہیں تمہارا کوئی کام ان قوانین کے خلاف نہ ہو جائے۔

## تم نے آنے والے وقت کے لیے کیا بھیجا ہے یا کیا کیا ہے

اور اگلے لفظ' میں کیا عرض کروں! کہا کہ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (59:18)۔ اب میں کیا عرض کروں۔ اس کو کیا عرض کروں! دیکھو یہ کہ تم نے اپنے کل کے لیے کیا کیا بھیجا ہے اور تشریح پہ آ جاؤں تو میں نے کہا ہے کہ کم از کم مہینہ لگ جائے۔ تم نے اپنے کل کے لیے کیا بھیجا ہے؟ وہ کل جو ہے وہ ہے وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (2:4) جسے مستقبل کہتے ہیں' جسے Future کہتے ہیں' جیسے ایک سانس کے بعد اگلا سانس جو آ رہا ہے' وہ بھی Future ہے' آج کا دن اس کے بعد جو کل کا Tomorrow آنے والا دن ہے' وہ بھی Future ہے' وہ قوم کی زندگی میں آج کی زندگی کے بعد جو اس قوم کی دوسری زندگی ہے' وہ بھی Future ہے اور جو قرآن حکیم کی رو سے اس زندگی کے بعد' موت کے بعد کی زندگی جو ہے' وہ جسے وہ آخرت کہتے ہیں' وہ بھی مستقبل ہے۔ وہ جامع بات ہے قرآن حکیم جو بتا رہا ہے۔ ابتداء ہی پہلے صفحے پہ قرآن کریم کے یہ ہوا کہ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (2:4) یہ وہ قوم ہے جس کی راہ مستقبل کے اوپر رہتی ہے اور آج کی دنیا میں بھی کسی سے پوچھو کہ جس قوم کی نگاہ مستقبل کے اوپر ہو' وہ قوم دنیا کے اندر کتنی بلند پایہ ہوتی ہے۔ ایک تو مفادِ عاجلہ (Immediate Gain) ہے کہ ابھی جو کچھ ملتا ہے' سو لے لو' عاقب کی خدا جانے۔

اب تو آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

## انسان عمل پہلے کرتا ہے جب کہ نتیجہ اس کا بعد میں نکلتا ہے عاقبت کا لفظ جو غور طلب ہے

کہا ہے کہ کل کے لیے تم نے آج کیا بھیجا ہے۔ یہ ہیں قرآن کریم کے الفاظ۔ عمل کا نتیجہ ہمیشہ اس کے بعد مرتب ہوتا ہے' عمل پہلے وجود میں آتا ہے' کام جو بھی آپ کرتے ہیں' نتیجہ بعد میں آتا ہے اسی لیے اس کے لیے قرآن کریم نے عاقبت کا لفظ یا عواقب کا جو لفظ ہے استعمال کیا ہے۔ عواقب تو آپ جانتے ہیں۔ یہ الفاظ تو ہمارے ہاں بھی استعمال کرتے ہیں لیکن جب ہم عاقبت کہتے ہیں تو پھر وہی مرنے کے بعد والی قیامت ہوتی ہے حالانکہ زندگی کے اندر تو ہر دوسرا سانس پہلے سانس کے بعد میں آتا ہے' جو پیچھے لگا ہو۔ عقب کے معنی پیچھے لگا ہوا۔ قرآن کریم کہتا یہ ہے کہ تمہارا ہر کام' جو تم کرتے ہو' اس کا نتیجہ اس کے پیچھے لگا ہوا ہوتا ہے۔ کیا بات ہے کہنے کی! کہ وہ تو پیچھے لگا ہوا ہوتا ہے' اس کا وہ نتیجہ محسوس طور پر بعد میں سامنے آتا ہے اس لیے اس کو کہا کہ بعد میں

آنے والی جو چیز ہے' تم نے اپنے کل کے لیے کیا بھیجا ہے۔ آج جو کچھ تم کر رہے ہو' اس کا نتیجہ کل مرتب ہونا ہے۔ وہ کل یہی نہیں چوبیس گھنٹے والا' جو کل ہے مہینوں کا سالوں کا کل ہے' عمل کے بعد جو بھی وقت آئے گا' وہ اس عمل کا کل Tomorrow آنے والا ہوگا' وہ اس کا Future ہوگا' وہ اس کی عاقبت ہوگا۔ اس کے پیچھے نتیجہ لگا ہوا ہے۔

## انسان کے جرم کا نتیجہ جانور کی دم کی طرح اس کے ساتھ چپکا ہوتا ہے

آپ کو معلوم ہے کہ گناہ کا جو ہم ترجمہ کرتے ہیں' وہ عربی زبان میں ذنب ہے' یہ بات آ چکی ہوئی ہے۔ ذنب کے معنی مویشیوں کی دم ہوتا ہے۔ یہ جو مویشیوں کی دم ان کے پیچھے چپکی ہوئی ہوتی ہے' کہتا ہے کہ جہاں جی چاہے' وہ مویشی چلا جائے' وہ ان کے ساتھ چپکی ہوتی ہے۔ کیا بات ہے ان عربوں کے الفاظ کی بھی اور قرآن حمید کے انتخاب کی بھی! یعنی جہاں جی چاہے' وہ مویشی چلا جائے' وہ دم اس کے پیچھے چپکی ہوئی ہے' پیچھا چھوڑتی نہیں ہے۔ اسے عمل کا نتیجہ کہتے ہیں' جاؤ تو کہا جاتے ہو۔ کہا ہے کہ وَلۡتَنۡظُرۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ لِغَدٍ (59:15) یہ جو پیش پا افتادہ مفاد ہوتے ہیں' ان کو تو ہر شخص دیکھتا ہے: ابھی یہ سودا یوں کیا' اور اس کے بعد یہ اتنا آ گیا کہ اس سودے میں ہیر پھیر کیا ہے اس کے متعلق کیا ہے۔ کہا کہ اس کا نتیجہ ذرا بعد میں نکلے گا۔ لغد یہ ہے۔ کہا کہ سودا کرتے وقت اتنا ہی نہ دیکھو کہ اس وقت مجھے اس کا کتنا فائدہ ہوتا ہے۔ دیکھو یہ کہ اس کے بعد مستقبل میں اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے اور مستقبل جاتا ہے آخری زندگی تک' اخروی زندگی تک نہیں بلکہ آخری زندگی تک۔

## اسلامی زندگی اور غیر اسلامی زندگی کی وضاحت اور جسم و جاں کے تعلق کی نوعیت

اب میں عرض کرتا ہوں کہ اسلام کی یہ بات ایمان سے شروع ہوتی ہے' وہ اللہ کی بات بعد میں آتی ہے' انسان کی پہلے بات آتی ہے۔ انسان کی زندگی کے متعلق جو ایک نظریہ یا تصور ہے' وہ ہے اسلامی اور اس کے خلاف انسان کی زندگی کا تصور غیر اسلامی ہے۔ تصورِ زندگی یہ ہے کہ زندگی اسی طبعی زندگی (Physical Life) کا نام نہیں ہے۔ یہ جسم کی زندگی کا ہی نام نہیں ہے۔ یہ بھی ضروری ہے لیکن زندگی اسی کا نام نہیں ہے۔ انسان کے اندر ایک اور چیز بھی ہے۔ جسے اس کا نفس' اس کا Self' اس کی Personality' اس کی خودی کہتے ہیں' یہ باتیں بار بار آ چکی ہیں۔ اصل نشوونما کا خیال رکھنا' حفاظت کرنا اس Self کا ہے۔ یہ جو جسم ہے' یہ اس کا ایک ذریعہ ہے۔ منزل تک پہنچنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے۔ گھوڑا ضروری ہوتا ہے' وہ مقصود بالذات نہیں ہوتا' اسے تندرست و توانا رکھنا ہوتا ہے تاکہ آپ کو منزل تک پہنچا دے۔ انسانی جسم کی پرورش' نشوونما' حفاظت ضروری ہے لیکن یہ مقصود بالذات نہیں ہے۔ یہ انسانی ذات کی نشوونما کے لیے ایک ذریعہ ہے۔ وہ جو انسان کی ذات ہے' وہ جنہیں قرآن مجید کی اقدار کہتے ہیں' جنہیں آپ Values کہتے ہیں' ان کے مطابق زندگی بسر کرنے سے اس کی نشوونما ہوتی ہے۔ اچھا کھانے سے جسم کی پرورش

ہوتی ہے لیکن یہ جو آپ نے کھایا ہے یہ حلال کا کھائیں' حرام کا کھائیں' جسم کی پرورش ہو جائے گی۔ تو کھانا چوری کا ہو یا آپ نے کمائی کا لایا ہوا ہو' وہ اپنا اثر اسی طرح سے کرے گا۔ جسم کی پرورش میں اس کا کوئی احتیاج نہیں' تفریق نہیں لیکن انسانی ذات پہ وہ اثر پڑتا ہے۔ اگر وہ حرام کا کھانا ہے تو انسانی ذات' انسانی شخصیت مٹ جاتی ہے۔ اگر وہ حلال کا کھانا ہے تو اس سے نشوونما ہو جاتی ہے۔ اسے اقدار کہتے ہیں تو ہر دنیاوی کام کے وقت دیکھنا یہ ہوگا کہ اس کا اثر میری ذات پہ کیا پڑتا ہے اور قرآن کریم نے جو چیزیں کہی ہیں' وہ یہ ہیں کہ یہ جائز ہے' یہ ناجائز ہے' یہ حرام ہے' یہ حلال ہے۔ یہ گناہ ہے' یہ ثواب ہے۔

## حلال وحرام میں تمیز پیدا کرنے کا تفصیلی ذکر

عزیزانِ من! وہ اس کا Detemining Factor ہے۔ جس چیز سے دونوں میں تفریق ہوتی ہے' وہ یہی ہے کہ کیا وہ صرف جسم کی پرورش کے لیے ہے یا اس کے ساتھ انسان کی ذات کی پرورش بھی ہوتی ہے؟ اگر انسانی ذات کی پرورش ہوتی ہے تو وہ ثواب بھی ہے' جائز بھی ہے' نیکی بھی ہے' حلال بھی ہے اور اگر اس کی پرورش کی بجائے وہ مضمحل ہوتی ہے' اس میں نقص پیدا ہوتا ہے' کمزوری پیدا ہوتی ہے' تو وہ چیز حرام بھی ہے' گناہ بھی ہے' ناجائز بھی ہے۔ اسے یوں کہتے چلے جایئے۔ یہ جو کہا ہے کہ کل کے لیے دیکھو' جسم کی پرورش تو اسی وقت ہو جاتی ہے' آپ کو سخت پیاس لگی ہوئی ہو' آپ پانی اٹھا کر پی لیجیے' پیاس بجھ جائے گی۔ اس کا فوری نتیجہ سامنے آئے گا یا مثلاً وہ کہیے کہ وہ جوس پی لیجیے تو پیاس بجھ جائے گی۔ اگر جسم کی پرورش بھی ناجائز مال سے ہے' حرام کا مال ہے اس کا نتیجہ ذرا بعد میں جا کر نکلے گا۔ یہ ہے وَلۡتَنۡظُرۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ لِغَدٍ (59:15) ہر بنیادی کام کرتے وقت یہ دیکھو کہ اس کے بعد Future میں اس کا مجھ پہ اثر کیا پڑے گا۔ اللہ اکبر! دیکھ رہے ہیں کہ یہ کس طرح سے ہے اور قرآن کریم کیا کہتا جا رہا ہے کہ ہر دنیاوی کام کرتے وقت تمہاری نگاہ کہاں ہے۔ اگر صرف جو یہ Immediate Gain پیش پا افتادہ مفاد ہے' جسے قرآن حمید عاجلہ مفاد کہتا ہے اس پہ ہر شخص کی نگاہ ہوتی ہے جو عاجلہ مفاد ہے۔ اگر اس کی پرواہ نہ ہو' نفع نقصان کی پرواہ نہ ہو تو پاگل کہتے ہیں۔ ارے! وہ تو پاگل ہے' اسے نفع نقصان کا بھی پتہ نہیں لیکن وہ نفع نقصان' انسانی جسم کا نفع نقصان یا طبعی زندگی کا نفع نقصان ہوتا ہے۔ جسے انسان کی اپنی ذات کا یا وہ جسے مستقبل کہتے ہیں' اس کے نفع نقصان کا جس کو علم نہ ہو' ہم میں سے اسے کوئی پاگل نہیں کہتا۔ اصل پاگل تو وہ ہے اس لیے کہا ہے کہ وَلۡتَنۡظُرۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ لِغَدٍ (59:15) اس پہ دھیان رکھو' نگاہ میں یہ بات رکھو کہ اس کے بعد اس کا جو انجام' اس کا جو نتیجہ مرتب ہونے والا ہے' وہ کیا ہے صاحب؟

## خدا کے جاننے کا مفہوم اور خدا کو بھلا دینے کے معنی اور پھر اس کا نتیجہ

کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ (59:18). یہ دیکھیے! جو کچھ تم کرتے ہو' کوئی اور دیکھنے والا یا باخبر ہو یا نہ ہو' خدا

اس سے باخبر ہوتا ہے لیکن یاد رکھیے! یہ جو خبیر کہا ہے اس کے یہی معنی نہیں ہیں کہ اس کو اس کا علم ہوتا ہے۔ بس تو علم ہوتا ہے تو ہوا کرے۔ وہ جانتا ہے۔ یہ جو وہ جاننے کے 'ماننے کے' ہیں کہ اس سے تم چھپا نہیں سکتے۔ وہ نتیجہ مرتب ہو کر رہتا ہے صاحب! اور آگے جو الفاظ آئے ہیں' اُن کے لیے تو اب میں سوچتا ہوں کہ کیا عرض کروں! کیا بیان کروں! کہا ہے کہ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ (59:19) ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کو بھلا دیا۔ خدا کو بھلا دیا! نتیجہ اس کا کیا ہوا؟ عزیزانِ من! غور سے سنیے اور جا کر گھر میں بھی ان الفاظ کو دیکھیے گا۔ نتیجہ کیا ہوا؟ کہا کہ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ (59:19) خدا نے انہیں اپنے آپ سے بھلا دیا۔ اللہ اکبر۔ ''خدا کو بھلا دیا'' تو خدا کو کیا ضرورت ہے' وہ تو اس وقت بھی خدا تھا' جب دنیا میں کوئی بھی پیدا نہیں ہوا تھا' عدم میں تھے کائنات' وجود میں نہیں آئی تھی۔ تم نے اس کا بھلا دیا تو کیا ہو گیا؟ یہ بات نہیں ہے کہ خدا نے اسے فراموش کر دیا۔ بات یہ ہے کہ اس کا نتیجہ سوچو کہ کیا ہوا اور اس کے اوپر' میں اب کیا عرض کروں' کہ اس کی تشریح اور اس کی وضاحت جو ہے' کیسے آدھے گھنٹے میں کر دوں.

## خدا کو فراموش کرنا اپنی ذات کو فراموش کرنا ہے جب کہ حیوان ایسا نہیں کرتا

کہا ہے کہ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ (59:19). خدا فراموشی حقیقت میں خود فراموشی کا نام ہے۔ یہ خود فراموشی کیا ہے؟ انسان انسانی جسم کو اپنی طبعی زندگی کے مفاد کو سامنے رکھتا ہے' اس کو وہ نہیں بھولتا تاوقتیکہ وہ کوئی نشئی نہ ہو یا پاگل نہ ہو۔ وہ اس کو تو رکھتا ہے۔ خدا فراموشی سے یہ بات نہیں ہوتی. کہا ہے کہ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ (59:19). پھر ان کی ذات' ان کا Self' ان کا نفس' نظر انداز ہو جاتا ہے اور جب وہ نظر انداز ہوا تو مقصدِ زندگی گیا' ختم ہوا' پھر حیوانی سطح کی زندگی رہ گئی' یہ Physical Life طبعی زندگی اور اس کی نشوونما اور پرورش اور سامان' یہ سارے کا سارا تو حیوانی سطح کی زندگی کا ہے' ہر حیوان اپنے لیے اور اپنے بچوں کو لیے یہ کرتا ہے۔ اصل چیز تو یہ حیوان' اس کا جسمانی نشوونما یا پرورش' مقصود بالذات ہے' یہ کسی مقصد کا ذریعہ نہیں اس لیے اس کے ہاں حرام اور حلال کی تمیز کا سوال نہیں ہے۔ اس کے ہاں تو جو چیز مفید اور مضر ہے' اس کا علم خدا نے اس کے اپنے اندر رکھ دیا ہوا ہے' جسے جبلت (Instinct) کہتے ہیں۔ وہ وہاں جائز ناجائز والی بات نہیں ہے بس یہ سمجھ لیجیے کہ خدا نے جب بکری کے لیے گوشت حرام قرار دیا ہے تو وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی لیکن وہ یہ بات نہیں۔ انسان کی زندگی میں یہ چیز ہے کہ جو کچھ اقدارِ خداوندی کے مطابق ہے' وہ ہے جس سے انسانی نفس سامنے رہتا ہے۔ خدا کو بھلانے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے احکام' اس کے قوانین' اس کی اقدار' اس کے اصولِ زندگی' فراموش کر دیا تو نتیجہ کیا ہوا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ تم نے خود اپنی ذات' اپنے آپ کو فراموش کر دیا ہے' اس کو بھول گئے کہ زندگی یہ تھی. کہا کہ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ (59:19). اسی لیے اقبالؒ نے اس انداز سے یہ کہا ہے:

شاخِ نہالِ سدرۂ خار و خسِ چمن مشو ❶

یوں تو تُو سدرہ کے شجر یعنی شجرِ سدرہ' کی ایک شاخ ہے۔ یہ انسان کو کہہ رہا ہے۔ تُو یہ باغ کا جھاڑ جھنکاڑ یہ پتے' یہ کوڑا کرکٹ کیوں ہو جاتا ہے۔ خار و خس کہاں؟ یعنی کوڑا کرکٹ نہ بن۔ تُو تو شاخِ نہال سدرہ ہے۔ یہ اپنے آپ کو خار و خس کیوں بناتا ہے؟ شاخِ نہالِ سدرہ تمہاری بلندیاں ہیں' خار و خس تمہاری پستیاں ہیں۔ یہ تو اُس پستی پہ کیوں آتا ہے۔ اس شعر کا اگلا مصرع ہے۔

منکر او اگر شدی منکرِ خویشتن مشو ❶

اگر کسی وقت تُو اس کا منکر ہو بھی گیا ہے تو منکرِ خویشتن مشو۔

اپنے آپ کا منکر نہ ہو۔ اپنے آپ کا منکر ہو جائے گا تو پھر تو کبھی بھی ایسا نہیں ہوگا کہ تُو خدا کا اقرار کرے۔ اس کا انکار نہیں کرے گا تو اس کے بعد یہ ہوگا کہ پھر اس کا اقرار کرے۔ اس کے اقرار کیے بغیر چارہ ہی نہیں۔ اس کے بعد تو منکرِ خویش کا ہونا جو ہے' یہ ہے اصل میں اسلام چھوڑ دینا۔ سوچیے' عزیزانِ من! آج مسلمانوں کی اس ایک ارب کی آبادی میں سے کتنے ہیں جو اس معیار کے اوپر پورے اترتے ہیں۔ منکرِ خویش تو نہیں ہیں؟ کہا کہ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ❷ (59:19). کیا لفظ ہیں صاحب! آپ کو یاد ہوگا' میں نے کہا تھا کہ فسق کہتے ہیں' یہ پھل جو پکتا ہے تو اس کے اوپر اس کا وہ ایک چھلکا ہوتا ہے' وہ چھلکے کے اندر رہتا ہے تو پک جاتا ہے۔ آپ کئی پھل دیکھیں گے مثلاً آم ہی اگلے دنوں دیکھیں گے' وہ ایک طرف سے چھلکا پھٹا ہوا سا ہوتا ہے' وہ ایک طرف کو نکل گیا ہوتا ہے۔ وہ اندر سے پکتا نہیں ہے۔ وہ جو اس پیٹرن یا اس چھلکے کو توڑ کر اپنا راستہ آپ نکال لینا ہے' اسے فسق کہتے ہیں۔ فاسق وہ ہوتا ہے جو خدا کے بتائے ہوئے پیٹرن (پیکر) کے اندر اپنے Self کو نہ رکھے' پھر وہ Self جو ہے' کبھی پختہ ہوتا ہی نہیں ہے۔

---

❶ (اے انسان!) تُو سدرہ کے پودے کی شاخ ہے' چمن کا کوڑا کرکٹ نہ بن۔

❷ (تم اس حقیقت کو یاد رکھو کہ مقصودِ حیات' صرف انسانی ذات کی طبعی' زندگی کی' پرورش نہیں' اس کی ذات کا ارتقا اور بالیدگی بھی مقصود ہے بلکہ بنیادی مقصد یہی ہے۔ طبعی زندگی تو اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ یہ مقصد' قوانینِ خداوندی کے اتباع ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ لہٰذا تم کہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے قوانینِ خداوندی کو پس پشت ڈال دیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود ان کی اپنی ذات ہی ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی (اور ان کی زندگی' حیوانی سطح کی زندگی بن کر رہ گئی۔ وہ ''میں'' کو بھلا بیٹھے اور ان کا منتہائے مقصود ''میرا'' رہ گیا) یہی لوگ ہیں جو صحیح راستے سے ہٹ کر' غلط راہوں پر جا پڑتے ہیں۔ خدا کو بھلا دینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان خود اپنی حقیقت سے ناآشنا ہوتا ہے۔ خدا فراموشی اور خود فراموشی لازم و ملزوم ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 1300-1299)۔

## اصحاب الجنۃ کے لیے قرآن حکیم نے فآئزون کا لفظ استعمال کیا ہے

کہتا ہے کہ لَا یَسۡتَوِیۡۤ اَصۡحٰبُ النَّارِ وَ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ ہُمُ الۡفَآئِزُوۡنَ (59:20) . یہ دونوں گروپ اکٹھے ہوگئے۔ایک وہ کہ جن کی نگاہ صرف انسان کی طبعی یا جسمانی زندگی کے اوپر ہے۔ وہاں اقدار و احکامِ خداوندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' صرف Immediatly مفادِ عاجلہ کی طبعی زندگی پر ہے۔ یہ جہنم والی زندگی ہے' دوسرے وہ ہیں کہ جن کی نگاہ انسانی ذات کے اوپر' خدا کی اقدار کے اوپر ہوتی ہے' وہ خدا کو بھلاتے نہیں ہیں اس لیے وہ اپنی ذات کو نہیں بھلاتے۔ یہ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ ہیں اور یہ وہ ہیں کہ جنہوں نے واقعی کچھ کمایا' کچھ نفع اٹھایا ۔ فَآئِزُوۡنَ(59:20) فوز Achievement کو کہتے ہیں کہ جو کچھ حاصل کیا۔ یہ بات پھر دوسری طرف چلی جائے گی۔ تمام مذاہب میں نجات کا تصور ہے کہ کسی مصیبت سے چھٹکارا پانا۔ قرآن کریم میں فوز کا تصور ہے' کچھ حاصل کرنا Achieve کرنا. کہا اولٰٓئِکَ ھُمُ الۡفَآئِزُوۡنَ (59:20) کامیابیاں اور کامرانیاں صرف اہل جنت کے حصے میں آتی ہیں۔ یہ چیزیں قرآن کریم کے اندر تم کو ملیں گی جو کچھ ہم بتا رہے ہیں۔

## قرآنی احکامات کی عظمت اور اس کا انداز بیاں

قرآن حکیم کی عظمت کی ایک مثال یہ ہے کہ لَوۡ اَنۡزَلۡنَا ہٰذَا الۡقُرۡاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیۡتَہٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنۡ خَشۡیَۃِ اللّٰہِ[1] (59:21). آپ اسلوب بیان اور الفاظ کی ترتیب دیکھ رہے ہیں کہ کس قدر عمدہ ہے! وَ تِلۡکَ الۡاَمۡثَالُ نَضۡرِبُہَا لِلنَّاسِ (59:21). ہم یہ مثال کے طور پہ بات سمجھا رہے ہیں' سچ مچ نہ سمجھ لینا۔ کہا کہ قرآن حمید تو وہ ہے کہ اگر ہم اسے قلبِ کوہ میں نازل کر دیتے' پہاڑ کے اندر نازل کر دیتے' اور اسے احساس ہو جاتا' تو تم دیکھتے کہ وہ پتھر کس طرح سے کانپنے لگ جاتے' ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے' صاحب! انسانوں کے دل' اس نے دوسری جگہ کہا ہے کہ پتھر ہیں۔ پھر کہا کہ نہیں پتھروں سے بھی گئے گزرے ہیں کیونکہ بعض پتھر ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں سے پانی نکل آتا ہے۔ ان کے اندر تو پانی کا قطرہ نہیں۔ یہ جو اس احساس سے اندر سے پانی کا قطرہ نکل آیا ہے۔

ہیرا بھی ہے گل تو پتھر ہے
یوں قدر نہیں کچھ ہوتی ہے

---

[1] (اور یہ جنت اسی صورت میں حاصل ہوسکتی ہے کہ قرآن تمہارے دل کی گہرائیوں میں اُتر جائے۔ اس قرآن کی اثر انگیزیوں کا یہ عالم ہے کہ اگر مثال کے طور پر) ہم اسے کوہ قلب کے اندر رکھ دیتے (اور اُسے احساس عطا کر دیتے) تو' تُو دیکھتا کہ اس کی خلاف ورزی کے احساس سے اس پر لرزہ طاری ہو جاتا' اور ذمہ داریوں کے احساس سے اس کا جگر شق ہو جاتا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1300)۔

ہاں آنسو ہو کر بہہ نکلے

پھر جو قطرہ ہے موتی ہے

قلبِ کوہ میں ہم اس کو اتار دیتے اور اسے احساس دیدیتے تو تم دیکھتے کہ کس طرح سے کانپ اٹھتا اور کس طرح ندیاں اس کے قلب سے جاری ہو جاتیں۔ کہا کہ وَتِلْکَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ (59:21). ہم مثالیں سے یہ بات سمجھاتے ہیں۔ کیوں؟

## قرآن حکیم کی عظمت کے سلسلہ میں صفات خداوندی کا ذکر

اس لیے کہ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (59:21) لیجیے یہ بات تیسری بار آ گئی۔ يَفْقَهُوْنَ (59:13) پہلے آیا يَعْقِلُوْنَ (59:14) پھر آیا لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (59:21) آیا۔ دو دو تین تین آیتوں کے فاصلے کے اوپر الفاظ چلے آتے ہیں' بات ساری عقل و فکر کی ہے' غور و تدبر کی ہے قرآن حکیم کے اندر سوچنے کی بات ہے۔ کہا ہے کہ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (59:21) اور اس لیے ہے کہ وہ تفکر کریں۔ یہ قرآن حکیم ایسا ہے کہ یہ اس خدا کا نازل کردہ ہے۔ اور کونسے یہ خدا کا نازل کردہ ہے؟ اب آگے جو تین چار آیتیں آتی ہیں' عزیزانِ من! اس میں خدا کی صفاتِ حسنا میں سے خاصی صفات آ گئی ہیں' پوری کی پوری تو نہیں ہیں' وہ تو بہت زیادہ ہیں' لیکن بڑی نمایاں صفات ہیں اور بڑے انداز سے آئی ہیں۔ کہا ہے کہ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ (59:22) . افوہ! وقت تھوڑا رہ گیا! کونسا خدا ہے جس نے اس قرآن کریم کو ایسا بنایا ہے؟ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ (59:22) . وہ خدا' یاد رکھیے! کہ ایک تو خدا کی ذات ہے' وہ تو ہمارے وہم اور گمان اور قیاس اور خیال اور تصور میں بھی نہیں آ سکتی ہے۔ ہم نہیں جان سکتے' وہ دوسری اس کی صفات ہیں کہ وہ ایسا ہے' وہ ایسا ہے۔ وہ بھی یہ نہیں کہ ہم اس کی ذات کے متعلق اس کی کنہ و حقیقت کے متعلق نہیں جان سکتے۔ اس نے خود اپنے متعلق جو صفات بتائی ہیں' وہ دین کی صحیح بنیاد ہیں' خدا کے صحیح تصور پر ہے اور اس کا تصور ان صفات کی رو سے قائم ہوتا ہے جو اس نے خود بتائی ہیں اور قرآن کریم میں محفوظ ہیں اسی لیے وہ اس سے باہر خدا کو ماننے والوں کو خدا کا ماننے والا تسلیم ہی نہیں کرتا' وہ نہیں مانتا وہ انہیں بھی دعوت دیتا ہے کہ خدا پر اس طرح ایمان لاؤ اس طرح جیسے قرآن کریم نے بتایا ہے کیونکہ قرآن کریم میں جو صفاتِ خداوندی ہیں' وہ خود خدا نے اپنے متعلق بتائی ہوئی ہیں۔ یہ باقی جتنے بھی خدا کے یا مذاہب کے متعلق اختلافات اور جھگڑے اور نزاع ہیں' وہ اس لیے ہیں کہ انسانوں نے خدا کو اپنے تصور کے مطابق ڈھالا ہے۔ قرآن کریم ماننے والا اپنے تصور کا خدا نہیں مانے گا۔ وہ اس خدا کو مانے گا' جس خدا کا تصور قرآن کریم نے متعین کیا ہے ورنہ وہ ہمارا خدا تو وہ ہے جو دورِ ملوکیت میں بنا' جس قسم کا یہاں کا آپ کے ہاں کا سلطان' اسی قسم کا ہم نے خدا بنا دیا ہوا ہے۔ کہا ہے کہ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ (59:22) . یہ وہ ہے۔ اس لیے وہ ذات کے متعلق نہیں بتاتا کہ کیا ہے؟ کیسا ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ لَآ اِلٰـهَ اللّٰهُ (59:22) . پہلی بات تو یہ کہ کوئی صاحبِ اقتدار نہیں اس کائنات میں اس

کے سوا' یہ میں بے شمار دفعہ عرض کر چکا ہوں۔ یہ جو الہ یا اللہ ہے' وہ صاحبِ اقتدار کو کہتے ہیں' جس کے پاس سپریم اتھارٹی ہو' جو اپنی اتھارٹی کے اندر ہو۔ اقتدار کے معنی عظمتوں کا مالک ہے۔ اس کی کائنات میں کسی اور کا اختیار و اقتدار نہیں۔ ملوکیت کے زمانے میں اقتدار تو بادشاہ کے پاس ہوتا تھا' تو پھر خدا کو صاحبِ اقتدار ماننے سے تو اس کا اقتدار چھنتا تھا۔ اس نے کہا کہ نہیں' پرستش خدا کی کی جائے گی' حکم ہمارا مانا جائے گا اور خدا رہ گیا پرستش کے لیۓ پھر پرستش تو جس کا جس طرح جی چاہے کرے' الہ اللہ کے معنی ہی معبود ہوگئے. کہا ہے کہ لَآ اِلٰـــهَ اللّٰهُ (59:22) . دیکھیے اب آتی ہیں صفاتِ خداوندی! یہ کس کس انداز میں آتی ہیں؟ کہا کہ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ (59:22). پہلے تو یہی چیز آ گئی' پہلے یہ سمجھ لو' سوچ لو اس کی نگاہوں سے کچھ اوجھل نہیں ہے۔ وہ غیب اور شہادت دونوں کو جاننے والا ہے۔ شہادت تو وہ ہوتا ہے جو محسوس طور پر سامنے آئے۔ غیب وہ ہے جو نگاہوں سے اوجھل ہو اور وہ غیب کو بھی جانتا ہے شہادت کو بھی۔ یاد رکھیے! یہ غیب اور شہادت کا جو امتیاز ہے' یہ ہمارے نقطہ نگاہ سے ہے یعنی جو ہماری نظروں سے غائب ہے' اس کو غائب کہیں گے' جو ہمارے سامنے ہے اس کو شہادت کہیں گے' ورنہ خدا کے علم کی رو سے تو غیب اور شہادت میں فرق نہیں۔ اس کے تو سب کچھ سامنے ہے۔ اس کے لیے تو جسے کل آپ Future کہتے ہیں' وہ بھی کوئی شے نہیں' نہ Past ہے' نہ Future ہے۔ ہر چیز جو ہے' اس کے سامنے تو Present ہی ہے اس لیے جب وہ کہے گا کہ وہ خدا غیب اور شہادت کو جانتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ تمہاری نظروں سے غائب ہے' اوجھل ہے' وہ اسے بھی جانتا ہے' جو تمہارے سامنے ہے' اسے بھی جانتا ہے اور وہ سب کچھ جاننے کے باوجود وہ سامانِ نشو و نما مہیا کرنے والا خدا ہے۔ وہ جو اس کو یہ نہیں بھی مانتا' وہ بھی جب پانی پیتا ہے تو اس کی پیاس بجھ جاتی ہے' وہ ایسا نہیں کرتا کہ بیٹھا ہوا یہ کہے کہ اپنی پارٹی کا آدمی ہے' ہاں ہاں! ٹھیک ہے صاحب! اس کو دیدو' اتنا دوسری پارٹی کا ہے' ہاں جی! اس نے فلاں زمانے میں دوسری پارٹی کو ووٹ دیا تھا اچھا یہ بات ہے۔ تو اسے باہر نکال دو هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ (59:22). کیا خدا ہے صاحب اور کیا صفات میں اس کی! اب وقت بھاگتا جا رہا ہے اور صفات دیکھیے کس طرح سے پہلے آ رہی ہیں۔ پھر الفاظ کو دیکھیے' عزیزانِ من! کس حسنِ ترتیب سے اور تفصیل سے قرآن کریم نے اس چیز کو دیا. هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰـــهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ (59:23). اللہ اکبر! کیا جلال ہے! Proclamation کے اندر الفاظ ہیں۔ لفظِ قرآن کے معنی Proclamation (اعلانیہ) ہیں' عزیزانِ من! مملکت کی طرف سے جو ایک اعلانیہ شائع ہوا کرتا ہے' وہ یہ ہے۔ وہ ہے لَآ اِلٰـــهَ (59:23). صرف خدا کی طرف سے ہے۔ کہا کہ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ (59:23). اور یہ خدا کی صفات ہیں .

## مفہوم القرآن میں جابجا خدا تعالیٰ کی صفات کی وضاحت قابل توجہ اور قابل تحسین ہے

سُبۡحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ (59:23). جو کچھ کوئی دوسرا اپنے ذہن سے اس کے اندر اس کی صفت ملاتا ہے' وہ اس سے بہت بلند ہے' منزہ صفات وہی ہیں جو اس نے دی ہیں۔ اب ان میں سے ایک ایک صفت کے متعلق میں اگر چلوں گا تو کیا عرض کروں اس کے اوپر ایک ایک ٹیکسٹ لکھنی پڑے گی۔ اب یونہی چلا جاتا ہوں اب ایک تو میں یہ عرض کرونگا' فرصت مل جائے تو آپ نے میرا مفہوم القرآن دیکھا ہے' اس میں یہ جو آیات ہیں ان کا مفہوم جو میں نے دیا ہے وہ میں نے الفاظ کے انتخاب میں خاص کوشش کی تھی کہ ان کا مفہوم پوری طرح سے آ جائے۔

## خدا کی صفت الملک المقدوس السلم المومن کا جامع مفہوم اور ہمارے ہاں کے تراجم

کہا ہے کہ اَلۡمَلِکُ (59:23) اور ملک کا لفظ تو اتنا جامع ہے' یہ مالک بھی ہے' یہ قادر بھی ہے' یہ قوت رکھنے والا بھی ہے' یہ بادشاہ بھی ہے' یہ صاحبِ اقتدار بھی ہے۔ یہ اس کے اندر ساری چیز آ جاتی ہے۔ یہ ہے اَلۡمَلِکُ (59:23) پھر ہر ملک' ہر بادشاہ' حکومت' ایک Territory (علاقہ) ہوتی ہے۔ اس دائرے کے اندر وہ ملک ہوتے ہیں' کوئی بھی جو ہوں وہ ملک ہے۔ کہا کہ الۡقُدُّوۡسُ (59:23) میں نے عرض کیا ہے کہ عام ترجموں سے تو یہ قرآن کریم کی عظمت ہی نہیں سامنے آتی۔ کہا کہ اَلۡمَلِکُ (59:23) بادشاہ' قدوس' پاک۔ اس کے معنی ترجمہ آپ کہیں بھی دیکھیں گے تو یہ ہوگا خدا کی پاکی بیان کرو۔ آپ کیا سمجھے؟ قدس کے معنی ہیں "جس کی وسعتیں لاانتہا ہوں"۔ ملک ہے "جس میں Particular Territory اس کی ساری دنیا کی جتنی سلطنتیں اور مملکتیں ہیں' ان کا جتنا اقتدار ہوتا ہے وہ اس Terrority کے اندر' حدود کے اندر ہوتا ہے جہاں ملک کہا۔ اس کے بعد کہا: الۡقُدُّوۡسُ (59:23) وہ ملک کہ جس کی مملکت کی حدود' حدود فراموش ہیں۔ قدوس اس کو کہتے ہیں۔ مقدس تو ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ "پاک ہو گئے"۔ میں نے کہا کہ الفاظ کے معنی جو بدلے ہیں آ کر اس مذہب کی رو سے جو ہزار سال میں تبدیل ہوا ہے اس نے قرآن کریم کو کہیں سے کہیں پھینک دیا ہے۔ قرآن کریم تو ایک طرف' خدا کا صحیح تصور بھی سامنے نہیں آ سکتا۔ مقدس کے معنی پاک ہو گیا۔ کہا ہے کہ اَلۡمَلِکُ الۡقُدُّوۡسُ السَّلٰمُ الۡمُؤۡمِنُ (59:23) اس کی یہ مملکت' یہ اقتدار' یہ لاانتہا' یہ لاانتہا وسعتیں' یہ ساری کی ساری کاہے کے لیے ہیں؟ کہا کہ السَّلٰمُ (59:23) کے لیے ہیں' تمہاری سلامتی کے لیے ہیں اور سلامتی کے معنی صرف Peace نہیں ہوتا۔ وہ تو ایک Negative پہلو ہے کہ خطرہ نہ ہونا' اس میں کوئی چیز Positive نہیں آتی' خطرہ نہ ہونا۔ اسلام کے معنی ہوتا ہے "اس کی تکمیل ہو جانا" اور میں کہا کرتا ہوں کہ مرغِ مسلّم تو آپ جانتے ہی ہیں۔ مسلمان سے تو بات ہماری سمجھ میں آتی نہیں۔ وہ ہوتا کیا ہے؟ مرغِ مسلّم تو سمجھ میں آتی ہے' اگرچہ آج کل وہ بھی سنت ہی ہیں کہ کہاں کہاں ہوتا ہے وہ الۡقُدُّوۡسُ السَّلٰمُ خود اپنی ذات کے اندر پوری

تکمیل کی انتہا تک پہنچا ہوا' انسانوں کی ذات کی تکمیل کرنے والا' اور تکمیل کی پہلی شرط امن اور سلامتی کی ہے۔ جب آپ کو خطرات کا دھڑکا ہو تو آپ کی تکمیل کیا ہو گی؟ وہ تو ہر وقت آپ اسی فکر میں لگے ہیں کہ کسی طرح سے بچ جائیں۔ تکمیل تو پورے اطمینان سے ہوتی ہے' امن میں ہوتی ہے۔ اس لیے کہا کہ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ (59:23)۔ مومن۔ خدا مومن ہے۔ ترجمہ ایمان لانے والا ہے تو اب خدا کو یہ کہیے کہ ایمان لانے والا ہے تو وہ کس چیز پہ ایمان لانے والا ہے؟ مومن کے معنی ہوتا ہے ''امن کی حفاظت دینے والا'' ملک ہے'' بے انتہا وسعتیں ہیں اس کی مملکت کی' سلام ہے۔ مقصد مملکت کا اور اس اقتدار کا اور وہ سلامتی اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے۔

## خدا کی ذات اگر المومن ہے تو وہ المھیمن بھی ہے اور پھر العزیز بھی

جب امن کا یقین ہو' تو المومن بھی ہے اور وہ ہے الْمُهَيْمِنُ (59:23) کسی خاص کے لیے نہیں مُهَيْمِنُ کہتے ہیں ''سب کو اپنے احاطہ حفاظت میں لے لینے والا''۔ قرآن کریم کے متعلق بھی ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے' خدا نے کہا ہے: مُهَيْمِنُ ہے' یہ تمام جتنی بھی اس سے پہلے صداقتیں دی گئی تھیں' ان کو اپنے اندر محفوظ رکھنے والا۔ قرآن مھیمن اور خدا بھی مھیمن ہے۔ آگے کہا کہ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ (59:23) صاحبِ اقتدار۔ وہ تو میں نے کبھی عرض کیا تھا کہ الفاظ کے معنی ہے۔'' کیسے بدلتے ہیں مثلاً عزیز کا ہوا کہ وہ میرا عزیز ہے ہماری ان سے عزیز داری ہے۔ اچھا تو یہ رشتہ داری ہو گئی۔ عزت کے معنی کچھ Respect سا ہو گیا حالانکہ اس کے بنیادی معنی قوت اور اقتدار کے تھے۔ وہ میرا عزیز ہے' خدا میرا عزیز ہے۔ اے نہیں چاچا دا پتر اے عزیز (یہ نہیں بلکہ چچا کا بیٹا ہے عزیز)۔ العزیز: وہ صاحبِ اقتدار ہے۔

## الجبار المتکبر کا وہ مفہوم جو قرآن حکیم متعین کرتا ہے

عزیزانِ من! اگلے دو الفاظ ہین۔ الجبار اور المتکبر ہیں۔ یہ عام الفاظ ہیں اور عام مفہوم میں دیکھیے تو خدا کا تصور کس قسم کا آتا ہے؟ کہا ہے کہ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ (59:23) اوئے ہوئے ہوئے جبار تو آپ سمجھتے ہیں کہ جبر کرنے والا ظالم ہے۔ صاحب! اور پھر متکبر تکبر والا ہے' وہ بڑا متکبر ہے صاحب! وہ خدا کے متعلق یہ الفاظ لائے ہیں۔ عربی زبان سے پوچھیے' قرآن کریم سے پوچھیے' خود معنی متعین کیجیے' عزیزانِ من! متعین کیجیے اور پھر جھوم جھوم جایئے اقتدار کا ہے کے لیے ہے؟ اگر ہڈی ٹوٹ جائے تو اب تو اس پہ پلستر لگاتے ہیں' وہ بھی اسی کی شکل ہے۔ اس سے پیشتر وہ لکڑی کی پٹیاں لگاتے تھے۔ اِدھر ایک' اُدھر ایک اور پھر اس کو کس کر باندھتے تھے کہ ذرا ہلنے نہ پائے۔ یہ جو دو لکڑیاں نیچے اوپر رکھتے تھے' ان کو جبائر کہتے تھے۔ یہ جو لکڑیوں کے ذریعے سے ٹوٹی ہوئی ہڈی کو باندھ کر' تو یہ اصلاح کرنے والا یا الحاق کرنے والا تھا' وہ جابر کہلاتا تھا۔ یہ اس کا سارا اقتدار اس لیے کہ انسانیت کی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو قوت کے زور سے صحیح کر دے' ان کو جوڑ دے، ہڈیاں توڑنے والا آج کا جابر ہے اور ٹوٹی ہوئی ہڈیاں جوڑنے والا خدا کا جابر

ہے۔اس کے جبر اور اس جبر میں جو فرق ہے نظر آتا ہے۔

## ہمارے تراجم نے قرآنی تعلیم کو کچھ اس قدر مسخ کر دیا ہے کہ خدا کی کبرائی کا مفہوم ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا

عزیزانِ من! کہا یہ ہے کہ قوت تو یہاں بھی ہوتی ہے' عزیز یہاں بھی ہوں گے' اب بھی یہ صاحبِ اقتدار ہیں ان کا جو اقتدار ہے' وہ اپنے قوت کے شکنجے میں جکڑیں گے تاکہ مخالفین کی ہڈیاں ٹوٹیں' وہ بھی اس لیے جکڑے گا کہ ٹوٹی ہوئی ہڈی جڑ جائے اور اس کے لیے تکبر کے معنی غرور اور فخر نہیں ہے۔اس کے معنی ہیں' کبریائی کا مالک۔ یہ تو آپ نے سمجھ لیا' جب ہم کہتے ہیں اللہ اکبر! وہ وہی کہ ب رہے' اس کے معنی کبریائی ہے' یہ ساری کبریائی ہے۔ کبریائی کے تو لفظ کے معنی نہیں آسکتے صاحب! وہ مجھ سے ایک نے پوچھا تھا کہ یہ ہم کہتے ہیں اللہ بہت بڑا ہے' تو یہ غیر مسلم تھا جس نے یہ پوچھا تھا کہ یہ بڑا ہونا اور چھوٹا ہونا تو کچھ تصور نہیں قائم کرتا۔ میں نے کہا کہ یہ بات نہیں' اس میں Supremacy ہے' وہ پاورز کے اندر Supreme ہے' اس کے اوپر کوئی اور پاور نہیں ہے۔ آج کے معنی ہیں' جسے Sovereignty کہتے ہیں۔ وہ تو ایک مملکت کے اندر ہوتی ہے' پوری کائنات کے اندر جو Supremacy ہے' انتہائی قوت اور اقتدار کا جو مالک ہے' یہ وہ ہے۔اسے کہتے ہیں المتکبر۔اب کیا کروں وقت ہی نہیں ہے۔

## خدا تعالیٰ کی ذات اپنی ہر قسم کی صفات میں یکتا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں

عزیزانِ من! ورنہ میں کہتا کہ یہ جو قرآنِ کریم میں رمضان روزے کہا ہے وہ یہ ہے تاکہ تم خدا تعالیٰ کی کبریائی کو دنیا کے اندر مسلط کرو اس لیے وہ الجبار المتکبر ہے۔ آگے کہا ہے سُبۡحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ (59:23). یہ جو ہم صفات بیان کرتے ہیں' ان میں کسی اور کو اگر تم نے شریک کر لیا کہ وہ بھی صاحبِ اقتدار ہے' اس کو بھی اتھارٹی حاصل ہے' تو یہ شرک ہو گیا۔ خدا اس سے بہت دور ہے کہ اس کی صفات میں کسی اور کو بھی ملایا جائے۔

عزیزانِ من! آیت تو یہ ایک اور آگے بھی باقی ہے' صفات اس میں بھی باقی رہتی ہیں' لیکن اب مجھے اجازت نہیں دیں گے وہ جو ریکارڈ کرنے والا ٹیپ ہوتا ہے۔ اصل میں وہ ہے ہماری بندش۔ یہ بندش شیخ صاحب نہیں ہیں۔ تو وہ ختم ہو جاتا ہے اور یہ ٹیپ اب قریباً قریباً ساری دنیا میں' یورپ میں بھی' امریکہ میں بھی' کینیڈا میں بھی' جاتے ہیں' تو ان کی خاطر ہمیں وہاں رکنا پڑتا ہے تو میں پھر رک جاتا ہوں۔ اگلے درس میں اس آخری آیت کی چند صفات وہ بھی آجائیں گی اور پھر اس کے بعد دوسری سورۃ بھی ہم شروع کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀......❀......❀

# تیسرا باب: **سورۃ الحشر** (آخری آیت 24)

**بسم اللہ الرحمن الرحیم**

عزیزانِ من! آج جون 1983ء کی 24 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الحشر کی آخری آیت 24 سے ہو رہا ہے:(59:24)۔

## خدا کے تخلیقی پروگرام کے سلسلہ میں خدا تعالیٰ کی صفات کا ذکر

سابقہ آیات میں صفاتِ خداوندی کا ذکر آ رہا تھا مثلاً 23ویں آیت میں بھی تھا کہ ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیۡ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اَلۡمَلِکُ الۡقُدُّوۡسُ السَّلٰمُ الۡمُؤۡمِنُ الۡمُھَیۡمِنُ الۡعَزِیۡزُ الۡجَبَّارُ الۡمُتَکَبِّرُ سُبۡحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ(59:23). یہ جو صفات تھیں وہ یا نظم و نسقِ کائنات سے متعلق تھیں یا خود انسانی دنیا میں مکافاتِ عمل کے متعلق۔ اس کے بعد زیرِ نظر آخری 24ویں آیت میں تین الفاظ میں وہ صفات بیان کی گئی ہیں جن میں خدا کے تخلیقی پروگرام کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ الفاظ ہیں' عزیزانِ من! ھُوَ اللّٰہُ الۡخَالِقُ الۡبَارِئُ الۡمُصَوِّرُ لَہُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی(59:24). تو تین الفاظ خالق باری اور مصور ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان تین الفاظ کی تحسین ہے کہ جس انداز سے قرآن کریم نے پورے سلسلہ ارتقاء کو' جسے Evolution کا پروگرام کہتے ہیں' تین لفظوں میں جس حسن و اعجاز سے سمٹا کر رکھ دیا ہے اور ہم لوگ تو کیا جانیں' ہمیں تو ان علوم کے ابجد سے بھی واقفیت نہیں۔ وہ جو ان علوم کے امام ہیں' وہ Appreciate کر سکتے ہیں کہ قرآنِ کریم نے کروڑوں سالوں پر پھیلے ہوئے سلسلہ ارتقاء کو تین لفظوں میں کس طرح سمٹا دیا ہے۔ یہ بڑے بڑے Scientists بھی نہ اس میں کوئی اضافہ کر سکتے ہیں' نہ اس میں کمی کر سکتے ہیں' نہ اس ترتیب کو بدل سکتے' ہیں کہ قرآن کریم نے جو کہا تھا کہ انفس و آفاق میں جوں جوں ہماری نشانیاں بے نقاب ہوتی چلی جائیں گی' یہ حقیقت واضح ہوتی جائے گی: عین الحق واقعی قرآن کریم جو ہے' حقیقت پر مبنی ہے۔ دورِ اول کے ہمارے ہاں کے مفسرین وغیرہ جو تھے' ٹھیک ہے اپنے دور کے علم کے مطابق' انہوں نے کچھ لکھا' یہ باتیں اس زمانے میں ابھی بے نقاب نہیں ہوئی تھیں۔ اس لیے انہیں اس کے لیے مطعون نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے یہ کیوں نہ لکھا۔ بات ساری ہماری ہے کہ ہم نے ان کے کہے ہوئے کو حرفِ آخر مان لیا ورنہ ہم بھی انفس و آفاق کی نشانیوں کے ساتھ چلتے تو آج اس مقام پہ پہنچ جاتے۔ یورپ کے سائنسدانوں میں سے' جن کے سامنے قرآن کریم کے کچھ حقائق آئے ہیں وہ پھر انسان کے انکشافات کے ساتھ ان کو منطبق کرتے ہیں تو وہ خدا کی حمد و ستائش میں ہمہ تن یک

رنگ بن جاتے ہیں کہ یہ واقعی وہ خبیر اور علیم ہی ہوسکتا تھا جو چودہ سو سال پیشتر یہ باتیں کہے۔ یہ تین الفاظ بھی' میں نے عرض کیا ہے کہ وہی ان کو Appreciate کر سکتے تھے۔ مذہب کی دنیا میں جس میں ہم بھی شامل ہیں' یعنی ہمارا مذہب اسلام بھی' ہم تو اس کو مذہب کی سطح پہ لے آئے ہوئے ہیں' دین تو نہیں رہا۔ قرآن حکیم نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہوا ہے' تو مذہب کی دنیا میں یہ جو تخلیقِ کائنات یا انسان کی تخلیق ہے' اس کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ یہ اس کی بحث چلی ہوئی ہے یورپ کے عیسائیوں میں بھی' پادریوں میں۔ اسے Creation کہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہر چیز پہلے دن سے جیسی آج ہے ویسی ہی بنا کر خدا نے رکھ دی اسی شکل میں۔ باقی چیزوں کو تو چھوڑ دیجیے انسان کے متعلق بھی یہ چیز آئی کہ وہ پہلا انسان' بابا آدم' وہ مٹی کا ایک پتلا خدا نے انسان بنا دیا جیسا آج ہے اسی طرح سے' بس اس فرق کے ساتھ کہ آج کے انسان کی بیوی کے لیے اس کی پسلی چیرنی نہیں پڑتی' اس میں یہ کرنا پڑا' لیکن پہلے ہی دن ایک انسان مٹی کا پتلا اسی شکل میں' جیسے ہے' یہ خدا نے بنا کر رکھ دیا کیونکہ انجیل تورات میں یہی کہا گیا ہے اس لیے ان کے ہاں یہ پادریوں میں بڑی بحث چلی اور سائنسدانوں کے گروہ بڑی مخالفت کرتے رہے کیونکہ سائنس نے اس کے بعد تحقیق یہ کی ہے کہ یہ سلسلہ یوں نہیں کہ ہر شے اسی شکل میں' جس میں وہ آج موجود ہے' پہلے ہی دن خدا نے اسی طرح اس کو بنا دیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ یہ نہیں ہے۔ سلسلہ ارتقاء یہ ہے کہ ابتداء کچھ اور شکل تھی' پھر ارتقاء کی منزلوں میں طے کرتے ہوئے' وہ چیز آگے بڑھتی گئی۔ اس میں کیا ہوتا گیا؟ پہلی وہ شکل جو تھی' جسے Crude Form کہتے ہیں۔ ایویں اکھڑ، کچا، بھونڈا۔ اس قسم کا پہلے بنایا پھر وہ ارتقا کی منازل میں سے گزرتا تو اس میں سے جتنی چیزیں زائد تھیں کہ آگے ارتقا میں یہ چیز اس شکل میں کام نہیں آئے گی اسے لطیف کر دیا' اسے نفیس کر دیا اور جو اس کے اندر تھی اس کے اندر پہلی منزل کے لیے جو ضروری تھی' اگلی کے لیے ضروری نہیں تھی' ان کو الگ کر دیا اور یہ الگ کرتا چلا آیا تا آنکہ آخر میں اس نے وہ شکل اختیار کر لی جو آج ہمارے سامنے ہے۔ تو تین Stages آ گئیں۔ یہ جو میں مثال دیا کرتا ہوں کہ چاک سے کمہار' وہ مٹی کا اتنا سا' معاف رکھیے گا' پھر وہ پنجابی میں ہی کہنا پڑتا ہے' تھوبہ کیندے نیں اونوں' او آ جیہڑا چک کے ایوں کر کے رکھ دیندا اے' (جسے مٹی کا تھوبہ ہیں جو کمہار کے چاک کے اوپر رکھ دیا جاتا ہے) یہ بالکل صحیح چیز ہے' تخلیق کی ابتداء اس طرح سے کی ہے۔ پھر وہ چاک کو گھماتا ہے ارتقا کی منازل کے لیے وہ پھر کیا کرتا؟ وہ اتنا بڑا جو تھوبہ تھا' اس میں سے زائد مٹی کو الگ کرتا چلا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں والے جواب یہ نئی نسل کے بچے ہیں' انہوں نے تو نہ کمہار دیکھا' نہ اس کا چاک دیکھا ہوگا' بہر حال ہم لوگوں کو تو پتہ ہے۔ وہ ہوتا یہ تھا کہ اس میں سے وہ زائد مٹی کو الگ کرتا چلا جاتا تھا اور کچھ ہاتھ سے جو باقی مٹی بچتی تھی' اس میں کچھ ہاتھ سے کرتا چلا جاتا تھا' تا آنکہ اگر اس میں آبخورہ بنانا ہے تو آبخورہ بن جاتا تھا' صراحی بنانی ہے تو صراحی بن جاتی تھی۔ وہ پہلا تھوبہ یہ شکل اختیار کر لیتا تھا۔ تو تین ہی وہ Stages تھیں۔ پہلی شکل کے اندر جس میں کچھ بننے کی صلاحیت تھی' اسے

Potentialities کہتے ہیں' وہ جو بن جانے کی صلاحیتیں ہیں لیکن وہ ابھی بنی ہوئی نہیں ہوتیں' اتنی زائد ہوتی ہیں۔ ٹی وی میں بھی دیکھا ہوگا ہم نے پڑھا بھی ہے کہ یہ جو Museum ہیں' ہمارے ہاں لندن میں پیرس وغیرہ میں' اس میں جو کروڑوں سال پہلے کے یہ بڑے بڑے جانوروں کے ڈھانچے رکھے ہوئے ہیں' وہ آپ حیران ہونگے کہ آج جس کو یہ چھپکلی کہا جاتا ہے' اس کی وہ جو ابتدائی تخلیقی شکل تھی اس میں کم ازکم ساٹھ ساٹھ فٹ لمبے ڈھانچے موجود ہیں۔

## کائنات کو ارتقائی منازل سے ہم کنار کرنے والی ہستی الخالق الباری

ان کے اور ٹی وی میں کہیں نظر آتا ہے تو یہ بڑے بھدے سے' بھاری سے' بوجھل سے' وہ خود چلنا ان کے لیے کتنا دشوار ہوتا ہے۔ ان کی کچھ شکلیں ابھی تھوڑی سی سمٹی ہوئی' جیسے مگرمچھ وغیرہ کی شکلیں ہوتی ہیں' دریائی گھوڑے وغیرہ کی شکلیں ہیں' بڑے بھدے ہوتے ہیں۔ نظر آتا ہے کہ ان میں کچھ بہت زیادہ چیزیں خواہ مخواہ بوجھ ہی کے لیے ہیں' سبک نہیں ہوئے' نازک نہیں ہوئے' اور پھر ارتقاء کی منزل آگے بڑھتی چلی گئی' تو وہ اور سبک اور نازک ہوتے چلے گئے۔ انسان اسی طرح سے ان تخلیقی منازل میں سے گزرتا ہوا آخر میں آیا تو تین Stages کیا تھیں ارتقاء کی۔

ابتدائی سٹیج جس کے اندر وہ ایک ان گھڑ سا' تو دہ سا' ابتدائی شکل کے اندر کوئی تخلیق کی چیز جو تھی اس میں رکھا۔ اسے ارتقاء میں سے گزارا۔ یہ تو ہے الخالق اور پھر گزارتے ہوئے جتنی چیزیں اس کے اندر زائد تھیں' اگلی منزل میں جانے کے لیے ضرورت نہیں تھی' وہ جتنی زائد چیزیں تھیں' ان کو الگ کیا۔ الگ کرنے والے کو باری کہتے ہیں باری یہ ہے : اَلْخَالِقُ الْبَارِئُ (59:24) . کیا بتاؤں عزیزانِ من! اس پروگرام سے گزرنے کے بعد اس المصور نے وہ Form شکل عطا کی' کہ جو شکل اس کے پروگرام میں تھی کہ اسے ایسا بننا ہے. هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ (59:24). سارا سلسلہ ارتقاء یہی ہے۔ باقی اس کی Details ہیں' ایک ایک چیز کی تفصیلات ہیں' لیکن ہے یہی چیز' تینوں ہی اس کی Stages کے لیے ہیں۔ یہی تینوں Stages ہیں' اسی کا نام Evolution Theory ہے۔ یہی سلسلہ ارتقاء ہے' یہی تخلیق کا پروگرام ہے. اَلْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ (59:24). دیکھ رہے ہیں صفاتِ خداوندی کیا آ رہی ہیں! اب اوپر سے صفات چلی آ رہی ہیں کہ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ o هُوَ اللّٰهُ الَّذِىْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ o الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ(59:23-25). کہا کہ یہ تو ہم نے چند ایک صفات گنائی ہیں .

## خدا تعالیٰ کی ہر ہر صفت کو الحسنیٰ سے تعبیر کیا ہے جو انگنت پہلوؤں پر محیط ہے

لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (59:24). اس کی بہت سی صفات ہیں' ان گنت صفات ہیں۔ ہمارے ہاں پھر صفاتِ خداوندی کو

سمٰا کے ننانوے نام ہیں۔آپ نے دیکھا ہوگا کہ یہ چارٹ بنے ہوئے ہوتے ہیں یہ ننانوے گنائے ہیں لیکن وہ صفات تو لامنتہٰی ہیں۔اس نے تو کہا ہے کہ سارے سمندر اگر روشنائی بن جائیں اور درخت قلمیں بن جائیں، جب بھی وہ انتہا تک نہ پہنچیں، یہ لامنتہٰی ہے۔بہرحال کہا کہ یہ جو چند صفات ہیں، تمہارے سامنے آئیں.

کہا ہے کہ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (59:24) اتنے ہی اسمآء نہیں ہیں۔اس کے بہت سی صفات ہیں۔اس کے ساتھ ہمیشہ الحسنٰی آیا ہے، جسے یہ کہا ہے کہ یہ سب اس کے اچھے نام ہیں۔یہ اچھے نام کی بات نہیں ہے۔حسنٰی ہیں اور حسن نام ہوتا ہے توازن کا، جسے انگریزی میں Balanced کہتے ہیں۔اصل چیز یہی توازن ہے، جو صفات کے اندر ہے۔

## صفاتِ خداوندی کا تناسب قرآنی حکمت یا قرآنی معاشرے کے لیے بنیاد مہیا کرتی ہیں

عزیزانِ من! ایک طرف تو وہ الرحمٰن الرحیم کہہ رہا ہے۔دوسری طرف وہ کہہ رہا ہے: الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ (59:23). تو یہ تو بظاہر متضاد سی چیزیں ہیں۔رافت اور رحمت، کہاں جبر وتکبر۔وہ بھی ہیں، یہ بھی ہیں۔یہ تو بظاہر متضاد ہیں۔کہتا ہے کہ یہ متضاد اس صورت میں ہوتی ہیں کہ جب انہیں اپنی جگہ الگ رکھا جائے۔اگر ان میں توازن پیدا کر دیا جائے کہ جہاں ضرورت ہے رحمت کی، وہاں رحمت اور اتنی ہی رحمت ہو جتنی ضرورت ہے، جہاں ضرورت ہے جبر اور قوت کی، وہاں اتنی قوت ہو۔یہ دونوں چیزیں اپنی اپنی جگہ توازن میں رکھی جائیں۔اگر ان کا توازن نہ بگڑنے پائے تو پھر یہ صفاتِ خداوندی ہونگی۔اگر صرف رحمت ہو، جس کو رحم (Mercy) کہتے ہیں، رحم ہی رحم ہو، تو وہ عیسائیت ہوتی ہے۔اس کے وہ معنی وہاں تک چلے گئے کہ انسان کی بخشش کا انحصار خدا کی رحمت یا Grace پر ہے، عمل پر نہیں ہے۔تو انہوں نے عمل نکال ہی دیا۔یہودی جبروت کے اوپر آئے تو انہوں نے کہا کہ صاحب! جو کچھ ہوگیا ہے، اس میں سے باز آفرینی کی، اصلاح کی، توبہ کی، گنجائش ہی نہیں ہے۔اس میں انہوں نے مکافاتِ عمل کو اس حد تک متشدد رکھا کہ ایک دفعہ ذرا لغزشِ پا ہوگئی تو ہمیشہ کے لیے وہ گیا۔یہاں عمل کا سوال ہی نہیں ہے، وہاں رحم کی گنجائش ہی نہیں ہے۔یہ دونوں متضاد چیزیں ہیں۔ان میں حسن نہیں پایا جاتا، ان میں توازن نہیں پایا جاتا۔

یہاں یہ صفات آئی ہیں کہ یہ ٹھیک ہے مکافاتِ عمل اپنی جگہ ہے، ہر عمل اپنا نتیجہ پیدا کرتا ہے، لیکن اگر کسی وقت لغزش ہو جاتی ہے تو اس میں باز آفرینی، اصلاح، توبہ کی گنجائش رکھ دی جاتی ہے۔یہ خدا کی رحمت ہے۔دونوں کو اپنی اپنی جگہ توازن کے ساتھ رکھا جائے، تو اسمآء الحسنٰی بن جاتے ہیں۔حسن نام ہی توازن کا ہے۔تو کہا کہ اس کی بہت سی صفات ہیں لیکن یاد رکھو! اب یہ اس کے ساتھ یہ کچھ کہنے کی ضرورت کیا تھی۔یہی جو صفاتِ خداوندی ہیں، وہ علی حدِ بشریت مومن کی ذات کے اندر منعکس ہونی چاہئیں، اسے بھی رحیم ہونا چاہیے، اسے رحمٰن ہونا چاہیے، اسے رازق ہونا چاہیے، اسے خبیر ہونا چاہیے، اسے علیم ہونا چاہیے، اسے جابر بھی ہونا چاہیے،

لیکن حسن کارانہ اندازِ توازن برقرار رکھتے ہوئے جبر ہڈی کو جوڑنے کے لیے ہونا چاہیے' ہڈی کو توڑنے کے لیے نہیں ہونا چاہیے۔ اگر وہ رحیمیت ہے تو یہ نہیں ہے کہ فتنہ اور فساد اور کمزوروں پہ' غریبوں پہ' عافیت تنگ کرنے والا جو ہے' اس کے ساتھ آپ نرمی سے برتاؤ کرتے چلے جائیں' وہ سر پہ چڑھتا چلا جائے۔ وہاں کچھ جبر کرنے کی بھی اتنی ہی ضرورت ہوگی جتنی کہ فتنہ ختم کرنے کے لیے ہوگی۔ اس سے زائد نہیں۔

یہ جو چیز ہے کہ ایک مرض پیدا ہوتا ہے' لاحق ہوتا ہے' اس کی دوائی بھی خدا نے پیدا کر رکھی ہوتی ہے۔ یہ ہم تو صرف انکشاف کرتے ہیں اس کا۔ یہ کوئی بھی جو Medicine ہے' وہ انسان خود اس کی ایجاد نہیں کرتا۔ جو چیزیں موجود ہیں' عناصر کائنات کے اندر' ان کے خواص کا علم حاصل کرتا ہے' انکشاف کرتا ہے' پھر اس میں سے جسے تخلیق کہتے ہیں' مختلف عناصر کو اکٹھا کر کے' ایک نئی چیز بنانا ہے۔ یہ عملِ تخلیق کرتا ہے۔ انسان تو یہ جو چیزیں ہیں' یہ حسنٰی کے اندر آئیں گی۔ کہا ہے کہ **لَـهُ الْاَسْـمَـآءُ الْـحُسْـنٰـى** (59:24). انسانی ذات' انسانی معاشرہ' جو خدا کی صفات پر مبنی ہوگا' اس میں یہ صفاتِ خداوندی منعکس ہونگی۔ ایک توازن لیے ہوئے ہوں گی تو متوازن صفاتِ خداوندی علی حدِ بشریت کا حامل مردِ مومن کہلائے گا' یہی جماعتِ مومنین ہوگی' یہی معاشرہ اسلامی ہوگا' یہی نظام اسلامی ہوگا یہی حکومت اسلامی ہوگی۔ **لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى**(59:24) یہ صفات اس لیے بیان کی گئی ہیں۔

عزیزانِ من! یہ نہیں ہے کہ خدا تعالیٰ کے ان ننانوے نام کا ورد کیا جائے اور تسبیح پھیری جائے اس سے تسبیح کے لیے کیا کہ انہوں نے کہا دیکھیے! آگے تو ہے کہ **يُسَبِّحُ لَـهُ مَـا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** (59:24) . ہم نے کہا کہ وہ تو کہہ رہا ہے کہ کائنات کی ہر شے تسبیح پھیر رہی ہے' تے تہانوں کی لوڑ ہے کہ تسی تسبیح بیہ کے کرواوتے کرنے پئے نیں لے اسی نا کرئے (تمہیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ تم بیٹھ کر تسبیح پھیرو۔ ہم جو کر رہے ہیں)۔ کہا کہ **يُسَبِّحُ لَـهُ مَـا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** (59:24) ان صفاتِ خداوندی کو عملی پروگرام میں لانے کے لیے کائنات کی ہر شے سر توڑ کوشش کر رہی ہے' سرگرمِ عمل ہے' سرگرداں ہے۔ یہ ہے **يُسَبِّحُ لَهٗ**(59:24). کیا بات ہے اس لہ کی! یہاں ل نافع ہے' یہاں اس کو مفید بنانے کے لیے' اس کو منفعت بنانے کے لیے' اس کی صفات کو منفعت بنانے کے لیے' حسنٰی کرنے کے لیے' کائنات کی ہر شے سرگرمِ عمل رہتی ہے۔ تم بھی ایسا ہی کرو۔ اب دو اور صفتیں آ گئیں۔ وہ ہیں **وَهُـوَ الْـعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ** (59:24). غلبہ ہے' تسلط ہے لیکن حکمت کے ساتھ ہے' Wisdom ہے لیکن Rationality ہے' جبر نہیں ہے' عزیزانِ من! یہ سورۃ الحشر کی آخری آیت آ گئی۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ**(2:127)

❀......❀......❀

# سورة الممتحنة

# پہلا باب: سورة الممتحنة ( آیات 1 تا 6)

بسم الله الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! اب اگلی [1] سورة شروع ہوتی ہے۔ یہ 28 ویں پارے کی 60 ویں سورة ہے۔

## ابتدا میں مدینے کی اسلامی حکومت کے معاشرتی حالات اور دوقومی نظریئے کی نشاندہی

مدینے کے معاشرے میں آ کر ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ ابھی مخلوط معاشرہ تھا۔ اسلامی یا قرآنی یا خدا کی حکومت آہستہ آہستہ متشکل ہو رہی تھی۔ آخری شکل میں ابھی نہیں آئی تھی۔ یہاں کی آبادی بھی ایسی تھی جس میں اکثریت تو ان یہودیوں کی تھی جو اپنی باطنی منافقت کی وجہ سے دنیا میں مشہور تھے۔ انہوں نے بہت کام کیا۔ ان کی دیکھا دیکھی، وہاں کے کچھ قبائل بھی ایسے تھے جو ان کے ساتھ مل گئے تھے، کچھ ایسے بھی تھے جو ابتداءً دیکھا دیکھی مسلمان ہو گئے۔ بہرحال یہ ایک مخلوط سا معاشرہ تھا، آہستہ آہستہ الباری کا جو عمل تھا، وہ ہوتا رہا، اس میں سے یہ چھٹتے گئے، الگ ہوتے گئے تا آنکہ وہ وقت آ گیا جہاں پھر اعلان کرنا پڑا کہ دونوں گروہ، جماعتِ مومنین اور یہ دوسرے گروہ، بالکل الگ الگ ہو جائیں۔ اب یہ مخلوط نہ رہیں۔ یہودیوں کو تو مدینے سے نکال ہی دینا پڑا تھا، باقی قبائل

---

[1] یہ درس سابقہ درس کے تسلسل میں ہی ارزاں فرمایا گیا تھا۔

کے متعلق بھی جو ان میں سے خلوص کے ساتھ آ ملے' وہ ٹھیک ہے ورنہ وہ اپنے اپنے قبائل میں چلے گئے۔ ویسے نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ میں بھی پورے عرب کے اندر' جن کو آپ نے اپنے عہد ناموں کی رو سے اجازت دی تھی' ان کے علاوہ کوئی بھی دشمن باقی نہیں رہا تھا لیکن یہ وہ وقت آ گیا کہ جہاں یہ سمجھ لیجیے جو فتح مکہ کی وہ سورۃ التوبہ یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ اعلان کر دیا گیا کہ اب معاہدوں کے علاوہ کوئی صورت ایسی نہیں ہے کہ یہ جو مخالفین ہیں' وہ مومنین کی جماعت کے اندر رہیں' انہیں الگ کر دیا۔ یہ سورۃ الممتحنہ اسی اعلان کا دوسرا نام ہے:

ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا' جو تجھ سے نا آشنا رہیں ❶

دوقومی نظریئے کے متعلق یہ سب کچھ بحثیں ہوا کرتی ہیں' قرآن کریم تو سارا مبنی ہی دوقومی نظریئے کے اوپر ہے جس میں حضرتِ نوحؑ اور ان کا بیٹا بھی ایک قوم کے فرد نہیں ہوتے' جس میں حضرت ابراہیمؑ اور ان کا باپ بھی ایک قوم کے فرد نہیں ہو سکتے' جس میں محمد رسول اللہؐ اور حضورؐ کے چچا بھی ایک قوم کے فرد نہیں ہو سکتے۔ قوم کا تو معیار ہی اشتراک ایمان تھا' جو اس میں شامل نہیں' وہ ہم میں سے نہیں ہے اور یہی چیز ہے جس کو اب اس مقام پہ آ کر نظامِ خداوندی میں داخل کیا گیا اور واضح طور پر کہہ دیا گیا کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِیَآءَ (60:1) یہ لوگ تمہارے طبعی طور پر' سیاسی طور پر' یونہی دشمن ہیں لیکن جسے دین کے اعتبار سے کہا ہے کہ ہمارے بھی دشمن ہیں۔ خدا کا دشمن تو بہر حال ہوا کرے' اس کا کیا بگڑتا ہے۔ اس سے تو خدا کے دشمن کے معنی ہیں: خدا کے نظام کے دشمن' اس کے دین کے دشمن۔ کہا کہ یہ جو لوگ ہیں ان کو تم اپنا دوست دارمت بناؤ۔ قرآنِ کریم میں اس موضوع کی بے شمار آیات ہیں کہ ان کو ہمراز نہیں بنایا جا سکتا' مملکت میں شریکِ کار نہیں کیا جا سکتا' عدل کیا جائے گا' ان کے ساتھ حسنِ سلوک کیا جائے گا' تمام حقوق انسانیہ دیئے جائیں گے' ان کی مرضی آزادی کی ضمانت دی جائے گی حتی کہ ان کی پرستش گاہوں کی حفاظت مسلمانوں کی فوجیں کریں گی لیکن انہیں اپنی قوم کا فرد نہیں بنایا جا سکے گا' مملکت کی رازداریوں میں انہیں شریک نہیں کیا جا سکے گا۔ یہی تھی' عزیزانِ من! بنیادی طور پہ وہ دوقومی نظریہ کی بنیاد جس کے اوپر مطالبہ پاکستان مبنی ہوا تھا۔ بہر حال چھوڑیئے قصہ ہے جگر شگاف' کیا بار بار اس کا ذکر کریں' ہم کون سے ایمان کے اشتراک کی بناء پر ایک الگ قوم بن چکے ہیں جو یہ بات کریں کہ وہ کیوں قوم نہیں بنے۔ کہا کہ ان کو جو دین کے دشمن ہیں' اور تمہارے دشمن ہیں' ان کو اپنا دوست مت بناؤ۔ تُلْقُوْنَ اِلَیْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ (60:1) یہ جو آپس میں اتنی رشتے داریاں تھیں مگر یہ تمہارا دین جو تمہیں دیا گیا ہے وہ اس سے انکار کرتے ہیں۔

---

❶ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ کا یہ مکمل شعر یوں ہے:

یہ زائرانِ حریم مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا رہے ہیں (بانگِ درا)

## دوقوی نظریئے کی بنیاد اور اس کی اہمیت

عزیزانِ من! ابھی میں نے عرض کیا کہ حضورؐ کے حقیقی ❶ چچا مخالفین میں سے تھے۔ اس زمانے تک تو ابھی حضورؐ کے خود داماد ابوالعاص ❷ بھی مخالفین کی صف میں تھے' رشتے دار بھی مخالفین کی صف میں تھے۔ تو ان کے ساتھ وہ رشتے داریاں تھیں اور ان کی پھر قبائلی زندگی تھی' چھوٹے چھوٹے قبیلے تھے' انہی کے ساتھ رشتہ داریاں' انہی کے ساتھ دوست داریاں تھیں' دوست بھی وہی' تعلق والے بھی وہی تھے تو ان کے ساتھ ان تعلقات کا رہنا بہرحال ضروری تھا اور اس سے پہلے یہ ایمان کے اشتراک کی بات آئی نہیں تھی کہ نظریہ یا ایمان یا آئیڈیالوجی کی Basis (بنیاد) پر بھی الگ کوئی قبیلہ یا کوئی قوم بن سکتی ہے اس لیے یہ کہنا پڑا کہ ٹھیک ہے' تمہاری ان کے ساتھ رشتہ داریاں ہیں' اس کی وجہ سے یہ تعلقات کی بات ہے۔ تعلقات کی بات اور ہے' دوست داری اور راز داری کی باتیں اور ہیں' تم ان میں سے ایسا نہ کرو' تم دیکھو تو سہی کہ ان کا کیا قصور ہے۔ کہا کہ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ (60:1) یہ تمہارا دین' جو تمہیں دیا گیا ہے' وہ اس سے انکار کرتے ہیں' اس سے سرکشی برتتے ہیں۔ ایک وہ کفر ہے جس بنا پر یہ دو الگ الگ احزاب یا گروہ یا لشکر بنتے ہیں۔ قرآن کریم نے دو ہی پارٹیاں دنیا میں کہی ہیں' یا حزب اللہ ہے یا حزب الشیطٰن ہے تو کہا کہ یہ اس کے منکر ہیں اور پھر عملاً یہ کیفیت ہے کہ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ (60:1) انہوں نے رسول کو اور تمہیں اپنے گھروں سے نکال دیا۔ تمہارا جرم کیا تھا؟ وہ جرم یہ تھا کہ تم کہتے تھے کہ ہم اپنا رب خدا کو مان رہے ہیں۔

## فرعون کی فرعونیت کا دارومدار رزق کے سرچشموں پر ذاتی کنٹرول پر تھا

تم کسی انسان کو اپنے رزق کا داتا نہیں مان رہے۔ یہ بھی چیز ہے۔ قرآن کریم اس پہ بار بار زور دیتا ہے یہ جو محکومیت ہے' وہ دوسرا درجہ ہے۔ پہلے محتاج بنایا جاتا ہے' پھر محکوم بنتا ہے۔ وہ تو عام محاوروں میں ہے کہ مینوں کی لوڑ ہیگی اے؟ اسی کسے دا دتا کھانے آں (مجھے کسی کی ضرورت ہے' ہم کسی کا دیا ہوا نہیں کھاتے) یہ سب سے بڑی فرعونیت ہے۔ فرعونیوں کے پاس رزق ہوتا ہے۔ کہا کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (79:24) تمہارے رزق کے سرچشمے میرے قابو میں ہیں اور یہ کیا تو اس کے بعد پھر ہر قسم کی غلامی منوائی۔ کہا کہ یہ صرف یہ رزق کا ڈر ہے۔ کہا کہ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ (60:1) قرآن حکیم کا ایک ایک لفظ اپنی جگہ ہمالیہ پہاڑ ہے۔ تم یہ کہتے تھے کہ نہیں' جو رزق ہے' وہ صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔ یہ سارے معبودانِ باطل ختم ہو گئے اس میں تمہارا جرم یہ تھا۔ اس جرم

---

❶ عباس بن عبدالمطلب آپ کے حقیقی چچا تھے۔

❷ ابوالعاص' آپ ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کے شوہر تھے۔ آپ ﷺ کے یہ داماد جنگِ بدر میں قیدی ہے۔ رہائی کے لیے حضرت خدیجہؓ کا وہ ہار آیا تھا۔ جو آپ ﷺ نے حضرت خدیجہؓ کو دیا تھا۔ بعد میں ابوالعاص مسلمان ہو گئے تھے۔

کی پاداش میں انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے بھی نکال دیا' کہا کہ اِنۡ كُنۡتُمۡ خَرَجۡتُمۡ جِهَادًا فِىۡ سَبِيۡلِىۡ وَابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِىۡ (60:1) اب اس کے بعد خدا کے راستے میں جہاد ہے۔ اس کی منشاء کو پورا کرنے کے لیے یہ باتیں آ چکی ہوئی ہیں۔

## حقائق سے ہٹ کر ظاہر داری کے تعلقات کبھی نتیجہ خیز نہیں ہوتے' اب محبت کے تعلقات نہ رہے

کہا ہے کہ تُسِرُّوۡنَ اِلَيۡهِمۡ بِالۡمَوَدَّةِ (60:1) تم اپنی رشتہ داری کے تعلقات کی بناء پر ان کے ساتھ دوست داری کے جذبات دلوں میں رکھتے ہو۔ وَاَنَا اَعۡلَمُ بِمَاۤ اَخۡفَيۡتُمۡ وَمَاۤ اَعۡلَنۡتُمۡ (60:1) ہم جانتے ہیں کہ کوئی اپنے دل میں کیا چھپا کر رکھتا ہے' کس چیز کا اظہار کرتا ہے یعنی اب یہاں دلوں کے اندر سے ان تعلقات کو ختم کرنا ہے۔ وہ ظاہر داری میں تو آسانی سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ اب دلوں کے ان تعلقات کو ختم کرنا ہے' اسی آیت میں آگے چل کر ابھی آتا ہے کہ کن کن کے ساتھ تعلقات کو پھر ختم کرنا ہے اور وہاں نظر آئے گا کہ اس کا تعلق جذبات سے کتنا گہرا ہے۔ کہا کہ وَمَنۡ يَّفۡعَلۡهُ مِنۡكُمۡ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيۡلِ (60:1) جو یہ ایسا کرے گا کہ ان کے ساتھ خیال داری کے تعلقات' محبت کے تعلقات' جذباتی تعلقات' باقی رکھے گا پھر وہ خدا کے سیدھے راستے پہ نہیں چلا جائے گا' خدا کی سیدھی راہ سے بھٹک جائے گا۔ کہا کہ اِنۡ يَّثۡقَفُوۡكُمۡ يَكُوۡنُوۡا لَكُمۡ اَعۡدَآءً وَّيَبۡسُطُوۡۤا اِلَيۡكُمۡ اَيۡدِيَهُمۡ وَاَلۡسِنَتَهُمۡ بِالسُّوۡٓءِ وَوَدُّوۡا لَوۡ تَكۡفُرُوۡنَ (60:2) اگر ان کا بس چلے' تم پہ قابو پالیں تو تم دیکھو گے کہ کس طرح سے' وہ تم پر کتنی زیادتی کرتے ہیں' تمہاری ہڈیاں توڑ دیتے ہیں۔ زبان سے بھی' ہاتھوں سے بھی۔ وہ تمہاری تخریب پہ اتریں گے اور وہ چاہتے ہیں کہ تم پھر انہی جیسے بن جاؤ۔ اسلام کو چھوڑ کر اس دین کو چھوڑ کر' انہی کے مسلک پر آ جاؤ۔ یہ ہے ان کی عداوت کی بنیادی وجہ۔ کہا کہ لَنۡ تَنۡفَعَكُمۡ اَرۡحَامُكُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُكُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ (60:3) یہ دنیاداری اور رشتہ داریاں کے تعلقات' دین کے معاملے میں' مکافاتِ عمل کے معاملے میں' جسے قیامت کہا گیا ہے' کوئی فائدہ نہیں دے سکیں گے۔

اس بات میں آگے چلنا ہے۔ اس وقت میں یہ عرض کرونگا کہ يَفۡصِلُ بَيۡنَكُمۡ (60:3) اس دن تو بہر حال چھٹ کر الگ ہو جائیں گے۔ یہ تعلقات اور یہ رشتے داریاں جو یہاں آج ہیں۔ بہر حال وہ جسے قرآن حکیم نے یوم قیامت کہا ہے' اس دنیا کے اندر' اس نظام کے ہاتھوں' جو معاشرہ متشکل ہوگا' اس میں یہ جو نسبتیں ہیں' یا نسبتوں کی بناء پر جو تعلقات ہیں' وہ ختم ہو جائیں گے۔ وہاں صرف ہم آہنگی اور یک رنگی کی بناء پہ تعلقات باقی رہیں گے۔ کہا کہ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ (60:3) وہ جانتا ہے کہ تم کیا کرتے ہو۔ اب آئی قرآنِ کریم میں وہ بات انہوں نے حضرتِ ابراہیمؑ کا اسوہ پیش کیا۔ جس میں یہ الگ الگ قومیتیں یا تعلقات کا منقطع ہونا ہے۔

## دین خونی رشتہ کی بنیاد کو اولیت دینے کی بجائے نظریات کو اہمیت دیتا ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ حضرتِ نوحؑ' جن کا ذکر پہلے نبی کی حیثیت سے قرآن کریم میں آتا ہے' وہ وہاں سے شروع ہو گیا تھا

جب ان کے بیٹے کے متعلق بھی کہا گیا کہ نوحؑ یہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے تو وہ تو بیٹا الگ ہو گیا تھا' بیویاں الگ ہو گئی تھیں باپ الگ ہوئے لیکن حضرتِ ابراہیمؑ کی زندگی' ان کی داستانِ حیات' قرآن کریم نے بڑی تفصیل سے اس لیے بیان کی ہے کہ وہ ایک دور ایسا نظر آتا ہے جس میں اس دور میں خدائی نظام کا پروگرام بہت ہی متمیز شکل کے اندر' ان کے ہاتھوں سے قائم ہوا تھا' ان کی زندگی کے بہت سے گوشے قرآن کریم نے اپنے ہاں محفوظ کیے ہیں اور ہمارے لیے تاکید کی ہے کہ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيٓ إِبْرٰهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ (60:4) ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کی زندگی میں تمہارے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔ یہ ذرا آگے چل کے بھی اسوۃ آتا ہے تو میں وہاں عرض کرونگا کہ اسوۃ کے معنی کیا ہوتے ہیں۔

## قرآن حکیم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نبی اکرمؐ کی زندگی کو نوع انسانی کے لیے اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے

قرآن حکیم میں دو ہی ہستیاں ہیں جن کے متعلق یہ چیز متعین طور پہ کہی ہے کہ ان کی زندگی' ان کی روش' تمہارے لیے اپنے اندر اسوہ حسنہ رکھتی ہے اور وہ ہیں حضرتِ ابراہیمؑ اور نبی اکرمؐ۔ ذرا سی تفصیل کے بعد پھر میں عرض کرونگا۔ بات آسانی سے سمجھ میں آجائے گی کہ ان کی زندگی میں تمہارے لیے اسوہ حسنہ ہے۔ وہ کونسی بات ہے جو یہاں ابھار کر' نکھار کر بیان کی ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ ویسے تو ساری زندگی ہی حضرتِ ابراہیمؑ اور نبی اکرمؐ کی ایک اسوہ حسنہ ہے لیکن بعض مقامات ایسے ہوتے ہیں جن کی Importance (اہمیت) باقیوں کے مقابلے میں بڑی زیادہ ہوتی ہے' اسے نمایاں طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ یہاں کیا چیز نمایاں طور پہ بیان کی؟ کہا کہ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ (60:4) جب انہوں نے صرف باپ کو نہیں' بیٹے کو نہیں' بھائی کو نہیں' بہن کو نہیں' ساری قوم کو للکار کر کہہ دیا کہ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (60:4) ہم الگ ہوتے ہیں' ہم بری الذمہ ہیں' تم سے اور تمہارے معبودوں سے الگ ہوتے ہیں۔ پوری کی پوری قوم سے یہ کہہ دیا۔ آج یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ اس زمانے میں کہ زندگی ہی قوم' رہنے کے ساتھ قبیلے کے ساتھ رہنے میں تھی۔ وہاں سے الگ ہوا تو ہر قسم کے خطرات مول لے لیے۔

## حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور میں پروہت کا مقام

یہ حضرتِ ابراہیمؑ ایک چھوٹی سی جماعت تھی۔ اس کی کیفیت یہ تھی۔ آپؑ نے گھر میں اس تبلیغ کی ابتداء کی' باپ اس زمانے کا سب سے بڑا پروہت یا Priest Chief تھا اور وہ Priest (پروہت) یا ملاّ یہ مسجدوں کے مندروں کے پروہت نہیں ہوتے تھے۔ مملکت میں سب سے بڑا جو منصب ہوتا تھا وہ پروہت کا ہوتا تھا حتیٰ کہ بادشاہ تخت پہ نہیں بیٹھ سکتا تھا تاوقتیکہ پروہت اس کے ماتھے پر تلک نہ لگا دے۔ یہ تھا ان کا مقام۔ فرعون کے ساتھ' ہامان کے لشکروں کا ذکر آتا ہے۔ حضرتِ ابراہیمؑ نے سب سے پہلے گھر میں باپ کو یہ کہا کہ یہ کیا روش ہے تمہاری کہ ایک پتھر کو گھڑ کر خود تم ایک شکل پیدا کر دیتے ہو' اسے اپنا خدا بنا لیتے ہو' اس کے

سامنے جھک جاتے ہو۔ کہا کہ اتنی سی بات بھی تمہاری سمجھ میں نہیں تو آخر میں یہ چیز آتی ہے' یہ میں ابھی عرض کرونگا جو آتی ہے کہ قوم سے اعلان کر دیا' بادشاہ کے ساتھ مقابلہ ہوا' مناظرہ ہوا' بادشاہ کے سامنے اعلان کر دیا' پوری قوم کے سامنے اعلان کر دیا۔ آپ وطن چھوڑ کر' تمام آلائش کو قطع تعلق کر کے' الگ ہو گئے' ہجرت کر لی۔ یہ تھا اسوہ حسنہ ابراہیمؑ کا۔ کہا کہ **كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا** (60:4) تم میں اور ہم میں انقطاع ہو گیا' قطع تعلق ہو گیا' ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کوئی رشتہ باقی نہیں رہا اور ہمیشہ کے بعد کہا کہ **حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ** (60:4) ایک بات تم پھر ہماری طرح خدا کے اوپر ایمان لے آؤ تو تم پھر اپنوں میں سے ہو جاؤ گے' اس وقت تک نہیں ہو سکتے' اس میں ایک استثنٰی کی بات آتی ہے اور اسی لیے میں' میں رکتا گیا تھا کہ میں وہاں جا کر یہ بات عرض کرونگا۔ کہا کہ **اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ** (60:4). یہاں یہ بات تمہارے ذہن میں آئے گی کہ ابراہیمؑ نے اپنے باپ سے کہا تھا۔ اس کے لیے لفظ استغفار ہی اب استعمال کرونگا کہ میں تمہارے لیے استغفار کرتا رہونگا۔ کہا کہ جب تعلقات منقطع ہو گئے' پھر ابراہیمؑ نے یہ بات باپ سے کیوں کہی؟ یہ تو تعلقات کی بڑی گہرائی ہے۔ تو یہ بات جو دل میں اٹھتی تھی' یہ شبہ جو پیدا ہونا تھا' قرآن مجید ہے' خدائے علیم کی کتاب ہے' اسی جگہ کہہ دیا کہ ہم نے جو کہا ہے کہ ابراہیمؑ نے اپنی پوری قوم سے جس میں باپ بھی شامل تھا' رشتے دار بھی شامل تھے' یہ اعلان کر دیا تو یہ بات کہ اس نے ان سے زیادہ کیا تھا باپ سے استغفار کا یہی لفظ میں استعمال کرونگا تو یہ پھر کیوں تھا؟ ہمارے ہاں تو مغفرت اور استغفار کے معنی ہیں ''بخشش مانگنا'' ذہنوں کے اندر مسلمہ معنی بخشش کے ہیں اور یہ بخشش کا تصور ہے جس نے دین کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ یہ دین ہے' مکافاتِ عمل ہے' انسان کے اپنے اعمال کے نتائج ہیں۔ بخش دینے کے معنی ہوتے ہیں کہ یہ کتنے ہی زیادہ گناہ ہوں' یہ کتنے ہی زیادہ جرائم ہوں' ان کے متعلق ہے کہ جا بخش دتا تینوں بخشش بلکہ بخشیش کر دی۔

بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش

بہشتے فی سبیل اللہ ہم ست ❶

(اقبالؒ: ارمغان حجاز)

---

❶ ہندوستان کے مسلمان سے جو نہ پاکانِ حرم ❷ (کعبہ سے نسبت رکھنے والے پاک لوگوں) میں سے ہے اور نہ ارباب ہمت (ارباب ہمم) میں سے ہے' کہہ دو کہ وہ بھی خوش ہو جائے۔ ایک بہشت وہ بھی ہے جو اللہ کی مہربانی سے مل جائے گی۔ مفت مل جائے گی۔

❷ یہ اس سے پہلے شعر کی طرف اشارہ ہے۔ کہا ہے کہ

بہشتے بہر پاکان حرم ہست — بہشتے بہر ارباب ہمم اسب

(بہشت حرم (کعبہ) سے نسبت رکھنے والے پاک لوگوں کے لیے ہے۔ بہشت ہمت والے لوگوں کے لیے ہے)۔

ان سے کہا کہ ٹھیک ہے مزے لوٹو' اللہ واسطے بھی جنت بخش دی جاتی ہے۔ مغفرت کے معنی استغفار ہوئے' پھر اس کیلئے تسبیحاں پڑھی جاتی ہیں: استغفر اللہ من کل ذنب۔ وہ صبح کے وقت اٹھ کر استغفار سحر' کسی کے لیے مغفرت۔ استغفار کے معنی بخشش کہ یا اللہ! اس کو بخش دے۔

## قرآنی لفظ استغفر اللہ کا حقیقی مفہوم بخشش نہیں بلکہ مغفرت یا حفاظت کے ہیں

عزیزانِ من! بنیادی طور پر قرآن مجید میں بخش دینے کا تصور ہی نہیں ہے۔ یہ پھر استغفار کیا ہے؟ یہ متعدد بار آ چکا ہے' ہر بار آئے گا تو مجھے دہرانا پڑے گا اس لیے کہ یہ چیزیں ہمارے تحت الشعور میں رچ چکی ہوئی ہیں۔ گوٴیا کی محبت ہمارے خون کے ذرات میں حلول کر چکی ہوئی ہے۔ اس کو نکالنا ضروری ہے۔ قرآن کریم کی روشنی میں یہ بخشش کا تصور نہیں ہے۔ مغفرت کے معنی ہوتے ہیں ''انسان سے کوئی لغزش ہو جائے' اس لغزش کا نقصان خدا کے قانون کی رو سے ہونا ہے' سوال یہ ہے کہ یہ جو لغزش ہو گئی بس پھر یہ ہو گئی' اس میں بازیابی کا امکان نہیں ہے' اس میں اصلاح نہیں ہو سکتی اس سے جو نقصان پہنچتا ہے' اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ کہا کہ ہو سکتی ہے۔ اس نقصان سے جو اس لغزش کی وجہ سے ہونا ہے' اس سے حفاظت کا رکھنا جو ہے اس کے معنی ہیں' مغفرت چاہنا'' مغفرت کے معنی ''حفاظت'' ہیں بخشش نہیں ہیں۔ مغفر اس خول کی لوہے کی Helmet کو کہتے تھے جن کو اوپر پہن لیتے تھے تا کہ تلواروں اور تیروں کے وار سے حفاظت ہو سکے۔ وہ خول پہننے سے یہ بخشا نہیں جاتا تھا' یہ محفوظ ہوتا تھا' یہ جو غلط قدم اٹھانے سے' جسے آپ جرم کہیے' گناہ کہیے' اس سے جو نقصان ہونا ہے' تو میں نے کہا تھا کہ یہ خدا کا نظام ہے کہ اس سے باز آفرینی یا اس کی اصلاح کی گنجائش رکھ دی گئی ہے۔ استغفار یہ ہے کہ ہر وقت ذہن میں یہ رکھنا کہ اگر مجھ سے کوئی لغزش ہو جائے تو اس کے نقصان سے' میں حفاظت کا سامان طلب کرتا ہوں۔ حفاظت کا سامان کیا ہے؟ قرآن مجید نے خود بتا دیا کہ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡهِبۡنَ السَّیِّاٰتِ (11/114) یاد رکھو! اگر کہیں کوئی لغزش ہو گئی ہے تو اس کے نتیجے کے ازالے کے لیے یہ ہے کہ تم اس سے کہیں زیادہ اچھے کام کرو۔ بینک میں بیلنس تمہارے کریڈٹ میں اگر کم ہو رہا ہے اور چیک تم نے Issue کیا ہے زیادہ کا' تو اس کیلئے تلافی کی کیا صورت ہے؟ کہ وہاں جا کر کچھ اور جمع کرو' یہ منیجر سے جا کر کہو کہ صاحب! میں یہ کریڈٹ کر رہا ہوں۔ یہ حسنات ہیں جو سیات کی تلافی کر سکتے ہیں اور وہ قرآن مجید کی جو میزان کی مثال ہے' وہ تو بالکل ترازو کی طرح بات سامنے لے آتی ہے کہ یاد رکھو! نیکیوں کے اور برائیوں کے پلڑے ہیں۔ یوں کہہ لیجیے نا اگر برائی کا پلڑا کسی وقت جھک گیا ہے تو اس کے نقصان سے حفاظت کا طریقہ یہ ہے کہ بھلائی والے پلڑے میں اور ڈالو۔ یہی طریقہ ہے یا کیا دنیا میں کوئی اور بھی ہے طریقہ کہ کیسے یہ پلڑا اٹھے گا' برابر ہو گا یا اس پلڑے سے زیادہ وزن دار ہو گا جھکے گا اگر یہ پلڑا' پھر میں دہرا دوں شاید کہیں غلط فہمی نہ ہو جائے: اچھائیوں کا پلڑا اٹھ گیا' برائیوں کا

پلڑا جھک گیا' گویا یہ زیادہ ہوگئیں تو اب اس نقصان سے بچنے کا اس کے لیے طریقہ کیا ہے؟

## حق گوئی کے سلسلہ میں حضرت ابراہیمؑ کی بردباری اور بلند ظرفی کا اظہار

بھلائیوں کے پلڑے میں بھلائیاں اور ڈالو' پھر وزن بڑھ جائے گا۔ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ (99:7) کا وزن جو ہے' اتنا اتنا وزن اس میں ہم دیکھتے رہتے ہیں' ہم ایٹم تک کا حساب کر دیں گے' ڈالتے جاؤ یہ پلڑا جھک گیا۔ پلڑا جھک گیا تو تمہاری مغفرت ہوگئی۔ استغفار' اس پلڑے میں زیادہ سے زیادہ بھلائیاں اور نیکیاں ڈالنے کا نام ہے۔ ابراہیمؑ نے باپ سے کہا تھا۔ یہ بڑی عمدہ چیز ہے۔ یہ (19:45-46-47) ہو رہا ہے۔ باپ کے ساتھ سمجھا رہے ہیں' وہ ڈانٹ رہا ہے' معاملہ آخر تک پہنچ گیا۔ باپ نے کہا کہ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ (19:46) ابراہیمؑ تو چاہتا کیا ہے کہ میں اپنے معبودوں کو تمہاری خاطر چھوڑ دوں کہا کہ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَ اهْجُرْنِیْ مَلِیًّا (19:46) تو اگر باز نہ آیا' تو یاد رکھو! تمہیں دھتکار کے نکال دوں گا۔ دفع ہو جا میری آنکھوں سے۔ یہ ہے اس کا ترجمہ: دور ہو جا میری آنکھوں کے سامنے سے۔ روز یہی چیز ہے' روز یہی چیز ہے' حضرت ابراہیمؑ کی ایک یہ بھی صفت تھی کہ ان کو غصہ نہیں آتا تھا۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ قَالَ سَلٰمٌ عَلَیْكَ (19:47) کہا کہ ٹھیک ہے' یہ غلط ذہنیت کی بات ہے جو تم کر رہے ہو' غصہ بھی اس لیے آرہا ہے کہ تمہارے پاس دلیل نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں۔ اللہ تمہیں سلامت رکھے' محفوظ رکھے' آگے ہے کہ ٹھیک ہے تُو تو مجھے کہتا ہے کہ نکل جا' دفع ہو جا' میرا کوئی تعلق نہیں سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّیْ (19:47) میں پھر بھی کوشش کرتا رہونگا کہ تم صحیح راستے کے اوپر آجاؤ اور اس طرح سے اپنی غلط روش کے نقصان سے بچ جاؤ۔ دیکھا استغفار ابراہیمؑ کا!

## استغفار کی عملی تفسیر حضرت ابراہیمؑ کا اسوۂ حسنہ

نبی اکرمؐ کا جو اسوہ ہے اس میں بھی' میں جب اس معاملے کے اوپر آؤنگا تو دیکھو گے کہ وہ کیا کرتے ہیں یعنی قرآنِ کریم میں کہا یہ ہے کہ چھوڑ دو ان کو' اب ان میں اس کا امکان ہی نہیں رہا کہ یہ راہِ راست پہ آجائیں یعنی حضورؐ کے مقام کے متعلق ہے کہ چھوڑ دو ان کو مگر اس الگ ہونے کے باوجود کہا ہے کہ قرآن حمید ان تک پہنچاتے چلے جاؤ کہ ان میں سے کوئی اس لیے تباہ نہ ہو جائے کہ قرآن حمید ان تک پہنچا نہیں تھا۔ نبی کا پیغام ان کی سعی و کاوش استغفار اور ان کی مغفرت کا جذبہ ان کے دل میں ہوتا ہے اور اس کے لیے یہ ہے کہ بات ان تک پہنچاتے چلے جاؤ' ہوسکتا ہے کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی راہِ راست پہ آجائے۔ یہ تو ابراہیمؑ نے باپ سے کہا اور اس Contrast (تقابل) کو دیکھیے وہ یہ کہہ رہا ہے کہ نکل جا یہاں سے' دفع ہو جا میری آنکھوں سے' دور ہو جا۔ یہ سخت ترین الفاظ ہیں جو قرآن دیکھیے میں آئے ہیں' لیکن بیٹا ہے کہ ایک تو ان کے جواب میں کہتا ہے کہ سَلٰمٌ عَلَیْكَ (19:47) اللہ تمہیں سلامت رکھے اور پھر یہ کہ اس کے باوجود کہ تمہاری موجودہ روش تو یہ ہے' ابھی میں ناامید نہیں ہوں میں کوشش کرتا رہونگا کہ تم صحیح

راستے پہ آ جاؤ' اور ان نقصانات سے بچ جاؤ جو موجودہ روش کی وجہ سے ہونے والے ہیں۔ آپ نے استغفارِ ابراہیمؑ دیکھا! یہ ہے 19 سورۃ کی 47ویں آیت اور سورۃ التوبہ میں پھر آخری بات آ گئی' پوری کوشش کر دیکھی' باپ راہِ راست پہ نہیں آیا۔ کہا کہ وَ مَا کَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِیْمَ لِاَبِیْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّ عَدَهَآ اِیَّاهُ (9:114) وہ جو تھا ابراہیمؑ کی یہ کوشش' باپ کو اس سے بچانے کی' وہ اس کے لیے تھی کہ اس نے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہارے لیے کوشش کرتا رہونگا۔ کہا کہ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ (9:114) لیکن جب آخر الامر یہ واضح ہو گیا' یہ بات ثابت ہو گئی' یہ بات متعین ہو گئی' کہ نہیں وہ خدا کا دشمن ہی رہے گا' تو خدا کا یہ نبی اپنے باپ سے الگ ہو گیا۔

## قرآن حکیم کے ہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسوۂ حسنہ کا ذکرِ خیر اور خدا کی طرف منہ موڑنے کا مفہوم اور دعائیہ کلمات

آپ نے دیکھا کہ اس دوران استغفار کے کیا معنی ہیں؟ یہ کہ حضرت ابراہیمؑ سے وہ کوشش' جو باپ کو راہِ راست پر لانے کے لیے کی جا رہی تھی' انتہا میں جب دیکھا کہ یہ بات نہیں مانی' تو پھر وہ اس سے الگ ہو گیا۔ اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِیْمٌ (9:114) بات یہ تھی کہ جب باپ نے اتنی سختی سے ڈانٹا تھا' جھڑکا تھا' الگ کر دیا تھا' اسی وقت کیوں نہ کہہ دیا کہ مجھے تمہاری کیا پرواہ پڑی ہے۔ ایسے ہو تو جاؤ' جہنم میں جاؤ' کہنے لگے کہ نہیں' 'ابراہیمؑ بڑا ہی رقیق القلب تھا' ہمدرد تھا' جاں سوز تھا' اتنی جلدی نہیں جھٹک کر رکھ دیا۔ اس نے اتنا لمبا عرصہ دیا لیکن جب یقین کے درجے پہ پہنچ گیا کہ باپ صحیح راستے پہ نہیں آ سکتا۔' یہ آئے جی ابراہیمؑ کی زندگی میں۔ کہا کہ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِیْمَ لِاَبِیْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَکَ وَمَآ اَمْلِکُ لَکَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ (60:4) یہ تھی بات جو تمہارے دل میں آئی کہ قطع تعلقات کرنا تھا تو ابراہیمؑ نے پھر یوں کہا تھا۔ باپ سے اس لیے کہا تھا دیکھا کہ قرآن کریم کس طرح سے سینے میں ابھرنے والے شکوک کا ازالہ کرتا چلا جاتا ہے ساتھ کے ساتھ۔ کہا کہ رَبَّنَا عَلَیْکَ تَوَکَّلْنَا وَاِلَیْکَ اَنَبْنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ (60:4) کتنی بڑی قوم کو چھوڑ دینا' اپنوں کو چھوڑ دینا' ماں باپ کو چھوڑ دینا' اولاد کو چھوڑ دینا' گھر بار کو چھوڑ دینا' کوئی چھوٹا مرحلہ نہیں ہے۔ عزیزانِ من! یہ چھوڑنے کے بعد بے سروسامان' بے یار و مددگار' وطن چھوڑ کر بھی چلے آ رہے ہیں۔ کہا کہ رَبَّنَا عَلَیْکَ تَوَکَّلْنَا (60:4) کوئی بات نہیں' ہمیں تیرے رزاقیت پر بھروسہ ہے' تیری ربوبیت پر ہمیں اعتماد ہے کہ تُو ہمیں اس طرح سے زائل نہیں کرے گا۔ اَنَبْنَا وَاِلَیْکَ (60:4) ہم ان سب سے منہ موڑ چکے ہیں' تیری طرف ہم نے اپنا رخ کر لیا ہے' سب سے منہ موڑ کر اس کی طرف رخ کر لینا۔ یہ ہے اسوہ ابراہیمؑ۔

یہ جواب رسم رہ گئی ہے ہمارے ہاں جسے نماز کی نیت کہتے ہیں' وہ وہی نیت ہے جو حضرتِ ابراہیمؑ کا اسوہ ہے' جس میں وہ اِنِّیْ

وَجَّهۡتُ وَجۡهِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ(6:80). اب تو یہ رسم رہ گئی ہے۔ یہ بہت بڑا اعلان ہے کہ ساری دنیا سے منہ موڑ کر، قطع علائق کر کے، اپنوں کو چھوڑ کے، باپ کو چھوڑ کے، منصب کو چھوڑ کے، ہر شخص کو چھوڑ کے، تمام املاک کو چھوڑ کے، ذرائع کو چھوڑ کے، وطن کو چھوڑ کے، چھوڑنے کے بعد سب کچھ چھوڑا تو کسی کی طرف رخ بھی کیا؟ کہا کہ اِنِّیۡ وَجَّهۡتُ وَجۡهِیَ لِلَّذِیۡ (6:80) ان سب کو چھوڑا تیری طرف رخ کیا میں نے، تو شرک کیا ہے؟ کہ اس کی طرف بھی رخ ہو اور پھر انسانوں کی طرف بھی رخ ہو۔ یہ شرک ہو گیا۔ کہا کہ وہیں اس نے کہا ہے کہ اِلَیۡکَ اَنَبۡنَا وَاِلَیۡکَ الۡمَصِیۡرُ(60:4) پناہ بھی تیری طرف ہم لیں گے، سب سے منہ موڑ کے آئیں گے بھی تیری ہی طرف.

کہا کہ رَبَّنَا لَا تَجۡعَلۡنَا فِتۡنَةً لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا (60:5) اے ہمارے پروردگار! یہ جو دشمن ہیں، ان کے لیے ہمیں، وہ ایک کندہ قصاب ہوتا ہے یا وہ فتنہ ہوتا ہے، یہ فوج والے جو نشانہ بازی کرتے ہیں، وہ سامنے وہ جو ریت کا، وہ جو کچھ بھی ہوتا ہے یا یہ چھوٹے پیانے کے اوپر اب جو یہ چھوٹے چھوٹے وہ Baloon سے لے کے، وہ بچے نشانہ کرتے ہیں، یہ جو تختہ ہوتا ہے، جس کے اوپر نشانے مارتے ہیں، یہ چھیدتے ہیں، اس کو تیروں سے تو اس کو فتنہ کہتے ہیں، کہ الٰہ العالمین! ہمیں ان مخالفین کا تختہ مشق نہ بنا دینا۔ ہمارے ہاں کندہ قصاب بھی کہتے ہیں۔ اس کو قصائی دی کھوڑی کیندے نیں پنجابی اچ اینوں (پنجابی میں اسے قصاب کی کھوڑی کہتے ہیں) کہا کہ ہمیں ان کا وہ نہ بنا دینا اور یہاں ہے وَاغۡفِرۡ لَنَا(60:5). یہاں ایک لفظ نے خود مفہوم واضح کر دیا مغفرت کا۔ کہا کہ ان مخالفین کا تختہ مشق نہ بنا دینا وَاغۡفِرۡ لَنَا (60:5) ہماری حفاظت کرنا رَبَّنَا (60:5) پھر وہی ربنا کہا۔ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ (60:5) ہم جانتے ہیں تُو غلبے والا بھی ہے لیکن تیرا غلبہ حکمت پر مبنی ہے۔

## قرآن حکیم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کو نوع انسانی کے لیے ماڈل قرار دیا ہے

اب یہاں وہ بات آئی۔ کہا کہ لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡهِمۡ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنۡ کَانَ یَرۡجُوا اللّٰهَ وَالۡیَوۡمَ الۡاٰخِرَ(60:6) یہ تھے حضرتِ ابراہیمؑ اور ان کے ساتھی جن کی زندگی میں تمہارے لیے اسوہ حسنہ ہے۔ یہ وہ روش ہے جس کا اتباع کرنا چاہیے، جس جیسا بننا چاہیے۔ یہ وہ ماڈل ہے جس کے مطابق اپنے آپ کو متشکل کرنا چاہیے عام معنی تو یہی ہیں لیکن اس کے اندر کچھ بنیادی معنی ہیں۔ یہ عربوں کی زبان بھی اور زبان کا انتخاب بھی عجیب چیز ہے۔ اتباع ایسے ہی نہیں وہ کرتے چلے گئے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں ''کسی کے دکھوں کا علاج کرنا، کسی کو پریشانی میں تسلی دینا، کسی کو اضطراب میں سکون عطا کرنا یعنی یہ وہ اتباع ہے، جس کا نتیجہ دکھوں کا علاج، پریشانیوں کا مداوا، اضطرابیوں کا سکون ہو'' وہ ہوتا ہے جسے اسوہ کہتے ہیں اور پھر یہ اسوہ ہے اس کے اوپر، آپ ماڈل کہیں گے مجھے یاد ہے میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ ماڈل کے معنی ایک نمونہ ہوتا ہے جیسا بن جانا مقصود ہو، اس جیسا بنانا اور تو کوئی معنی

سمجھ میں نہیں آتے' ڈرائنگ کی کلاسز کے اندر یہ فائن آرٹ کی کلاسز کے اندر' بھی پینٹنگ کا جو سکھاتے ہیں' وہ سامنے ایک ماڈل رکھ دیتے ہیں' بعض اوقات تو وہ کسی چیز کا ہی ماڈل ہوتا ہے' بعض اوقات تو ایک آدمی کا یا انسان کا ہوتا ہے' وہ سامنے بنا کے رکھ دیتے ہیں' اس کے مطابق کہا جاتا ہے کہ پینٹ کرو' ماڈل کے مطابق اپنے پینٹ کرو' تم اسی صورت میں پینٹ کر سکتے ہو کہ سامنے ماڈل ہو' ماڈل سامنے نہ رکھا جائے اور کہا جائے کہ ماڈل کے مطابق بن جاؤ یا ماڈل کے مطابق پینٹ کرو' تو وہ کہیں گے کہ ماڈل ہے کہاں' تو اللہ تعالیٰ نے جن ہستیوں کو کہا کہ تمہارے لیے ماڈل ہیں' خدا کا فریضہ تھا کہ وہ ماڈل سامنے رکھ کر دیتا ورنہ ہم پوچھتے کہ وہ کونسا نمونہ تھا جو آپ نے ہمارے لیے تجویز کیا تھا اور یہ تو تھا نہیں' عزیزانِ من! کہ ماڈل کی تعمیر تو خدا کرے اور یہ کہے ماڈل کی تلاش کرنی ہے تو تم وہ ایران کے جامعین ❶ روایات جو ہیں۔ وہاں سے کرو۔

## حضرت ابراہیم کی زندگی اور نبی اکرمؐ کی حیات طیبہ انسانی دنیا کے لیے تا قیامت ایک محسوس پیکر ہے

ان جامعین روایات کے ہاں سے کرو۔ وہ کہتا ہے کہ ماڈل کے مطابق بنو۔ اس کا فریضہ ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کا ماڈل سامنے رکھے اور یہاں حضرتِ ابراہیمؑ کو ماڈل کہا تو آپ نے دیکھا کہ کس طرح سے تفصیل بیان کی ہے۔ تو کیا تھی ان کی زندگی؟ یہ ہے جو ماڈل تم نے بننا ہے۔ حضورِ نبی اکرمؐ کی حیاتِ گرامی قرآن کریم کے اندر ایسے رکھ دی ہے کہ اس کو اکٹھا کیا جائے' تو ماڈل بن جاتا ہے' صاحب! حضورؐ کا' جس نے ماڈل کی تاکید کی تھی اس نے وہیں ماڈل کے اجزاء بھی دیئے تھے۔ قرآن کریم کی رو سے حضور ﷺ کی پوری سیرت مرتب ہوتی ہے۔ بات بڑی ہے اور منہ چھوٹا ہے' میں نے جب نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہؐ معراجِ انسانیت لکھی ہے اس کا انداز ہی یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات اوپر رکھی ہیں' ان کے نیچے پھر تاریخ میں اور احادیث میں' اس کے مطابق جو واقعات آتے ہیں' ان کو میں نے مرتب کیا ہے۔ پوری معراجِ انسانیت' سیرت کی کتاب' آخر تک پڑھیے پورا حضورؐ کی ذاتِ مبارک کا ماڈل تمام قرآنِ کریم کے آئینے کے اندر سامنے آجاتا ہے۔ اسے یونہی نہیں اسوہ کہہ دیا اور وہی سیرت حضورؐ کی صحیح ماڈل ہو سکتی ہے جس کی تائید قرآن کرے۔

## علامہ پرویزؒ کی طرف سے 'معراج انسانیت' کے نام پر لکھی گئی کتاب جو سیرت حضورؐ پر مبنی ہے

عزیزانِ من! تفاصیل اور چیز ہیں جزئیات اور چیز ہیں لیکن وہ قرآن حکیم کے اصول کے مطابق ہونی چاہئیں۔ روایات اور احادیث کے پرکھنے کا معیار ہی یہ ہے کہ جو بھی ان میں سے قرآن حکیم کے اصول کے مطابق ہے' اسے ہم صحیح مان لیتے ہیں' جو اس

---

❶ یہ اشارہ ہے جامعین روایات کا جو سب ایران سے تھے۔

کے خلاف ہے' اسے ہم اسی وقت مسترد کر دیں گے' تو ضرورت ہی نہیں پرکھنے کی کہ راوی کون کون سے ہیں' اسماالرجال کیسا آتا ہے' جامعین حدیث کس قسم کے تھے۔ اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ جو بات اس کے اندر آئی ہے' وہ اگر قرآن کریم کے خلاف ہے تو یہ رسول اللہؐ کی ہو نہیں سکی۔ یہ انکارِ حدیث' عزیزانِ من! رسول اللہ ﷺ کی کسی حدیث کا انکار نہیں ہے' انکار یہ ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی ہو نہیں سکتی کیونکہ یہ قرآن کریم کے خلاف ہے۔ یہ ہے انکار اور یہاں مطالبہ یہ ہے کہ مسلم اور بخاری کی کسی ایک حدیث کا انکار بھی تمہیں دائرہ اسلام سے خارج کر دے گا: ایک حدیث کا انکار بھی۔ اس کا بھی اگر انکار کرو گے کہ رسول اللہؐ پر کسی نے جادو کر دیا تھا اور رسولؐ بھول ہی جایا کرتے تھے کہ میں نے نماز پڑھی ہے یا نہیں پڑھی' یہ حدیث ہے' اس کا بھی انکار کرو گے تو دائرہ اسلام سے خارج ہو جاؤ گے۔ تو میں نے کہا تھا کہ اگر اس بناء پہ حضور ﷺ کی حرمت اور عظمت کو قائم رکھنے سے تم دائرہ اسلام سے خارج کرتے ہو' بیس دفعہ کر دو' میں اپنے رسول کے ناموس پہ حرف نہیں آنے دونگا۔ اس کا اسوہ خدا نے بیان کیا ہے۔ کہا ہے کہ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ (60:6) یہاں بھی ہے' رسول اللہؐ کے اسوہ کے ساتھ بھی یہی الفاظ آئے ہیں۔ ''اسوہ اس کے کام آئے گا جو خدا اور اس کے مکافاتِ عمل کے پروگرام کے اوپر یقین رکھے گا' تو پھر یہ اسوہ کام آئے گا' جو اس کو نہیں مانتا اس کو یہ نمونہ کیا کام دے گا۔'' کیا بات ہے! کہا کہ وَمَن يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ(60:6) اور وہ جو ان سے منہ موڑے گا تو اس کے بعد خدا کا کیا بگاڑے گا' خدا تمہارا احتیاج نہیں ہے کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے' اس قسم کے ماڈل تم بناؤ' وہ پینٹ کرنے والا اسٹوڈنٹ صحیح ماڈل بناتا ہے تو امتحان میں پاس ہو جاتا ہے اس میں ٹیچر کو کچھ نہیں ملتا۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ کی الممتحنۃ آیت چھ تک آ گئے' ساتویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ(2:127)

❀......❀......❀

# دوسرا باب: **سورة الممتحنة** ( آیات 6 مکرر تا اختتام )

**اعوذ بالله من الشیطٰن الرجیم . بسم الله الرحمن الرحیم**

عزیزانِ من! آج جولائی 1983ء کی یکم تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الممتحنۃ کی آیت 6 سے ہورہا ہے: ( 60:6)۔

## سیرتِ رسول کے سلسلہ میں جنگ احزاب کا ذکر

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے

یہ بندہ دوعالم سے خفا میرے لیے ہے

یہ مقام ہے جہاں کہا گیا کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ(60:6) .

ان کی زندگی میں، ہر اس شخص کے لیے، جو قانونِ مکافاتِ عمل اور حیاتِ آخرت پر یقین رکھتا ہے، ایک بہترین نمونہ ہے، ایک ماڈل ہے۔ میں نے پچھلی دفعہ بھی یہ عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم میں دو ہی ہستیاں ہیں جن کے متعلق خصوصیت سے یہ آیا ہے۔ ایک یہاں حضرتِ ابراہیمؑ کے لیے اور ایک سورۃ الاحزاب میں نبی اکرمؐ کے متعلق (33:21)۔ مقام یہاں بھی ایسا ہے جسے Crisis کہتے ہیں جو کسی کی زندگی میں آئے۔ تو وہاں بھی جنگِ الاحزاب میں، یہ تمام مخالف قوتوں نے متحدہ محاذ بنا کر حملہ کیا تھا۔ اسے جنگِ خندق بھی کہتے ہیں، احزاب بھی کہتے ہیں اور اس کے متعلق یہ ہے کہ بڑا ہی گھمسان کا رن پڑا تھا، بڑی شدت کی مخالفت تھی، جنگ اپنے بڑے زوروں تھی، سپاہیوں کے پاؤں پھسل رہے تھے، لغزش آ رہی تھی، ایسے مقام میں نبی اکرم ﷺ روشنی کے مینار کی طرح اپنے مقام پہ کھڑے تھے۔ اس استقامت اور ثبات قدمی کے پیشِ نظر خدا نے کہا تھا کہ تمہارے لیے رسول ایک بہترین نمونہ تھا، جو انداز اس کا تھا وہی تمہارا ہونا چاہیے تھا تو وہاں بھی کردار کی، کریکٹر کی، ثبات کی، استقامت کی، ایک خصوصیت بتائی گئی ہے۔ جیسے یہاں بھی ایک فیصلہ بتایا گیا ہے جس کے لیے بڑے ہی ایثار کی ضرورت تھی۔

## قرآن حکیم نے نبی اکرمؐ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سیرت کو بطور ماڈل قرار دیا ہے

اسوہ کے معنی یہ ہیں کہ سیرت، کردار اور طرزِ عمل میں جو خصوصیات ان حضرات میں تھیں، ان کا اتباع کیا جائے، نہ یہ کہ انہوں نے لباس کیسا پہنا تھا اور کھانا کیسا کھایا تھا۔ تو کہا کہ ان کی زندگی میں تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے اور عجیب بات ہے کہ قرآنِ کریم میں اگرچہ مختلف انبیائے کرامؑ کے احوال و کوائف دیئے ہیں لیکن جس تفصیل سے حضرت ابراہیمؑ کے اور دوسری طرف نبی اکرم ﷺ کی زندگی کے دیئے ہیں تو میں نے عرض کیا تھا کہ یہ محض ایک نظریہ ہی نہیں تھا، میں نے عملاً بھی یہ کر کے دکھایا ہے کہ قرآن حکیم کی آیات پر مبنی نبی اکرم ﷺ کی پوری سیرت مرتب کی ہے۔ وہ ہے، جسے آپ ان کا منصب کہتے ہیں اب۔ کہا ہے کہ یہ لوگ نبی اکرم ﷺ کی طرف آ گئے صدرِ اول کی جماعتِ مومنین کی طرف آ گئے اور کہا کہ یہ لوگ جو اتنی مخالفت اس وقت کر رہے ہیں .
**عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ وَّاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ**[1] (60:7). آپ دیکھیے ''عین اس وقت کہ جہاں ان کی مخالفت انتہائی شدت اختیار کر گئی تھی، وہاں وحی خداوندی ہی یہ کہہ سکتا تھا کہ تھوڑا سا عرصہ ٹھہریئے، یہ لوگ خود جھکیں گے، ایسے آئیں گے تمہارے ساتھ کہ بالکل تم میں اور ان میں موعدت پیدا ہو جائے گی'' اور فتح مکہ کے بعد کے

---

[1] تم جلدی نہ کرو۔ وہ ایسے حالات پیدا کر رہا ہے کہ جن لوگوں کے ساتھ اس وقت تمہاری دشمنی ہے، ان میں اور تم میں محبت اور یگانگت کے تعلقات پیدا ہو جائیں (یعنی وہ ایمان لے آئیں اور اس طرح تمہارے دینی بھائی بن جائیں)۔ یہ سب کچھ خدا کے مقرر کیے ہوئے اندازوں (قوانین) کے مطابق ہوتا ہے۔ انہی اندازوں کے مطابق تمہیں سامانِ حفاظت اور متاعِ نشو و نما ملتی ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 1304)۔

واقعات نے یہ بتا دیا کہ یہ تمام مخالفین، جتنے بھی تھے، وہ سارے اسلام لے آئے اور یہ صحابہؓ کی جماعت میں شامل ہوئے۔ تاریخ میں ہم ان کے کارناموں کو فخر سے پیش کر سکتے ہیں۔

## فتح مکہ کے بعد وسعت قلب کشادہ نگہی کے ساتھ آپؐ کا مخالفین کے ساتھ حسن سلوک

یہ ایسے وقت میں کہا گیا جب کہ نظر بظاہر ان حالات کے تابع اس کا امکان ہی نظر نہیں آتا تھا تو خدا نے یہ کہا کہ عنقریب یہ چیز ہوگی۔ اب جو یہ مخالفین تھے، ان میں بھی ایک گروہ تو وہ تھا جو عملاً اس طرح سے مخالفت پہ ابھرا ہوا تھا کہ وہ میدانِ جنگ تک میں آ گیا تھا۔ دوسرے لوگ وہ تھے کہ جنہوں نے مخالفت میں یہ انداز اختیار نہیں کیا تھا۔ یہ جو مخالفت میں اس شدت سے اترے ہوئے تھے، ان کے متعلق تو کہا کہ ان سے اس طرح قطع تعلق کر لینا چاہیے لیکن **لَا یَنۡہٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیۡنَ لَمۡ یُقَاتِلُوۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَ لَمۡ یُخۡرِجُوۡکُمۡ مِّنۡ دِیَارِکُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡہُمۡ وَ تُقۡسِطُوۡۤا اِلَیۡہِمۡ** ❶ (60:8)۔ اندازہ لگائیے مخالفین کے ساتھ قرآنِ کریم کی وسعتِ قلب اور کشادِ نگاہ کا۔ چونکہ یہ اس حد تک آگے نہیں بڑھے، اس لیے جنگ کرنے والوں اور نہ کرنے والوں، دونوں میں فرق کر دیا۔ کہا کہ یہ لوگ جنہوں نے تمہارے ساتھ جنگ نہیں کی، جنہوں نے تمہیں گھروں سے نہیں نکالا تھا، مخالفت تو ان سے وہ ہے لیکن ان کے ساتھ ایک چیز تو یہ انصاف کرنے کی بات ہے کہ ہر معاملے میں ان سے انصاف کرو۔ انصاف کے متعلق تو سورۃ المائدہ میں یہ چیز آ گئی ہے کہ **وَ لَا یَجۡرِمَنَّکُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعۡدِلُوۡا ؕ اِعۡدِلُوۡا** (5:8) کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پہ آمادہ نہ کر دے کہ تم ان کے ساتھ انصاف نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو۔ قوم دشمن ہے وہ دشمنی کر رہی ہے اور یہاں حکم یہ دیا جا رہا ہے کہ ان کے معاملات بھی اگر سامنے آئیں تو ان سے بھی عدل کرو۔ تو عدل تو یہاں بھی کہا کہ جنہوں نے تمہارے ساتھ جنگ نہیں کی، تمہیں گھروں سے نہیں نکالا، پہلی چیز تو یہ ہے کہ عدل کرو اور آگے بھی بڑھے ہیں۔ کہا کہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک بھی کرو۔ تمہیں خدا اس سے منع نہیں کرتا۔ مخالفین کے ساتھ عدل ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک بھی کرو۔ کہا کہ **اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ** (60:8) عدل کرنے والوں کو خدا پسند کرتا ہے۔

---

❶ (اتنا اور واضح کر دینا ضروری ہے کہ) خدا تمہیں اس بات سے ہرگز نہیں روکتا کہ جن لوگوں نے تمہارے ساتھ، دین کے معاملے میں، جنگ نہیں کی اور نہ ہی انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے، تم ان سے (محض اس بنا پر کہ وہ مسلمان نہیں ہوئے) کشادہ ظرفی کا سلوک کرو اور عدل و انصاف سے پیش آؤ (5:8)۔ عدل و انصاف تو ان دشمنوں تک سے بھی کیا جائے گا۔ جو تمہارے خلاف جنگ کرنے کے لیے نکل آئیں۔ اس لیے کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے (باقی رہے وہ جنہوں نے تمہارے خلاف جنگ نہیں کی، تو ان سے عدل و انصاف سے آگے بڑھ کر حسنِ سلوک سے بھی پیش آؤ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 1305)۔

## دشمن کے ساتھ تو ہمیشہ عدل کرنے کا حکم ہے جب کہ دوستی کرنے سے ہمیشہ روکا ہے

کہا ہے کہ **اِنَّمَا یَنۡھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیۡنَ قٰتَلُوۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَاَخۡرَجُوۡکُمۡ مِّنۡ دِیَارِکُمۡ وَظٰھَرُوۡا عَلٰۤی اِخۡرَاجِکُمۡ اَنۡ تَوَلَّوۡھُمۡ** (60:9) یہ جو پہلے حکم دیا تھا کہ ان کے ساتھ دوستداری کے تعلقات قائم نہ کرو۔ کہا کہ یہ ان کے متعلق کہا تھا جنہوں نے تمہارے ساتھ لڑائی کی۔ اب وہ جنگ کی بات کہی ہے۔ **فِی ال دِّیۡنِ** (60:9). دین کے معاملے میں ان کی تمہارے ساتھ جنگ ہوئی اس سے پہلے تو آپس میں قبائلی جنگیں ہمیشہ سے چلی آ رہی تھیں، وہ تو ہوا کرتی تھیں۔ بات تو اصل میں دین کے معاملے میں جنگ کی ہے یا تمہیں انہوں نے گھروں سے نہیں نکالا یا ایسا کرنے والوں کی مدد کی یا جن لوگوں نے تمہیں گھروں سے نکالا' بے گھر کیا' ان کی انہوں نے مدد کی۔ ان کے متعلق یہ کہا گیا کہ ان سے دوستداری کے' محبت اور یگانگت کے تعلقات' مت قائم کرو یعنی ان کے ساتھ بھی عدل کرو۔ عدل اور احسان ان کے ساتھ ہے جنہوں نے جنگ نہیں کی اور جنگ کرنے والوں' گھروں سے نکالنے والوں اور ان کی مدد کرنے والوں کے ساتھ بھی دوستداری کے تعلقات کو منع کیا ہے' انصاف کرنے کو منع نہیں کیا . **وَمَنۡ یَّتَوَلَّھُمۡ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوۡنَ** (60:9) جو اس کی خلاف ورزی کرے گا تو اس کا شمار بھی ظالمین میں سے ہو جائے گا اور وہ مجرم قرار پائیں گے۔

## نظریہ پاکستان کے برعکس آج ہم نے غیر مسلموں کی وطنی مملکت کے تصور کو اپنا رکھا ہے

یہ دیکھیے میں بار بار یہ کہتا ہوں کہ وہ جسے دو قومی نظریہ کہا جاتا تھا' تحریکِ پاکستان کے زمانے میں وہ نظریہ آیا۔ اب تو وہ ساری چیزیں خواب ہو گئی ہوئی ہیں۔ ان مبادیات سے' ان بنیادوں سے' ان اثاثات سے جن کے اوپر پاکستان کی تحریک اٹھی تھی' ان میں سے کچھ باقی نہیں رہا۔ وہ یہی تھا کہ ایک گروہ' ایک جزو' ایک جماعت' ایک قوم' وہ ہے جو ایمان کے اشتراک پر ایک قوم بنتی ہے۔ دوسری وہ ہے جو اس میں شامل نہیں ہوتی۔ قرآن حکیم صرف ان کو دو قوم میں شمار کرتا ہے' اور یہ تھا وہ دعویٰ کہ وہاں مسلمان' وہاں کے بسنے والے' ایمان کے اشتراک کی بنیاد پر ہندوؤں سے الگ قوم ہیں' تو اب ہم لوگوں نے وہ چیز چھوڑ دی اور ہوا یہ کہ وہ غیر مسلم بھی یہاں پاکستانی قوم میں شمار ہو گیا اب یہاں قوم پاکستانی ہے' وہی جغرافیائی حدود کے اندر بسنے والے ہیں' یہ وہی ہے جو سیکولرازم کا قومیت کا مدار ہے' وہی وطنی مملکت ہے' وہی جغرافیائی مملکت ہے' وہی قوم ہے' جسے وطنی قوم آپ کہتے ہیں' یہ وہاں یہی جنگ تھی' معرکہ دین و وطن جو ہو رہی تھی۔ علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے اپنی اس کشمکش کا عنوان معرکہ دین و وطن قائم کیا تھا جو مولانا حسین احمد مدنی کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس میں نقطہ مخاصمہ ہی یہ تھا کہ قومیت کا معیار کیا ہے. کہا کہ **وَمَنۡ یَّتَوَلَّھُمۡ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوۡنَ** (60:9). اندازہ لگایئے کہ قرآن کریم کیا کہہ رہا ہے؟ یہ کہ قرآن جو اس اصول سے روگردانی کرے گا تو اس کا شمار ظالمین میں سے ہوگا' جو ان لوگوں سے محبت اور یگانگت کے تعلقات پیدا کرے گا' آزادانہ تعلقات پیدا کرے گا' وہ مجرم قرار پائے گا۔

## مکہ سے مدینہ آنے والے مہاجرین کے مابین ازدواجی زندگی کے مسائل کا حل

کہا کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَکُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُھٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْھُنَّ اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِاِیْمَانِھِنَّ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْھُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْھُنَّ اِلَی الْکُفَّارِ (60:10). اب ایک اور کیٹگری آتی ہے۔ یہ مومنین ہجرت کر کے مدینے آ گئے۔ ان میں سے اکثر ایسے تھے کہ جن کے اہل و عیال مکے میں ہی رہ گئے تھے‘ پیچھے رہ گئے تھے‘ ان کی بیویاں اسلام لا چکی تھیں‘ ابھی ہجرت کر کے مدینے نہیں آئی تھیں۔ اس کے بعد جوں جوں کسی کو موقعہ ملتا گیا‘ وہ وہاں سے مدینے کی طرف خود ہی آتی چلی گئیں۔ کچھ وقت کے بعد ان کی خاصی تعداد ہو گئی۔ اب ان کا مسئلہ زیرِ غور آیا۔ ان کے ساتھ کیا کیا جائے؟ یہ ان کی بیویاں ہیں‘ قاعدے کی رو سے تو طلاق نہیں ہوئی۔ یعنی اپنی اصطلاح میں ہم گفتگو کر رہے ہیں۔ قرآن حکیم کا یہ حکم آ گیا کہ کوئی مسلمان عورت‘ کسی کافر سے شادی نہیں کر سکتی‘ کوئی کافر کسی مسلمان عورت سے شادی نہیں کر سکتا۔ تو یہ جتنی مسلمان عورتیں تھیں‘ وہ ان کفار کے نکاح میں یا ان کے عقد میں تو رہ نہیں سکتیں۔ وہ تو قرآن حکیم نے ان کو حرام قرار دیدیا تھا۔ تو اب یہ وہاں سے چلی آئیں۔ اس قاعدے کی رو سے تو یہ ان کی بیویاں نہیں رہیں۔ قرآن حکیم کے قاعدے کی رو سے کہا کہ انہیں ان کی طرف واپس نہ بھیجو۔ یہ اسلام کی بناء پہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر آ گئی ہیں۔ یہ مہاجر ہیں۔ یہ تو ان پہ ظلم ہو گا کہ اگر آپ یہاں سے انہیں وہیں بھیجیں جہاں سے یہ بیچاری کسی نہ کسی طرح سے چھوڑ کر آ گئی ہیں۔ مہاجرین میں ان کا شمار ہو رہا ہے اور مہاجرین کے تو جو مدارج قرآن حکیم نے بیان کیے ہیں ان میں یہ برابر کی حصہ دار ہیں‘ اس لیے ان کو واپس نہ بھیجو۔

## نکاح کے سلسلہ میں مکے کی مہاجر عورتوں کی ایک تیسری کیٹگری کا ذکر اور جانچ پرکھ

کہا کہ لَا ھُنَّ حِلٌّ لَّھُمْ وَلَا ھُمْ یَحِلُّوْنَ لَھُنَّ وَاٰتُوْھُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا (60:10) یہ جو قرآن کریم نے فیصلہ کیا تھا کہ مسلم عورت اور کافر مرد میں شادی نہیں ہو سکتی‘ اس حکم کی بناء پر ان میں نکاح کا تعلق قائم نہیں ہو سکتا‘ یہ ان کی بیویاں نہیں رہ سکتیں‘ نہ وہ ان کے خاوند رہ سکتے ہیں۔ اس لیے یہ مسئلہ تو طے ہو گیا۔ اب دیکھیے! قرآنِ کریم کا وہ جو کہا تھا کہ عدل کرو‘ قرآن کریم اس عدل میں کہاں تک جا رہا ہے۔ یہ ان کا سب کچھ چھوڑ کر وہاں مکہ سے آ گئی ہیں۔ انہوں نے کچھ مطالبہ بھی نہیں کیا۔ کہا کہ جب یہ آ گئی ہیں اور ہم نے ان سے کہلا دیا‘ ان کو اطلاع دیدی کہ یہ یہاں آ گئی ہیں اور یہ تمہاری بیویاں نہیں رہیں‘ کہا کہ انہوں نے ان کے نکاح کے اوپر جو کچھ خرچ کیا ہے‘ وہ ان کو واپس بھیج دو۔ دنیا میں کہیں اس چیز کی مثال نہیں مل سکتی۔

عزیزانِ من! ان کے ساتھ جنگ ہو رہی ہے‘ انہوں نے ان کو گھروں سے نکال دیا ہے‘ مسلسل اور پیہم کشمکش اور مخالفت ہے‘ ان کی مدد میں وہ کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے‘ وہاں سے اسلام اور ایمان کی بناء پر یہ عورتیں آئی ہیں۔ انہوں نے اس وطن کو‘

بچوں کو بھی، خاوندوں کو بھی، چھوڑا ہے۔ یہ مدینہ آ گئی ہیں۔ ان کی بیویاں نہیں رہی ہیں لیکن اس کے باوجود کہا یہ جا رہا ہے کہ انہوں نے ان کے اوپر جو کچھ خرچ کیا ہے وہ انہیں اس اطلاع کے ساتھ واپس دیجیے کہ یہ تمہاری بیویاں نہیں رہیں۔ یہ ہے قرآن حکیم کا معیار عدل۔ کہا ہے کہ **وَلاَ جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ** ❶(60:10). تو وہاں یہ ان کے ساتھ کرو۔ اس کے بعد تم ان سے نکاح کر سکتے ہو بشرطیکہ ان کے مہر یہاں نکاح کرنے کے وقت میں، جو مہر مقرر ہو، وہ ادا کرو تو ان کے ساتھ تم نکاح کر سکتے ہو۔ تو یہ ایک ایسی کیٹگری (شق) الگ آئی ہے کہ جن کے پہلے نکاح ان کے خاوندوں سے تھے، وہ تو مسلمان نہیں تھے، اس لیے اسلام کے طریقے پہ طلاق کا سوال پیدا نہیں ہوا، اس حیثیت سے کہ وہ ان کی بیویاں نہیں رہیں۔ یہ خاص طور پہ کہہ دیا گیا کہ ان کے ساتھ تم نکاح کر سکتے ہو مگر انہیں واپس بھیج دو جو انہوں نے خرچ کیا ہے اور ان کو الگ، ان کا جو مہر ہوتا ہے، اسلام کی رو سے، وہ ادا کرو۔

کہا کہ **وَلاَ تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَاسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا** (60:10). یہ وہاں اگر وہ عورتیں رہ گئی ہیں کہ جو اسلام نہیں لائی ہیں، ٹھیک ہے وہ تو ان کے نکاح کے اندر رہیں گی، تمہارے ہاں کی جو عورتیں اسلام نہیں لائیں ادھر کی، اگر وہ ادھر چلی جائیں کفر کی حالت میں بھی، تو پھر اس میں یہ ان سے کہا جائے گا کہ جیسا ہم نے تمہارے ساتھ سلوک کیا ہے کہ جو عورتیں ادھر آ گئی ہیں، ان پہ جو تم نے خرچ کیا ہے، ہم نے تمہیں دیا ہے، ان عورتوں کے متعلق بھی یہی کرو۔ اسے کہتے ہیں کہ یہی تمہاری طرف سے بھی سلوک ہونا چاہیے، تم ان کے لیے ادھر یہ چیز دیدو، تم ان سے یہ ڈیمانڈ کر سکتے ہو۔ یہ عدل کی سطح کے اوپر ہے، یہ اِدھر سے بھی اُدھر بھی مساوی تقاضا ہے. کہا کہ **ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ** (60:10). یہ خدا کا حکم ہے. **يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ**(60:10) . تمہارے معاملات کے متعلق اللہ اس طرح سے فیصلے دیتا ہے۔ اللہ علیم بھی ہے، حکیم بھی ہے۔

یہ علیم و حکیم کے متعلق ایک بات بڑی اہم تھی۔ پچھلی آیت میں یہ تھا کہ جب وہ مہاجر عورتیں آئیں، تو ان کا امتحان لے لیا کرو کہ وہ خلوص سے اسلام لے کر آئی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایسے معاملات میں تو اس قسم کی سازش کرنے والی عورتیں بھی ہوتی ہیں اور یہ تو آج پوچھو ہی نہیں کہ یہ کتنا عام ہو رہا ہے۔ اس زمانے میں اس کا امکان ہوگا جو کہا گیا کہ یہ ہوسکتا ہے۔ اس لیے ان کا امتحان لیا کرو۔ نقطہ جو میں پیش کرنے والا تھا وہ یہ تھا۔ وہ میں ابھی عرض کرتا ہوں۔ میں عرض یہ کر رہا تھا کہ کہا یہ ہے کہ یہ جو مہاجر عورتیں وہاں سے آئیں، تو ان کے متعلق مکمل معلومات حاصل کر لیا کرو، دیکھ بھال کر لو، اچھی طرح سے اپنا اطمینان کر لو کہ وہ خلوصِ دل سے اسلام لائی ہوئی ہیں، کسی سازش کے ماتحت نہیں آئیں۔ یہ بات کرو۔ میں یہ کہہ رہا تھا. **اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ** (60:10). خدا کو تو اس کا علم ہے، وہ جانتا ہے کہ وہ صحیح ایمان لے کر آئی ہیں، خدا تو جانتا ہے لیکن تم خود اپنا اطمینان کرو، ہم تمہیں نہیں بتائیں گے .

## خدا تعالیٰ کی ذات انسانی فرائض میں خود دخل انداز نہیں ہوتی

کہا کہ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ (60:10). اگر تم اپنے اس امتحان کے بعد' اپنی اس تفتیش کے بعد' اس نتیجے پہ پہنچو کہ یہ صحیح معنی میں مومن ہیں تو پھر ان کو مومن تسلیم کرو۔ یہ بات نہیں ہے کہ خدا جانتا ہے' اس بناء کے اوپر تم یہ کہو کہ تسلیم کرو۔ ہم یہ نہیں بتائیں گے۔ یہ بڑا اہم سوال ہے۔ جو ذمہ داریاں وہ انسان پہ عائد کرتا ہے' اس میں وہ خود دخل ہی نہیں دیتا۔ یہ بات نہیں ہے کہ تم یہ کہو کہ صاحب! خدا اس کے متعلق علم رکھتا ہے' وہ اگر یہ کہہ دے گا کہ یہ مومن عورتیں ہیں' ہم مومن تسلیم کریں گے۔ وہ اگر کہہ دے تو پھر تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا' وہ کہتا ہی نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ تمہاری ذمہ داری ہے' تم مجھ پہ کیوں ڈال رہے ہو۔ میں تو جانتا ہوں لیکن میں اپنے جاننے کے بعد تم سے یہ نہیں کہونگا کہ یہ یہ ہیں اور وہ وہ ہیں۔ تم خود تفتیش کرنے کے بعد اپنا اطمینان کرو' دیکھا ہے جو ذمہ داریاں انسان کے اوپر عائد ہوئی ہوتی ہیں' اس میں وہ دخل ہی نہیں دیتا۔ کہتا ہے کہ خدا اصلِ حقیقت کو جانتا ہے' وہ تمہیں نہیں بتائے گا' تم خود اپنا اطمینان کرو۔ یہ کتنی بڑی عجیب چیز ہے اور ہمارے ہاں کیا چیز چل پڑی' پھر آپ نے ایک چیز دیکھی ہوگی' ان کے ہاں آخر میں کتابوں میں لکھا ہوا ہوتا ہے: واللہ اعلم۔

## انسان کی ذہنی صلاحیتوں کی آبیاری اور نشو و نما کا تمام تر دار و مدار صرف غور و فکر پر مبنی ہے اور کیریکٹر کا بھی

بھئی! بہتر صحیح سچی جو بات ہے' پکی جو بات ہے' وہ تو خدا ہی جانتا ہے یعنی آپ سارا کچھ لکھ کر وہ بیان دے کر' اور آخر میں کہتے ہیں کہ خدا ہی جانتا ہے۔ یعنی یہ چیز ہے کہ انہیں اپنے اوپر یا Confidence نہیں' یا ذمہ داری نہیں لینا چاہتے۔ آخر میں کہتے ہیں کہ بھئی! ٹھیک بات جو ہے' وہ تو خدا ہی جانتا ہے۔ وہ اس کے اوپر ڈالی۔ یہ کہہ رہا ہے کہ مجھ پہ نہ ڈالو' خود امتحان کرو اور یہ واللہ اعلم (اللہ ہی جانتا ہے) ان کے ہاں ایسی عادت بن گئی ہے۔ آپ کہیں گے کہ پھر وہ لطیفہ آ جاتا ہے۔ ان سے پوچھا کہ آپ کا اسمِ گرامی؟ مولوی صاحب کہنے لگے: جی! چراغ دین۔ کہنے لگے: والد صاحب کا نام؟ کہنے لگے: فتح دین' واللہ اعلم! (اور بس اللہ ہی جانتا ہے)۔

عزیزانِ من! ان حقائق کا جاننے والا ایک عمر ابنِ خطابؓ تھا۔ ان کے سامنے کسی نے یہ کہا' ہنٹر لے لیا۔ کہنے لگے: یا کہو مجھے علم ہے یا کہو مجھے علم نہیں ہے' یہ کیا؟ بولے کہ درمیان میں بات کرتے ہو' کہتے ہو کہ خدا بہتر جانتا ہے۔ میں تم سے پوچھتا ہوں' تم بتاؤ بالکل صحیح اور اس کی سند؟ سند یہ خدا ہے۔ وہ عمر ابنِ خطابؓ سمجھے ہوئے تھے کہ قرآن حکیم کیا ہے اور خدا اور بندے کے تعلقات کیا ہیں۔ ذمہ داری لینا یہی تو ساری بات ہے۔ آدم اور ابلیس میں فرق ہی یہاں آ کر پڑا تھا۔ کہا کہ خود امتحان لو' خود ٹیسٹ کرو' خود تفتیش کرو' خود تحقیق کرو۔ یہ نہ کرو کہ خدا جانتا ہے۔ ہاں بات تو یہ تھی کہ یہ ادل بدل اس طرح سے کر سکتے ہو۔ اگر یہاں کی عورتیں وہاں

چلی جائیں تو ٹھیک ہے' ان کو روکو نہیں لیکن جیسا تم نے ان کی عورتوں کے متعلق یہ سلوک کیا ہے' ان سے بھی کہو کہ بھئی! ہمیں تم ان کا کچھ دیدو. کہا کہ وَاِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا (60:11) وہ ادھر سے جو کچھ پھر وصول ہو' جن کی عورتیں ادھر سے وہ گئی ہیں' وہ پھر ان کو دیدو. وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ (60:11). اور دیکھیے! خدا کے احکام کی احتیاط برتو اور تم مومن ہو تو یہ اتنے اتنے معاشرتی احکام جو ہیں' ان کے متعلق بھی قرآن کریم کتنی تاکید کرتا ہے۔ وہ تو چھوٹی سی چھوٹی بات جو کیریکٹر ہے تو اس چھوٹی چھوٹی باتوں کے مجموعے کا نام ہوتا ہے۔

## مکے سے مدینہ آنے والی عورتوں سے بیعت لینے کا حکم

عزیزانِ من! اب آئیں وہ عورتیں جو اسلام لا رہی ہیں. کہا کہ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ[1] (60:12). یہ بڑی آیت ہے۔ وہ عورتیں اگر ادھر سے آئیں اور اب یہ نظر آتا ہے کہ ایمان لانے کے لیے یہ کہا ہے کہ وہ یہاں ایک لفظ ہے کہ جو بیعت کرے۔ اب ہمارے ہاں تو بیعت ایک ہی چیز رہ گئی۔ بیعت تو ہوئی جو حضرت صاحب' پیر صاحب کی کی جاتی ہے اور بیع ہوئی جو عام تجارتی کاروبار کیا جاتا ہے' جو خرید و فروخت ہوتی ہے۔ یہ خدا کے ساتھ بیعت کا معاملہ تو ہے ہی نہیں حالانکہ آپ کو معلوم ہے' بتایا ہوا ہے کہ سورۃ التوبۃ کی آیت 111 ہے۔ کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (9:111). وہاں یہ کہا ہے کہ یہ جو معاملہ ہے کہ ایک شخص جب مسلمان ہوتا ہے تو وہ ایک عہد نامہ' ایک Contract' ایک اقرار نامہ' خدا کے ساتھ بیع و شرعا کا کرتا ہے' خرید و فروخت کا کرتا ہے۔ وہ اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ خدا اس میں خریدار ہوتا ہے' یہ بیچنے والا ہوتا ہے اور وہ اس کے بدلے میں اسے جنت دیدیتا ہے۔ یہ قیمت وہ مال جو اس نے دیا ہے اور وہاں یہ ہے کہ ان سے کہو کہ اپنے اس معاملہ بیع کے اوپر خوش ہوں کہ انہوں نے بہت بڑی تجارت کی ہے۔ بیعت یہ تھی اور اسی بیعت کی تجدید تھی

---

[1] اے نبی! جب مومن عورتیں ہجرت کر کے تمہارے پاس آئیں' تو تم (بہ حیثیت مرکزِ نظامِ خداوندی) ان سے اطاعت کا عہد لیا کرو اور وہ یہ کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گی (اطاعت صرف احکام خداوندی کی کریں گی)۔ چوری نہیں کریں گی۔ زنا کی مرتکب نہیں ہوں گی۔ اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی (81:8) اور کسی پر کوئی ایسا بہتان نہیں باندھیں گی' جسے انہوں نے جان بوجھ کر اپنے جی سے گھڑ لیا ہو۔ اور قانونی معاملات میں تیری نافرمانی نہیں کریں گی (یعنی تیری ذاتی رائے کی پابندی ان پر لازم نہیں ہوگی' بلکہ جو احکام' تیری طرف سے' بہ حیثیت مرکز نظامِ خداوندی نافذ ہوں گے' ان کی اطاعت لازمی ہوگی۔ تم ان امور کا ان سے عہد لے لیا کرو' اور پھر نظامِ خداوندی کی طرف سے ان کی حفاظت کا انتظام کرو۔ تمام افرادِ معاشرہ کی حفاظت اور نشوونما اُس کے ذمے ہے (پرویزؔ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 7-1306)۔

جو صلح حدیبیہ کے زمانے میں قرآن کریم میں یہ ہے کہ جب اس قدر نازک وقت آ گیا تھا کہ نظر یہ آ رہا تھا کہ یہاں سے اب کوئی مسلمان نبی اکرمؐ سمیت بچ کر جا نہیں سکتا۔ صرف حج یا عمرہ کی نیت سے آئے تھے، بغیر اسلحہ کے، بغیر ہتھیار کے۔ یہ فوج نہیں تھی، عام مسلمان آئے اور یہاں آ کر یہ دیکھا کہ قریش نے گھیرہ ڈال لیا۔ قریش کے گھر میں اتنے بڑے جری لشکروں کے جو مالک اسلحہ کے ساتھ تھے انہوں نے گھیر لیا ایسا وقت آ گیا تھا تو ایسے وقت کے اوپر نبی اکرمؐ سے کہا کہ بھئی! وہ جو خدا کے ساتھ معاملہ کیا ہوا ہے اب عملاً اسے پیش کرنے کا وقت آیا، آؤ! اس بیعت کی تجدید کرو۔ جانیں دینے کا وقت آ گیا۔ مال تو دیتے چلے آ رہے تھے یہ سارے دوران میں لیکن اس کا آخری وقت آ گیا کہ وہ تم نے جانیں بھی بیچی ہوئی ہیں۔ تو اب یہ نظر آیا کہ یہ جو بیچنا تھا یہ مال یا جان کا، یہ نظریہ عقیدت کی بات نہیں تھی کہ ہم نے بیچ دیا ہوا ہے، خدا کے ہاں، بیچ دیا ہے خدا کے ہاں، اور ساری عمر اپنے نام وہ رکھا ہوا ہے، پھر وہاں پہ اس کے بعد وراثت میں چلا جاتا ہے، خرید و فروخت ہو رہی ہے، گروی رکھا جاتا ہے، وہ خدا بیچ میں آتا ہی نہیں ہے جس کے ہاتھ انہوں نے شروع میں بیچ دیا تھا اور کہیں گے یہی کہ یہ تو صاحب! میرے پاس، کبھی تو کہتے ہیں امانت ہے، لیکن امانت اس قسم کی ہے کہ وہ امین ایسے ہیں کہ وہ امانت کبھی واپس ہی نہیں دی جاتی۔

## مہاجرین عورتوں کے لیے تجدید عہد کا حکم، بیعت کی وضاحت اور پھر اس پر عمل کی تاکید

یہ معاملے نظری نہیں تھے، یہ عقیدے کی بات نہیں تھی، یہ Factual (حقائق پہ مبنی) چیزیں تھیں، یہ سچ مچ کا کاروبار تھا۔ تو وہاں آپ نے یہ کہا کہ اس کی تجدید کرو اور وہاں بہت بڑا اہم سوال یہ ہے۔ خدا نے یہ کہا کہ یہ جو تیرے ہاتھ کے اوپر آ کر تجدید کرتے ہیں، یہ تمہارے ساتھ معاملہ نہیں کر رہے اے رسول! تم ہمارے Behalf پہ اس معاملے کی تجدید کر رہے ہو، جو تم نے ہمارے ساتھ کیا تھا کیونکہ ہم بنفسِ نفیس تو آ نہیں سکتے۔ جسے ہم خدا کے Behalf پہ کہتے ہیں۔ رسول یہ کرتا تھا۔ کہا کہ اسی طرح سے اب یہ جو عورتیں آئی ہیں، انہوں نے وہی جو مسلمان ہونے کے لیے شرط ہے، وہ کاروبار کے معاملے کی، جو ایک عہد نامہ ہے، اس کے لیے یہ بیعت کی ہے اور ان سے ان معاملات میں کہو کہ ہم خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے، چوری نہیں کریں گی، زنا نہیں ہوگا، اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی۔ میں نے کہا ہے کہ قتل کے معنی ذبح کرنا ہی نہیں ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ ان کے ہاں تھا یہ لڑکیوں کو زمین میں زندہ گاڑ دیا کرتے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے اور قتل یا ذبح کے معنی ذلیل کرنا، پست رکھنا، کمزور رکھنا بھی آتے ہیں کہ اولاد کے ساتھ یہ ان کا سلوک نہیں ہوگا۔ کسی کے خلاف بہتان نہیں باندھیں گی، جان بوجھ کر افتراء نہیں کریں گی اور بڑی اہم چیز یہ ہے کہ وَلَا یَعۡصِیۡنَکَ فِیۡ مَعۡرُوۡفٍ (60:12) ہم معروف میں، تمہارے حکم کی خلاف ورزی نہیں کریں گی۔ خاص طور پہ یہ کہا کہ فِیۡ مَعۡرُوۡفٍ (60:12) یہ بڑی اہم بات ہے اور بہت اہم مسائل ہیں، جو ہمارے ہاں اتنی گتھلکیں اور پیچیدگیاں پڑی ہوئی ہیں، یہ چیز

بات صاف کر دیتی ہے۔

## لفظ معروف کی اصطلاح کا مفہوم' اور آزادئ رائے کی قدر و منزلت اور مقام حدیث

قرآن کریم نے معروف کی یہ اصطلاح استعمال کی ہے۔ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یہ ہے کہ اسلامی مملکت کا' اسلامی حکومت کا فریضہ ہے کہ جس چیز کو قرآن کریم نے صحیح Recognize کیا ہے' اس کا حکم دینا' جس سے اس نے منع کیا ہے' اس سے روکنا۔ یہ ہے جامع اصول اسلامی مملکت کا۔ معروف وہ ہے جسے قرآن کریم Recognize کرتا ہے۔ اس صحیح کے معنی ہی یہ ہیں۔ اطاعت بھی انہی کی ہے' اس میں کسی کی ذاتی اطاعت نہیں ہے۔ حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ کی بھی ذاتی اطاعت نہیں تھی۔ کہا ہے کہ مَا یَعۡصِیۡنَکَ فِیۡ مَعۡرُوۡفٍ (60:12) یہ بیعت اس میں لی جارہی ہے اور جیسی کیسی بھی ہماری تاریخ ہے' اس میں یہ واقعات ملتے ہیں کہ حضور ﷺ نے کسی کو ایک حکم دیا۔ اس نے پوچھا کہ یہ قرآن کریم کے معروف میں سے ہے جو آپ کہہ رہے ہیں' وحی کی رو سے خدا کا حکم ہے جو آپ کہہ رہے ہیں یا آپ کا اپنا ذاتی مشورہ ہے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں' یہ تو میرا ذاتی مشورہ ہے۔ اس نے کہہ دیا کہ معاف رکھیے! میں اس کے ماننے کے لیے مکلّف نہیں ہوں' میں آپ سے بہتر جانتا ہوں اور تاریخ میں ہی کیوں جایئے' قرآن کریم کے اندر جو حضرت زیدؓ کا واقعہ لکھا ہے اس میں یہ چیز لکھی ہے کہ حضور ﷺ نے ان سے کہا کہ اپنی بیوی کو طلاق نہ دو۔ اس نے یہ پوچھا کہ یہ وحی کی رو سے آپ فرمارہے ہیں؟ آپ ﷺ نے کہا کہ نہیں' یہ مشورہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ معاف فرمایئے اور اس نے طلاق دے دی۔ قرآن کریم میں یہ چیز موجود ہے۔

عزیزانِ من! جسے اب آپ یہاں آج اتباعِ سنت کہتے ہیں اس میں پہلی چیز تو یہ دیکھنی ہوگی کہ جو حضور ﷺ کی طرف اقوال ارشادات کیے جاتے ہیں اور آپ ﷺ کے اعمال' جو کچھ وہی اب اس کا ذریعہ رہ گیا ہے' جسے اطاعتِ رسول ﷺ کہا جاتا ہے' اگرچہ وہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ ان کی حیثیت کیا ہے؟ یہ کہ چھ لاکھ ایک جامع حدیث امام بخاری کو روایاتی ملتی ہیں' وہ ان میں سے اپنے قیاس کے مطابق پانچ لاکھ ستانوے ہزار کو مسترد کر دیتے ہیں۔ وہ باقی جو رکھتے ہیں' اب ان میں یہ بات نہیں ہے کہ کونسی چیز حضور ﷺ نے وحی کی رو سے کہی تھی اور کون سے اپنے ذاتی فیصلے تھے جو انہوں نے وہاں ارشاد فرمائے تھے کیونکہ قرن کریم کہتا ہے کہ اطاعت تو صرف اس میں ہے تو اس مشکل مسئلے کا یہ حل مشکل تھا ہی نہیں' قرآنِ کریم نے رسول اللہ ﷺ سے کہا ہے کہ معروف کا حکم دیئے جاؤ۔ معروف وہ ہے جسے قرآن کریم اپنے ہاں صحیح Recognize کرتا ہے۔ جتنے اقوال اور فیصلے آج رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیے جارہے ہیں' ان کے متعلق یہ دیکھ لیجیے کہ وہ اگر قرآن کریم کے مطابق ہیں تو ہم انہیں صحیح ماننے کو تیار ہیں' بسم اللہ۔ اگر وہ اس کے خلاف جاتے ہیں تو ہم کہیں گے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا نہیں ہوسکتا۔ وہ اتنی ہی بات ہے لیکن اس پہ جو احادیث

کے مجموعے چلے آ رہے ہیں' ان کے ہاں ان کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ بخاری اور مسلم کی ایک حدیث بھی نہ مانی جائے' تو انسان دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ وہ ان کا عقیدہ یہ ہے یا ان کی ان جامعین حدیث سے جو عقیدت ہے وہ مجروح ہوتی ہے۔ صرف یہ بات ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عشق و محبت کی بات نہیں۔ یہ ان آئمہ حدیث جو ہیں' جامعین جو ہیں' ان کی عقیدت ہے جس کی بناء پر یہ ہے کہ کیا ہم یہ کہیں کہ انہوں نے ایک غلط حدیث اپنے ہاں جمع کر لی تھی۔ یہ نہیں کہا جائے گا' اس غلط حدیث کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دیا جائے گا۔ آج یہ کہاں سے پتہ چلے؟ کہا کہ یَعْصِیْنَکَ فِیْ مَعْرُوْفٍ (60:12) خدا کا حکم ہے' رسول اللہ ﷺ ان سے اس بات پہ بیعت لیتے تھے کہ ہم معروف میں آپ کی اطاعت کریں گے۔ کیا بات ہے قرآن حمید اتنی اہم چیز واضح کر رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ بیعت لے رہے ہیں اور وہ جو بیعت لینے والیاں ہیں یا جو لینے والے ہیں' وہ کہہ رہے ہیں کہ معروف میں آپؐ کی معصیت نہیں کریں گی۔ ہر بات میں نہیں' شخصی معاملات میں آپ ﷺ کے جو ذاتی مشورے ہوں گے' وہ ہمارے لیے Open ہیں' ان کو ہم مانیں یا نہ مانیں لیکن اس میں جو معروف ہوگی' اس میں ہم آپ ﷺ کی اطاعت کریں گے۔ یہ ٹکڑا بڑا اہم ہے۔ کہا ہے کہ فَبَایِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (60:12) اس بات کے اوپر ان کی بیعت لو اور پھر جو کچھ بھی ہوا ہے' اس سے ان کو حفاظت کا سامان عطا کرو۔

## قانون کے نفاذ سے قبل کوئی جرم جرم نہیں کہلاتا یہ عدل کا بنیادی اصول ہے

قرآن کریم کا اصول یہ ہے کہ کسی قانون کے نافذ ہونے سے پہلے' جو کچھ ہو چکا ہے' وہ سارے کا سارا ہو چکا' قرآن کریم اسے جرم نہیں قرار دیتا۔ ہر حکم کے ساتھ قرآن کریم نے دیا ہوا ہے کہ جو پہلے ہو چکا' وہ ہو چکا اور یہ عدل کا بہت بڑا بنیادی اصول ہے جو آج بین الاقوامی طور پر بھی مانا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں یہاں آپ دیکھتے ہیں کہ جو احکام نافذ ہوتے ہیں' وہ جولائی 1977ء سے نافذ ہوتے ہیں' پانچ سال ہو گئے۔ قرآن کریم کی اجازت نہیں دیتا۔ کہا ہے کہ انما قَدْ خَلَتْ (2:134`141) جب یہ قانون نہیں تھا' اس زمانے میں بھی اس نے یہ کچھ کیا ہے' آج وہ قانون کی کیٹگری میں آ ہی کیوں نہ جائے' اس وقت وہ قانون نہیں تھا' اس لیے وہ جرم نہیں ہو سکتا تھا۔ تو قانون کا نفاذ اس کے دل پہ ہوتا ہے اسی لیے کہا کہ جو پہلے کی باتیں ہو چکی ہیں اس پہ مواخذہ نہیں' اس سے حفاظت کا سامان کرو۔ کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (60:12) خدا کے قانون میں یہ مغفرت بھی ہے اور سامانِ نشو و نما کا دیئے جانا بھی ہوا ہے۔ کہا ہے کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ قَدْ یَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا یَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ (60:13) بات آخر میں پھر وہی آئی جہاں سے یہ شروع ہوئی تھی کہ ان کے ساتھ دوستداری کے تعلقات نہیں رکھو' سیاست میں سیاسی طور پر جو Contracts کی جاتی ہیں' جو معاہدات کیے جاتے ہیں' وہ موعدت میں نہیں آتے۔

وہاں دوستداری کا سوال نہیں ہے تو سیاسی طور پر مختلف قوموں کے اندر یہ معاہدے ہوتے ہیں' حضورﷺ نے بھی معاہدے کیے قرآن حمید اس سے نہیں روکتا۔ یہ جو یگانگت کے تعلقات ہیں' اپنوں میں سے انہیں تسلیم کر لینا ہے۔ یہ ہے کہ جس کی اجازت قرآن کریم نہیں دیتا۔ یہ ہے نقطہ امتیاز شروع سے آخر تک۔قرآن کریم اس پہ زور دیا ہے۔

## کیا پاکستان کا مقصد ایک ٹکڑا زمین کا حصول ہی تھا؟

عزیزان من! یہ اس لیے ہے کہ جولوگ قرآن حکیم کی ان تعلیمات اوران قوانین کو صحیح تسلیم نہیں کرتے' وہ تم میں سے ہو کیسے سکتے ہیں؟ یہ بھی ایک چیز تھی جو یہاں آ کر ہوئی۔ پہلے تو یہی کیا کہ وہ جو دوقومی نظریہ تھا' جس کی بنیادوں پر انہوں نے پاکستان کا یہ خطہ زمین حاصل کیا تھا' یادرکھیے! یہ اسلامی حکومت حاصل نہیں کی تھی' ایک خطہ زمین حاصل کیا تھا' جس میں اسلامی حکومت قائم کرنے کا امکان تھا اور یہ جو حاصل کیا تھا' اس کے لیے ان کے اصولوں کے مطابق بنیاد یہ تھی' کیونکہ وہ ایک الگ قوم کے لیے ایک الگ مملکت کو صحیح مانتے تھے' یہ بین الاقوامی اصول تھا اور ایک قانون یا ایک اصول انہوں نے تسلیم کیا تھا' یہ ایک مانی ہوئی حقیقت تھی۔ تو یہ جو چیز تھی کہ مسلمان ایمان کے اشتراک کی بناء پر' غیر مسلموں سے' ساری دنیا کے غیر مسلموں سے' ایک الگ قوم ہیں' یہ تھی وہ وہاں جولڑائی تھی۔ یہ تھا قوم کا تصور جو ہم نے منوایا تھا۔ وہاں یہ نیشنلسٹ علماء جو تھے' وہ یہ کہتے تھے کہ نہیں' ہندوستان کی چار دیواری میں رہنے والے مسلمان اور ہندو سکھ عیسائی سارے مل کر ایک قوم بنتے ہیں۔ہم نے کہا تھا کہ ٹھیک ہے' سیکولرازم کی بنیادوں پر تو وہ بنتے ہیں مگر دین کی بنیادیں یہ نہیں ہیں' وہاں حزب اللہ اور حزب الشیطن دو الگ جماعتیں' دو الگ قومیں ہیں۔ بہرحال یہ بات لمبی ہے۔

## قائداعظم کی سوانح عمری کو پیش کرنے والے کے لیے ایک اہم سوال

میں نے عرض کیا کہ آپ کے ہاں نہ تو تحریکِ پاکستان کی تاریخ لکھی گئی ہے' نہ قائداعظمؒ کی سوانح عمری لکھی گئی۔صحیح بنیاد تو یہ ہے۔قائداعظمؒ کی سوانح عمری لکھنے والے ایک صاحب آئے تھے اوران کو دعویٰ تھا میں نے دیکھا بھی کہ وہ جس انداز سے لکھ رہے تھے۔میں نے کہا کہ ایک بات کا مجھے جواب دیجیے۔اگر آپ سوانح عمری قائداعظمؒ کی لکھنا چاہتے ہیں' یہاں پوری عمر وہ نیشنل ازم نیشنل ازم پکارتے گئے وہ ہندو مسلم اشتراک کے سب سے بڑے داعی تھے۔ ہندوستان میں بسنے والے تمام افراد کو ایک قوم تسلیم کرتے تھے اور ان کا اسمبلی کے فلور پر یہ دھڑلے سے کہا جانے والا بیان مشہور ہے کہ I am Nationalist first Nationalist Second میں نے یہ کہا کہ قائداعظم یہ کہتے ہوئے یہاں سے گئے اوراس کے بعد جب واپس آئے تو انہوں نے کہا کہ نہیں' یہ غلط ہے کہ یہاں کے تمام باشندے وطن کے اشتراک کی بناء پر ایک قوم ہیں۔مسلمان ایمان کے اشتراک پر ایک

قوم ہیں۔ میں نے کہا کہ قائداعظم کی سوانح عمری یہاں سے شروع ہوتی ہے۔اس سے پیشتر وہ بہت بڑے وکیل تھے' بیرسٹر تھے' بہت بڑے لیڈر تھے' ہندو مسلم اتحاد کے بہت بڑے داعی تھے' اس کے لیے کوشش بھی کرتے رہے۔ سیاست یہ تھی' اس میں وہ ناکام رہے اور مایوس ہوکر یہاں سے یہ کہہ کر چلے گئے کہ میں نے جو ساری عمر کوشش کی' میں اس میں ناکام رہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ ناکام ہوکر چلے گئے۔ میں نے یہ کہا کہ جو مورخ یہ بتائے گا کہ ان میں یہ Change (تغیر) کیسے آیا؟ یہ بہت بڑا چیلنج ہے اور جو محمد علی جناحؒ کو جانتے ہیں ان کو معلوم ہے کہ وہ اصول کا کتنا پکا تھا' وہ یونہی بدلنے والی سیاست نہیں جانتا تھا۔ یہ تبدیلی ان میں کیوں آئی ہے؟ اس نے خود ہی اپنی سابقہ ساری زندگی کے جس قدر بھی اصول تھے ان کو تیاگ کے رکھ دیا۔ اور پھر ایک نیا مسلک اختیار کیوں کیا؟ کس بناء پہ یہ کیا تھا؟

## قائداعظمؒ نے اپنی سوچ کا رخ کس بنا پر تبدیل کیا؟ قائد کا جواب قائد کے الفاظ میں

یہ جواب جو شخص دے سکے گا' وہی قائداعظمؒ کی سوانح عمری لکھ سکے گا' وہی پاکستان کی تحریک کی تاریخ لکھ سکے گا۔ وہ تاریخ یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ تمہیداً اقبالؒ کو ساتھ ملانا ہوگا کہ انہوں نے یہ جو بات تھی' پہلے کہی تھی لیکن تحریک کی رو سے تو قائداعظمؒ نے یہاں یہ بات شروع کی۔ وہ Change ان کے اندر کیوں آیا؟ کس بناء پہ آیا؟ کیا وہ چیلنج تھا جو ان کے اندر آیا؟ یہاں سے یہ بات شروع ہوتی ہے صاحب! اور یہ بات تھی جو انہوں نے آگے کہی کہ میں نہ تو کوئی مولوی ہوں' نہ میں ملا ہوں' لیکن میں نے اپنے طور پر قرآنِ کریم کا جو مطالعہ کیا ہے' اس بناء پر میں اس نتیجے پہ پہنچا ہوں کہ وہ جو پہلے کا مسلک تھا وہ قرآن کریم کے خلاف تھا' اس لیے غلط تھا۔ یہ مسلک قرآن کریم کے مطابق ہے' اس لیے میں اس کو لے کر آیا ہوں' عزیزانِ من! کیا آپ نے کوئی بھی قائداعظمؒ کی سوانح عمری دیکھی ہے جس میں یہ لکھا ہوا ہو؟ ان کی اتنی تقاریب منائی جاتی ہیں' ان کے جشنِ ولادت بھی اور جشنِ وفات بھی اور پاکستان کا Independence Day بھی اور یومِ پاکستان بھی مناتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے مگر یہ جو ان کے جہاں سے وہ پٹڑی بدلی ہے' انہوں نے جہاں سے ایک متخالف لائن لی ہے' یہ جو ساری پچھلی زندگی کو تیاگ کے' ایک نیا اصول لے کر آئے ہیں' یہ یہاں سے شروع ہونے والی بات ہے اور یہ تھی جو قرآن کریم کے مطابق تھی کہ ان کے ساتھ تول نہیں ہوسکتا۔

## علامہ غلام احمد پرویزؒ کے ساتھ قائداعظم کی رفاقت کا ذکر

قائداعظمؒ کی رفاقت میں تو میں ہمیشہ یہ کہا کرتا ہوں کہ چھوٹا منہ اور بڑی بات' میں کیا عرض کروں۔ اب تو میں یہ کہونگا تو وہ لوگ کہہ دیتے ہیں کہ جو کسی کے جی میں آئے کہے' اسی لیے میں کہیں کہتا ہی نہیں۔ اب تو وہ بھی نہ رہے' جو اس کی تائید یا شہادت دے سکتے تھے دس برس تک قائداعظمؒ کے ساتھ مجھے جو سعادت حاصل رہی ہے' ان کے ساتھ' معیت کی قرآنِ کریم یہی معاملات

تھے جو ان کے ساتھ بحث میں آیا کرتے تھے۔ مجھے اس کی سعادت حاصل ہے۔ میں اس کا کچھ صلہ یا معاوضہ نہیں لینا چاہتا۔ اس کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ یہ تھی چیز اور پھر وہ ان کے قلب کے اندر اس طرح راسخ کر گئی تھی کہ آپ دیکھیے! کہ آخری دم تک وہ کسی معاملے میں ایسے نہیں آئے' جہاں ہندوؤں کے ساتھ قول کا ذکر آیا ہو صاحب! کوئی معاہدہ ہوگا'' ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا رہے ہیں''۔ یہ تھا پاکستان کی بنیاد بننے کا' یہ تھا جذبہ محرکہ' یہ تھا وہ انقلاب اور تبدیلی جو ان کے اندر آئی اور یہ کرتا تھا اقبالؒ۔ اب یہ بنیادیں یہاں ختم ہو چکی ہوئی ہیں۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اس بنیاد پہ جب یہاں پہلی پارلیمنٹ بن گئی وہ مجلس قانون ساز بن گئی نے قانون بنانا تھا تو انہوں نے پارلیمنٹ کے ممبر غیر مسلموں کو بنایا۔

## ہمارے ہاں پاکستان کے نظریہ کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہے

ان کے ہی الفاظ میں ''کتاب وسنت کی بنیادوں'' پہ قانون بنا۔ اس مجلس قانون ساز میں وہ لوگ بھی شریک تھے جو نہ کتاب کو مانتے تھے' نہ سنت کو مانتے تھے۔ کیا ہوا؟ ہوا یہ کہ انہیں ایک قوم کے فرد کر لیا۔ پاکستان کی بنیاد ہی ڈھے گئی۔ میں نے اپنے ہاں کئی جگہ لکھا ہے' ہندوؤں کے بڑے بڑے لیڈروں نے یہ بات کہی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ہم تو کہتے تھے کہ یہ جو دوقومی نظریہ لیے پھرتے ہیں' یہ محمد علی جناحؒ کا وکیلانہ حربہ ہے اپنا مقدمہ جیتنے کے لیے اور وہاں ہم ان کو ڈانٹتے تھے۔ جب یہاں آ کے انہوں نے یہ کیا اور سب سے بڑی مجلس قانون ساز کے اندر وہ غیر مسلم بھی سارے شامل تھے' ممبر کی حیثیت سے ایک قوم تھے۔ انہوں نے کہا کہ جو ہم کہتے تھے وہ صحیح تھا یا نہیں۔ اب کیا کہتے ہو اہلِ پاکستان! تم یہ ایمان کی بنیادوں کے اوپر قوم بنی ہے اور وہ تو بہرحال ایک بنی ہی تھی' اس کے بعد اس تمام دوران میں جو کچھ بھی ہم نے کیا ہے' اس میں یہ دوقومی نظریہ کا سوال ہی نہیں ہے۔ ہم الگ مسلمان قوم نہیں بن سکے تو دوسروں کے ساتھ مل کر کرنے کا کام یہاں آ کر یہ تھا کہ مسلمانوں کو ایمان کے اشتراک کی بنیاد پر ایک قوم بنایا جاتا' ایک امت بنایا جاتا' پیدائش کی رو سے نہ کوئی مسلمان ہوتا ہے' نہ ہندو ہوتا ہے۔ پیدائش کی رو سے ہم ایسے ہی مسلمان ہوتے ہیں جیسے ارائیں برادری کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ ارائیں ہونداا ے۔ وہ کیسے ارائیں ہوتا ہے؟ وہ کیسے راجپوت ہوتا ہے؟ کیسے ہوتا ہے؟ اس لیے کہ وہ ان کے گھر میں پیدا ہو گیا ہوتا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح سے ہم مسلمان ہیں کہ ان کے گھر میں پیدا ہو گئے۔ یہ اسلام نہیں ہے۔ پاکستان کی بنیادیں یہ نہیں ہیں۔ نظریہ پاکستان پہ زور دیا جاتا ہے۔ آج تک کوئی بتا نہیں سکا' ان میں سے کسی نے نہیں بتایا کہ نظریہ پاکستان ہے کیا؟ بنیادیں اس لیے کمزور ہو گئی ہوئی ہیں۔ نظریاتی مملکت تو کہا جاتا ہے۔ یہ نظریات دو ہی نظریئے تھے' اشتراک ایمان کے' اشتراک کی بنیاد پر' ایک الگ قوم اور تمام فیصلے کتاب اللہ کے مطابق۔ معاملہ ختم ہوا۔ یہ تھا نظریہ پاکستان۔ نہ وہ رہا' نہ یہ رہا اور پھر اور ہمارے لیے مصیبت ہوئی اگر کھلے بندوں یہاں آ کر ہم ان دونوں کو تیاگ دیتے اور کہتے کہ نہیں صاحب!

جس طرح سے دنیا کی اور مملکتیں اور قومیں ہوتی ہیں‘ اسی قسم کی یہ ایک چیز ہے‘ تو کھلے بندوں ایک طرف تو ہم ہوتے‘ پھر سیکولرازم کی بنیاد کے اوپر سارے معاملات حل ہوتے۔ یہ کہنے کی جرأت نہیں۔ نام آتا ہے اسلام کا اور ہو وہ رہا ہے جو اسلام کے خلاف ہے۔ اب اس میں پھر مشکل پیدا ہو جاتی ہے‘ نبھانا پڑ رہا ہوتا ہے وہ نام جو اسلام کا لیا جاتا ہے‘ پھر اس کی تاویلیں کی جاتی ہیں‘ ساتھ ساتھ اس نظریئے کے اسلامی قوانین بھی ہیں یعنی اسلام کی Definition نہیں کوئی بتا رہا تو میں نظریہ کہہ رہا تھا کہ کوئی نہیں سمجھا رہا‘ کوئی اسلام نہیں بتا رہا کہ کیا ہوتا ہے؟ ایک اجتماع میں کھڑے ہو کر دولیڈر الگ الگ نمازیں پڑھ رہے ہیں اور اسلام کی بنیاد کے اوپر لڑائی لڑ رہے ہیں۔

## صلح حدیبیہ کا واقعہ معاہدات اور موعدت کے فرق کی ایک واضح تر مثال ہے

قرآن حکیم نے عزیزانِ من! یہ جو چیزیں دی ہیں کہ ان کے ساتھ تول نہیں ہوسکتا‘ ان کے ساتھ دوستداری کے تعلقات نہیں ہوسکتے‘ یہ الگ قوم ہیں‘ تم الگ قوم ہو‘ یہ حزب الگ ہے‘ تم حزب اللہ ہو‘ یہ حزب الشیطٰن ہیں‘ ان کے ساتھ معاملات میں یگانگت نہیں کہ وہ جو ان کی عورتیں ادھر سے آئی ہیں‘ ان کے ساتھ معاہدہ کرو کہ یہ جو ہماری چلی جائیں گی یہاں کی‘ تو جو ہم نے خرچ کیا ہے وہ تم دیدو گے‘ تمہاری ادھر سے آئی ہیں‘ تو ہم نے ان میں کچھ کیا‘ ہم دیدیں گے‘ یہ ایک بین الاقوامی سطح کے اوپر ایک معاہدہ ہے اور اس قسم کے معاہدے ہیں۔ جو صلح حدیبیہ تھا‘ سب سے بڑا معاہدہ تو وہ تھا۔ یہودیوں کے ساتھ اتنے معاہدے کیے۔ رسول اللہؐ نے مدینے میں آنے کے بعد اہلِ مدینہ کے ساتھ معاہدے کیے۔ ان معاہدات میں یہ یہودی عیسائی بھی شامل تھے اور بات ہے برابر کی سطح پہ وہ ہوتے ہیں۔ موعدت ہے‘ محبت ہے تول یہ چیز نہیں ہوسکتی اور یہ تھی حضرتِ ابراہیمؑ کی زندگی کہ جنہوں نے یہ بات یہاں سے شروع کی تھی کہ جب انہوں نے یہ کہہ دیا کہ اِذۡ قَالُوۡا لِقَوۡمِهِمۡ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنۡكُمۡ وَمِمَّا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ(60:4). پوری قوم سے انہوں نے اعلان کر دیا کہ تم سے اور تمہارے یہ جو حکمران اور معبود بنے پھرتے ہیں‘ ہم ان تمام سے قطع تعلق کرتے ہیں۔ ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ كَفَرۡنَا بِكُمۡ (60:4). ہمارا تمہارے ساتھ کفر کا سلوک ہے.

## ایمان وہی ایمان ہے جو قرآنی تصورات پر پورا اترے

کہا کہ وَبَدَا بَيۡنَنَا وَبَيۡنَكُمُ الۡعَدَاوَةُ وَالۡبَغۡضَآءُ اَبَدًا (60:4). تم میں اور ہم میں ابدی طور پر‘ ہمیشہ کے لیے عداوت ہے۔ وَالۡبَغۡضَآءُ (60:4) تمہارے ساتھ ہمیشہ کے لیے نفرت یہ ہے اور آگے شرط لگادی کہ یہ کیسے بات بدل سکتی ہے۔ اس کے لیے کہا حَتّٰى تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَحۡدَهٗۤ (60:4) تاوقتیکہ تم بھی اللہ واحد کے اوپر ایمان نہ لاؤ جیسا ایمان قرآن حکیم کہتا ہے کہ ایمان لاؤ اور وحدہ ایک ہے دیکھیے! یہاں پھر وہ توحید آئی ہے۔

اگر اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک کر لیا ائے تو یہ ایمان بھی وہ ایمان نہیں ہوگا۔ اگر خدا کے ساتھ کوئی اور قوانین ساز آپ نے تسلیم کر لیے تو پھر توحید نہیں ہے، شرک ہے۔ جب سارے قوانین جو ہیں، انسانوں کے بنائے ہوئے، نافذ کیے جا رہے ہیں اور ان کو اللہ کے قوانین کہا جا رہا ہے۔ کہا یہ تھا وَحْدَہٗ (60:4) وہ جس سے روکا اور اس کے اور اس کے ساتھیوں کے اس اعلان کے متعلق کہا کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (60:6)۔ یہ ہے وہ مسلک، یہ ہے وہ ہستیاں، جن کا یہ اسوہ تھا۔ ان کی زندگی ان کے اقوال، ان کی یہ سیرت، ان کے یہ فیصلے، یہ تمہارے لیے بہترین نمونہ ہیں اور میں نے عرض کیا تھا کہ زبان کے اعتبار سے اسوہ ایسے نمونے کو کہتے ہیں جس کے اختیار کرنے کے بعد تمہارے دکھوں کا مداوا ہو جائے، تمہارا اضطرابِ قلبی باقی نہ رہے۔ یہ ہوتا ہے۔ جب آپ بین بین چلتے ہیں تو پھر ہر کام سے دل میں اضطراب پیدا ہوتا ہے اور نفرت کی آگ ہے۔ وہ اس لیے ہے کہ یقینی طور کے اوپر نہ کافر ہیں ہم، نہ یقینی طور پہ مومن ہیں، تو قرآن حمید نے یہ جو میں نے عرض کیا ہے، یہ سورۃ بڑی اہم اس اعتبار سے بھی ہے کہ اس نے اپنوں اور غیروں کے تعلقات کے دیئے ایک بین طور پر خطِ امتیاز کھینچ دیا اور اس میں حضرتِ ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کی زندگی کو بطور اسوہ حسنہ پیش کیا ہے۔ یہ ہے اسلام۔

عزیزانِ من! سورۃ الممتحنہ ختم ہوگئی۔ آخری آیت میں یہ ہے کہ وہ کفار اسی طرح سے آخرت سے انکار کر رہے ہیں جیسے ان سے پہلے وہ آخرت سے انکار کرتے ہوئے مر گئے اور قبروں میں چلے گئے۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ اس پہ ایمان نہیں لاتے، اس واسطے جب تک یہ خدائے واحد پہ ایمان نہیں لے آئیں، جیسا ایمان قرآن حکیم کہتا ہے، ورنہ خدا کو تو چند دہریوں کے سوا، سارے کہتے ہیں کہ ہم خدا کو مانتے ہیں۔ تو اس اعتبار سے آخر میں اس نے یہ کہا کہ آخرت کے منکر ہیں، ان سے تو ل نہیں ہوسکتا۔ سورۃ الممتحنہ ختم ہوئی۔

عزیزانِ من! آئندہ درس ہم درسِ قرآن کریم نہیں لیں گے۔ بلکہ وہ جشنِ نزول قرآن سے متعلق میرا خصوصی درس ہوگا۔ اس کے بعد عید کی تقریب میں درس کا ناغہ ہوگا۔ پھر اگلا درس جولائی 1983ء کی 22 تاریخ کو ہوگا۔ اس درس میں ایک بڑا ضروری اعلان کرنا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ جو ہمارے ہاں تقریبات آتی ہیں، ان کے اوپر میں ایک خصوصی درس پیش کیا کرتا ہوں۔ ان تقریبات میں سب سے اہم وہ تقریب ہے جسے ہمارے ہاں عید الفطر یا میٹھی عید یا سیویوں کی عید کہا جاتا ہے اور قرآن حمید اس کو جشنِ نزول قرآن بتاتا ہے اور یہ ایک ہی تہوار ہے جس کے منانے کا حکم خود خدا نے دیا ہے۔ یہ جشنِ نزولِ قرآن کا حکم ہے۔ یہ بڑا اہم ہوتا ہے تو آپ کو یاد ہے، میں اس تقریب پر بھی ایک الگ اہم درس پیش کیا کرتا ہوں۔ وہ عید تو بارہ یا تیرہ تاریخ کو آئے گی تو اس سے پہلے جو جمعہ آتا ہے، وہ آٹھ تاریخ کا ہوگا۔ یہ اگلا جمعہ ہوگا تو طے یہ کیا ہے کہ وہ اگلے جمعہ کا جو درس ہے، وہی ہم اس تقریب کے

درس میں تبدیل کرلیں گے اور وہ ہوگا جشنِ نزولِ قرآن کا درس اور اس درس کے لیے عنوان وہ ہے کہ جسے میں آنکھوں میں آنسو لائے بغیر پیش نہیں کرسکتا۔ عنوان یہ ہے: ''حلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے''۔ ہاں ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑتا ہے۔ یہ ہے' عزیزانِ من! عنوان۔ مجھے افسوس یہ ہے کہ خوشی کے تہواروں اور تقریبات میں' میں غم کی داستان پیش کروں' لیکن یہ یونہی Acting کے لحاظ سے غم کو خوشی بنا کے پیش کرنا تو کوئی اچھا شیوہ نہیں۔ میں نے کبھی ایسا شیوہ اختیار کیا کہ جگر مس ٹیس' لب ہنسنے پہ مجبور' ایسا نہیں ہے' جو جگر پہ گزر رہی ہے' جو دل پہ گزر رہی ہے' وہی سامنے آنا چاہیے اور وہ وہی بات ہے جو آج سے بہت پہلے تہتر سال پہلے' یوں کہیے کہ اقبالؒ نے کہی تھی: ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے اور وہ ہر سال ہنسی اڑاتے ہوئے آگے بڑھتا چلا گیا۔ اب تو ہنسی بھی نہیں اڑاتا' قہقہے مارتا ہے' ہماری حالت پہ۔ بہر حال اگلا درس جو ہے وہ یہ ہے۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ**(2:127)

❀......❀......❀

# سورة الصَّفّ

# پہلا باب: **سورۃ الصَّفّ** ( آیات 1 تا اختتام)

**بسم الله الرحمن الرحيم**

عزیزانِ من! آج جولائی 1983ء کی 22 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الصّف 61 ویں سورۃ سے ہوتا ہے۔ یہ ابتدا ہی پہلی آیت سے ہو رہی ہے۔ آٹھ جولائی کا درس جشنِ نزولِ قرآن کے سلسلے میں خصوصی تھا۔ پندرہ کو عید کی تقریب میں ہم نے ناغہ کیا تھا تو اس لیے سورۃ الممتحنۃ والے درس کے بعد یہ شروع ہو رہا ہے۔ ابتداء اس کی نئی سورۃ الصّف سے ہی ہو رہی ہے۔

## قدامت پرست طبقہ کو قرآنِ حکیم کی پیش کردہ آیات میں ربط نظر ہی نہیں آتا

کہا ہے کہ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (61:1)۔ یہ پہلی آیت ہے اور دوسری آیت ہے کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (61:2)۔ ہمارا قدامت پرست طبقہ قرآن کریم کے متعلق تو عجیب عجیب چیزیں رکھتا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ اس میں کوئی ربط نہیں ہے۔ خدا کی آخری کتاب اور معاذ اللہ بے ربط کتاب ہے اور وہ اس قسم کی آیتیں پیش کرتے ہیں کہ پہلی میں ہے کہ ارض و سماوات میں ہر شے خدا کی تسبیح کرتی ہے اور اگلی آیت ہے کہ تم کیوں وہ کچھ کہتے ہو جو کچھ کرتے نہیں۔ تو ان کو ربط نظر نہیں آتا۔ یہ عظیم چیز ہے جو قرآن حمید کہہ گیا ہے۔ یہ ربط ہی کی بات نہیں ہے بلکہ یہ دو نظاموں میں، دو کرداروں میں، دو روشوں میں، دو مسالک میں، دو مشارب میں، ایک Contrast (تقابل و تضاد) دکھایا گیا ہے۔ اس میں بڑی معنویت ہے۔

## اس خاموش کائنات کی ہر شے کا متواتر عمل انسان کو سبح کا مفہوم سمجھانے میں مصروف کار ہے

کہا ہے کہ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (61:1) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں، تمام کائنات میں، ہر شے اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں، سرگرداں رہتی ہے، مصروفِ عمل رہتی ہے اور یہ سارا نظام خدا کے قانون کے مطابق کارفرما ہے، جو بڑی قوتوں والا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ سارا کچھ دلائل و براہین کے اوپر مبنی ہے۔ قانون کے مطابق ہے۔ کائنات کی ہر شے اپنے فریضہ کی ادائیگی کے لیے سرگرمِ عمل رہتی ہے اور یہ ہمیں نظر آ رہا ہے، کائنات کی اشیاء میں ایک خصوصیت ہے کہ وہ کام کرتی ہیں، باتیں نہیں کرتیں، خاموشی سے ہر شے اپنی اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے مصروفِ کار رہتی ہے، بات نہیں کرتی، ساری کائنات خاموش کائنات ہے لیکن ساری، مصروفِ عمل کائنات ہے۔ خاموشی پر اقبالؒ کے چند خوبصورت شعر ہیں کہ

خاموش ہے چاندنی قمر کی    شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
تاروں کا خموش کارواں ہے    یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا    فطرت ہے مراقبے میں گویا [1]

---

[1] اقبالؒ: بانگ درا (ایک شام: دریائے نیکر، ہائیڈل برگ، کے کنارے پر)

یہ ساری کائنات خاموش ہے لیکن مصروفِ عمل ہے' مصروف کار ہے۔ بات یہ ہوئی کہ جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں' اُنہیں مذاقِ سخن نہیں ہے۔ اقبالؒ نے وہاں پہ لکھا ہے۔ جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں' اُنہیں مذاقِ سخن نہیں ہے [1]۔ جو کام میں مصروف ہوتا ہے وہ باتیں نہیں کرتا۔ کہتا ہے کہ یہ کائنات اس حقیقت پر شاہد ہے کہ جو مصروفِ عمل رہتا ہے' جو اپنے فرائض کی تکمیل میں سرگرداں رہتا ہے' وہ باتیں نہیں کرتا۔ تو اس کے بعد کہا کہ یاد رکھو! لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (61:2)۔ تمہاری کیفیت یہ ہے کہ کرتے نہیں ہو' اور باتیں کرتے رہتے ہو۔ یہ اتنا گہرا ربط ہے۔ یہ کیوں وہ کچھ کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ کہا ہے کہ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (61:3)۔ یہ بڑی ہی بات ناراضگی کی ہے' بڑی ہی بات خلاف ہے کہ تم جو کرتے نہیں ہو کہتے ہو' کرتے نہیں ہو' باتیں کرتے چلے جاتے ہو۔ اس کے متعلق باتیں باتیں ہی ہیں' کام کچھ نہیں ہے۔ یہ کیا روش ہے؟ اب غور فرمایا کہ ربط ہی نہیں' کس قدر دو الگ الگ کردار دکھا دیئے ہیں کہ ایک تمہارے سامنے اتنا عظیم القدر سلسلۂ کائنات ہے جو ہر وقت مصروفِ عمل رہتا ہے اور بات نہیں کرتا اور ایک تم ہو کہ باتیں ہی کیے چلے جا رہے ہو' جو فرائض تمہارے ذمے ہیں' ان کو پورا نہیں کرتے۔ دیکھو تو یہ جو Contrast (تقابل) ہے' یہ جو تضاد ہے' یہ ان دو کرداروں میں ہے کہ صرف یہ باتیں کرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں' کرتے کچھ نہیں ہیں۔

## انسان کے لیے قدرت کی طرف سے قوت گویائی جیسی عظیم نعمت کا مصرف اور اس کے نتائج

اگرچہ یہ ٹھیک ہے کہ انسان کی خصوصیت بھی قرآن حکیم نے یہ بتائی ہے کہ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (55:4) . اسے ہم نے قوتِ گویائی کی صلاحیت دی تھی۔ کائنات کی کسی اور شے کو بولنے کی صلاحیت نہیں ہے' یہ انسان ہی کو حاصل ہے اور بہت بڑی چیز ہے۔ یہ چیز حیوان سے اس کو متمیز کرتی ہے لیکن وہ تو قدرت کی صلاحیتوں کو اگر صحیح طور پر استعمال کیا جائے' جس مصرف کے لیے وہ دی گئی ہیں تو پھر تو اس کے نتائج تعمیری نکلتے ہیں۔ اگر انہی صلاحیتوں' قوتوں' استعدادوں کو غلط طور پر استعمال کیا جائے تو تخریب ہی تخریب ہوتی۔ ہے۔

آپ یہ بیان دیکھیے تو سہی کہ قوتِ گویائی پروگرام کے اوپر کام کرنے والے اس پر Plan کرنے والے Scientists ہوتے ہیں۔ وہ بڑی تھوڑی سی بات کرتے ہیں۔ یہ وہ بات کرنا' ایک چیز کو دوسرے کی طرف Convey کرنا' کتنا ضروری ہے لیکن دوسری طرف ہماری قومیں ہیں اور ہم تو ہزار برس سے اس میں لگے ہوئے ہیں' شاعری کیے چلے جا رہے ہیں صاحب! باتیں باتیں ہیں' آپ کی ساری تاریخ ہی باتوں سے بھری ہوئی ہے اور اس دور میں تو پھر ان باتوں میں اس لیے بھی انتہا ہو گئی ہے کہ یہ جو ابلاغ

---

[1] بانگِ درا میں یہ پورا شعر یوں ہے:

مُدیر 'مخزن' سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہہ دے جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں' اُنہیں مذاقِ سخن نہیں ہے

کے ذرائع ہیں، وہ بڑے عام ہوگئے ہیں۔ پہلے جو بات کرتا تھا، تو وہ اپنے ہی دائرے کے اندر رہتی تھی۔ اب تو ہر بات ریڈیو کی لہروں کے اوپر، ٹی وی کی اسکرین کے اوپر، اخبارات کے ذریعے سے، پھیل جاتی ہے یعنی وہ ایک بات کی جاتی ہے اور اس کی وہ جو صدائے بازگشت ہوتی ہے، جو گونج اس کی ہوتی ہے، وہ ساری دنیا میں پھیلتی چلی جاتی ہے۔ یہ باتیں ہیں، مذاکرات، سیمینار، کانفرنسیں، مناظرے ہیں۔ بیانات (Statements) ہیں۔ یہ باتیں، اتنی باتیں ہو رہی ہیں کہ وہ بابل کا مینار ہے، اس میں کوئی دوسری بات سنائی نہیں دیتی۔ باتیں ہی باتیں ہو رہی ہیں۔ اب نچوڑ کے دیکھیے کہ اس کے بعد ان میں کتنا کام ہوتا ہے۔ وہ کام بھی باتیں ہی ہوتی ہیں کہ وہ رپورٹ Publish (شائع) ہوگئی، اس کے بعد وہ ایک Plan آ گیا اور ایک کتاب چھپ گئی، اخبارات میں یہ اس کے اوپر Review کیے تو اس کے بعد جو کوئی پوچھتا ہے کہ میرے دکھ کی دوا کرے کوئی، تو وہ دوا نہیں ہوتی، انہیں نسخہ ہی دیتے ہیں۔

عزیزانِ من! کہا ہے کہ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تفعلون (61:2) کیا بات ہے! وہ کہتے یوں ہو، جو کر کے نہیں دکھاتے اور یہ بڑی بڑی بات ہے صاحب! اس میں بھی ایک بات عام طور پر ایک طرف دوسرے سے کہتا ہے کہ ''میاں! اس طرح سے تو جھوٹ نہ بولا کرو، کاروبار میں فریب نہ کیا کرو، بڑی بری بات ہے''۔ اسے سننا چاہیے کہ یہ بات ٹھیک کہتا ہے کہ ''شکریہ''! مگر وہ کہتا ہے کہ واہ میاں! پہلے اپنے آپ کو تو ٹھیک کرو کہ تم جھوٹ نہیں بولتے یعنی اگر وہ جھوٹ بولتا ہے، تو اس کے لیے بھی سند ہوگئی کہ یہ بھی بولے گا۔ ٹھیک ہے اس کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ بھی جھوٹ نہ بولے۔ یہ شخص جس سے یہ کہا جا رہا ہے، اسے تو صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ جو کچھ یہ مجھے کہہ رہا ہے وہ ٹھیک ہے یا نہیں؟ وہ جو اس کے لیے اس بات میں Excuse ڈھونڈ رہا ہے کہ چونکہ تم بھی جھوٹ بولتے ہو، اس لیے تمہیں کیا حق ہے کہ مجھے یہ کہو کہ جھوٹ نہ بولو۔ وہ جو کہنے والا خود نہیں کرتا، اس کا جرم اس کے ساتھ ہے، وہ جو تمہیں کہہ رہا ہے کہ تم اس پر کان دھرو کہ ٹھیک کہہ رہا ہے یا نہیں؟ تو یہ جو چیز عام طور پہ ہے، آپ دیکھیں گے کہ اس طرح سے کوئی بھی کسی کی نصیحت کارگر ہی نہیں ہو رہی۔

یہ ٹھیک ہے نصیحت کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس پہ خود عمل کر کے بھی بتائے لیکن جو سننے والا ہے، اس لیے اس چیز کو یہ کہہ کر دھتکار نہ دے کہ تم خود کیوں نہیں کرتے، اس لیے میں کیوں کروں اور اسی لیے تو یہ اپنی ساری فریب کاریاں ہیں اور اس لیے جتنی کاروباری تکنیکیں پھیلی ہوئی ہیں کہ ''وہ بھی تو کرتا ہے'' مثلاً جب یہ کہو کہ صاحب! ملاوٹ کیوں کرتے ہو؟ وہ کہتا ہے کہ ساری دنیا کر رہی ہے اور رشوت کیوں لے رہے ہو۔ اس لیے کہ ہر ایک لے رہا ہے جی! یعنی یہ سند بنتی جا رہی ہے۔ دیکھنا تو یہ چاہیے کہ جو کچھ یہ مجھ سے کہہ رہا ہے، وہ بات صحیح ہے یا نہیں ہے؟ یہ نہیں کر رہا تو یہ اس کا جرم ہے۔ یہ بھگتے گا، مجھ سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ اس نے وہ کیوں نہیں کیا تھا، مجھ سے یہ پوچھا جائے گا کہ ایک اچھی بات تم نے سنی کیوں نہیں تھی، پھر اس کے بعد عمل کیوں

نہیں کیا تھا۔ کہا کہ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (61:2) اور کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ[1] (61:2-3)۔ یہ بڑی چیز ہے۔ اس اتنے سے قرآن حکیم کے اس حکم یا وعظ پہ عمل ہونا شروع ہو جائے کہ کہو وہ جو کر کے دکھاؤ تو یہ آپ کے ہاں کا معاشرہ اور یہ دنیا کچھ کی کچھ ہو جائے اور اس کے بعد جو خارجی کائنات میں نظامِ عمل کا تقابل کیا ہے کہ سب خاموش کام کیے چلے جا رہے ہیں، یہ اس معاشرہ میں ہمارا کوئی کام نہیں، صرف باتیں ہیں اور باتیں کی جا رہی ہیں۔

## قوتِ گویائی کی مختلف شکلیں اور اس سلسلہ میں مومن کا کردار اور پھر خارجی کائنات کا عمل

یہاں مومن کا شعار یہ کہا تھا کہ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰہِ (61:3) یہ ہے جسے ہم ناگواری کی بات کہتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں کون سی بات ہے جو خدا کو پسند ہے؟ کہا کہ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ (61:4) خدا کے نزدیک پسندیدہ وہ ہیں جو باتیں نہیں کرتے اور جب بہت زیادہ بُرا وقت آ پڑتا ہے تو میدانِ جنگ میں سرفروشی کے لیے جا نکلتے ہیں اور اس کے بعد دشمن کا مقابلہ اس طرح سے صف آرا ہو کر کرتے ہیں گویا وہ ایک ایسی دیوار ہیں جسے سیسہ پلا کر مستحکم کر دیا گیا ہو۔ اب یہ دیکھیے جو پہلی بات تھی کہ یہ سارے مثلاً کوہسار کی چٹانیں، یہ اتنا بڑا سورج کا نظام، یہ سارے کے سارے تارے خاموش کھڑے ہیں مگر اپنے اپنے مقام پہ مصروفِ عمل ہیں۔ یہاں ایک تشبیہہ دی ہے کہ پھر یہ جماعت مومنین، مجاہدین کی جماعت، میدانِ جنگ میں جاتی ہے تو کیسے لڑتی ہے! وہ مدافعت میں اس طرح سے جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں گویا کہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہے۔ سیسہ پلائی ہوئی دیوار خاموش ہوتی ہے لیکن ہر مخالفت کا مقابلہ چٹان کی طرح کرتی ہے، کچھ نہیں کہتی لیکن اس طرح سے کھڑی ہوتی ہے کہ بڑے سے بڑا مہیب حملہ بھی اس کے پاؤں میں لغزش نہیں پیدا کرتا۔ کہتے ہیں کہ یہ پھر میدانِ جنگ میں یوں دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں جیسے سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوتی ہے۔ میدانِ جنگ کا سپاہی وہاں کچھ بھی بیان نہیں کرتا، وہ Statement issue نہیں کرتا، بیانات نہیں دیتا، مجلسیں نہیں منعقد کرتا، وہ کر کے دکھاتا ہے، بات نہیں کرتا مگر اس طرح سے جم کر کھڑا ہوتا ہے جیسے اس کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہو۔

## بنی اسرائیل کی حجت سازی کا انداز اور حضرت موسیٰ کی پکار

عزیزانِ من! قرآن حکیم پھر اپنے انداز کے مطابق تاریخی شواہد کو سامنے لے آیا کہ قومِ موسیٰ کو، بنی اسرائیل کی قوم کو دیکھیے۔ اپنے زمانے میں وہ بھی باتیں ہی باتیں کیا کرتی تھی، بڑی بڑی باتیں کیا کرتی تھی۔ قرآن کریم نے تو مختلف مقامات پہ دہرایا ہے کہ

---

[1] زبان سے بڑے بڑے دعوے کرتے رہو اور انہیں عملاً پورا کر کے نہ دکھاؤ۔ جو کچھ زبان سے کہو اسے عمل سے پورا کر کے دکھاؤ۔ قول اور فعل میں ہم آہنگی، دعوائے ایمان کی صداقت کا ثبوت ہے۔ قانونِ خداوندی کی رو سے یہ بات بڑی مذموم اور قابلِ گرفت ہے کہ ایسی باتیں کی جائیں جنہیں کر کے نہ دکھایا جائے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 1308)

انہیں ذرا سا حکم دیا کہ صاحب! یہ ایک گائے ذبح کر دو۔ بات بڑی صاف تھی۔ اب اس میں وہ حجتیں نکالنے لگ گئے کہ اس کی عمر کتنی ہونی چاہیے' رنگ کیسا ہونا چاہیے' وہ کس قسم کی ہونی چاہیے بڑی ہو یا چھوٹی ہو' ہل میں جتی ہو یا نہیں؟ انہوں نے کہا او سیدھی بات تھی اور تم لگے اس میں حجتیں نکالنے اور پھر جس انداز سے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ستایا کرتے تھے کہ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ (61:5) کیفیت ان کی یہ تھی کہ کوئی بھی خدا کا حکم ان کو دیا اور انہوں نے اس کے متعلق باتیں کرنی شروع کر دیں' عمل نہیں کیا اور ان باتوں میں پھر حضرت موسیٰؑ کو اس طرح سے ستاتے تھے!

یہ کس انداز سے ستاتے تھے؟ وہ بہر حال متعدد مقامات پر بات آگئی ہے' میں اس کو دہرانا ہی نہیں چاہتا' خاص طور پہ ہمارے ہاں روایات میں جو چیز کہی گئی ہے وہ تو دہرائی جانے کے قابل بھی نہیں ہے صاحب! کہا کہ تم جانتے ہو کہ میں جو کچھ تمہیں کہتا ہوں' وہ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا' یہ خدا کے پیغامات' اس کے احکام ہیں' جو میں تم تک پہنچاتا ہوں۔ یہ ان کی اطاعت سے' تم مجھ پہ احسان نہیں کرتے اور ان کی اگر تم خلاف ورزی کرتے ہو تو وہ میرے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں ہے۔ میں تو خدا کا رسول ہوں' اس کی بات تم تک پہنچاتا ہوں۔ کہا کہ پھر اس کا نتیجہ کیا ہوا؟

## تقدیر کا وہ غلط مفہوم کہ جس کی وجہ سے ملت اسلامیہ صدیوں سے زبوں حالی کا شکار ہے

عزیزانِ من! اب آگے بات پھر وہ دو چار لفظوں میں کہہ دی گئی ہے۔ کئی دفعہ یہ چیزیں آچکی ہیں' ہر بار جب آتی ہیں تو پھر بیان کرنا پڑتا ہے اور وہ بات یہ ہے جس نے تقدیر جیسے مشکل ترین مسئلے کو چار لفظوں میں حل کر کے رکھ دیا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ خدا جسے چاہے ہدایت دے دیتا ہے' جسے چاہے گمراہ کر دیتا ہے' جسے وہ چاہے یہ سب چیز عطا کر دیتا ہے' ذلیل بھی وہی کرتا' عزت بھی وہی دیتا ہے' حکومت بھی وہی دیتا ہے' جسے چاہے یہ کر دیتا ہے جسے چاہے وہ کر دیتا ہے' کوئی ذمہ داری انسان کی نہیں ہے۔ غور فرمائیے قرآن کریم کیا کہتا ہے کہ کس طرح سے یہ ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جیسے وہ انسان چاہتا ہے۔ کہا ہے کہ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ❶ (61:5)۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان کی ذہنیت بگڑ گئی' ان کی سیرت بگڑ گئی' ان کی سوچ بگڑ گئی' ان کے قلوب کے اندر تبدیلی پیدا ہو گئی۔ ذہنیت تباہ ہو گئی۔ یہ کیوں ہوئی؟ کہنے کو تو خدا نے ازاغ الله کہا مگر بات سمجھو۔ کہا ہے کہ فَلَمَّا زَاغُوْٓا (61:5) جب وہ خود ٹیڑھے ہوئے تھے' ان کی یہ کیفیت ہو گئی جب وہ خود ٹیڑھے ہوئے تو اس کا نتیجہ یہ نکلا۔ ایک دوسرے مقام پہ بھی یہ اس قسم کے چار ہی الفاظ ہیں جو آئے ہیں۔ یہ (51:9) میں ہے وہ بھی بڑی اہم بات ہے۔ کہا ہے کہ يُؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ❷ (51:9) غلط راستے کے اوپر وہی ڈالا جاتا ہے۔

---

❶ جب وہ ٹیڑھے چلتے رہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق' ان کی سمجھ بوجھ ہی ٹیڑھی ہو گئی (51:9) خدا کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ جان بوجھ کر غلط راہوں کی طرف نکل جائیں وہ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1309)۔

❷ جو تم میں سے صحیح راستہ چھوڑ کر غلط راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے' اسے وہ راستہ اختیار کرنے دیا جاتا ہے۔ نہ کسی کو زبردستی صحیح راستے پر چلایا جاتا ہے اور نہ ہی اسے زبردستی غلط راستے پر ڈالا جاتا ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1220)۔

جو غلط راستہ اختیار کرتا ہے۔ یہ ساری ذمہ داری قرآن کریم کی رو سے انسان کی ذمہ داری ہے جبھی تو وہ اپنے کسی فیصلے اور عمل کے نتیجے کا ذمہ دار بنتا ہے۔ اگر یہ سارا کچھ خدا ہی کیے چلا جا رہا ہے تو پھر یہ جزا سزا کے مسئلے' مکافاتِ عمل' یہ جنت اور جہنم' بیکار چیزیں ہیں' پھر تو وہی گمراہ کرتا ہے' وہی ہدایت دیتا ہے۔

## قرآن حکیم نے تو عزت وذلت کے پیمانے روزِ اوّل سے مقرر کر رکھے ہیں

یہ کتنی بڑی چیز ہے کہ انسان کے ہاتھ میں Initiative (پہل) ہے۔ یہ بات بہت دفعہ پہلے بھی آ چکی ہے کہ انسان ابتداء کرتا ہے' جس قسم کا یہ بن جاتا ہے' اسی قسم کے اس کے نتائج برآمد ہو جاتے ہیں۔ اب یہ ہے کہ یہ بنتا کس قسم کا ہے؟ اگر یہ اطاعت شعار بنتا ہے تو قوانین کے سرسبز و شاداب نتائج اس کو مل جاتے ہیں۔ اگر یہ ان سے سرکشی برتتا ہے تو تباہی اور بربادی اس کے حصے میں آ جاتی ہے۔ یہ جو کچھ بنتا ہے' خدا کا قانون انسان کے پیچھے پیچھے چلتا ہے' جس راستے کے اوپر یہ جاتا ہے' اس راستے کے مطابق اس کا قانون ہوتا ہے' غلط راستے پہ چلتا ہے تو وہ غلط جگہ جا کر پہنچ جاتا ہے' صحیح راستہ اختیار کرتا ہے' منزلِ مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ آغازِ کار جسے ابتداء کہتے ہیں' جسے انگریزی میں Initiative میں کہتے ہیں۔ یعنی اس مقام پہ دیکھیے! اس چوراہے کے اوپر وہ مسافر انسان کھڑا ہے جس نے جانا ہے' کسی منزل کے اوپر پہنچنا ہے' خدا اسے صحیح راستے کے اوپر نہیں لگا دیتا کہ چلو دکھا تو دیا ہے۔ اس نے وہاں چوراہے کے اوپر سائن پوسٹ لگا دیئے ہیں کہ یہ راستہ فلاں گاؤں کو جاتا ہے' یہ فلاں شہر کو جاتا ہے' آنکھیں دیدیں' روشنی دیدی' علم دے دیا' سائن پوسٹ دے دیئے' اب وہ خود پکڑ کے اس کو راستے کے اوپر نہیں لگاتا۔ کہتا یہ ہے کہ یہاں پہنچ کر جس قسم کا راستہ تم اختیار کرو گے' اس قسم کا قانون تمہارے اوپر لاگو ہو جائے گا۔ غلط راستہ اختیار کرو گے تو قانون یہ ہے کہ شام کو تکان تمہارے حصے میں آئے گی' منزل سے تم کوسوں دور ہو جاؤ گے۔ یہ ہمارا قانون ہے کہ غلط راستے پہ چلنے والا صحیح منزل پہ نہیں پہنچ سکتا لیکن یہ ابتدائے کار تمہارے پاس ہے کہ تم غلط راستہ اختیار کرتے ہو یا صحیح اختیار کرتے ہو۔ یہ ہم تمہارے لیے نہیں کرتے' ہم تو تمہارے فیصلے کے پیچھے پیچھے چلتے' ہیں جیسے تم بن جاتے ہو اس کے مطابق ہمارا قانون تمہارے اعمال کے نتائج دکھاتا چلا جاتا ہے۔

## انسان کی تقدیر انسان کے خود اپنے عمل سے ترتیب پاتی ہے

یہ جسے ہم تمہاری قسمت کہتے ہیں' جو تمہاری تقدیر ہوتی ہے' جو تمہاری قسمت ہوتی ہے' یہ باہر سے لکھی ہوئی کوئی چیز نہیں آتی۔ جس قسم کا انسان خود بن جاتا ہے' اس قسم کی اس کی تقدیر ہوتی ہے۔ یوں سمجھیے! تقدیر کے معنی خدا کا اس قسم کا قانون ہے جس کا اطلاق اس کے اوپر ہو جاتا ہے' اس کے اوپر Apply ہو جاتا ہے' جس قسم کا یہ بن جاتا ہے۔ وہ آپ کو یاد ہے میں نے وہ Erichfromm

کا جو انگریزی کا فقرہ تھا وہ کہا ہے کہ To Have or to Be[1] یہ "To Have" کی بات ہے جو میں نے کہا تھا ایک لفظ ترجمے کا نہیں مل رہا۔ یہ بات ساری اس "To Have" کی ہے کہ تم خود کیسے بن گئے ہو جیسے بن جاؤ گے اسی قسم کی تمہاری تقدیر ہوگی To Be ہوگی، پھر وہی اقبالؒ یاد آجاتا ہے، وہ اس تقدیر کے مسئلے کو کس خوبصورتی سے بیان کرتا ہے! کہتا ہے کہ

رمز باریکش بحرفے مضمر است

تقدیر کے مسئلے پہ کہتا ہے کہ یہ بڑی لطیف اور باریک سی رمز ہے۔ ایک لفظ میں بات صاف ہو جاتی ہے۔

تُو اگر دیگر شوی، او دیگر است!

تو اپنے آپ کو بدل لے، تیری تقدیر بدل جائے گی۔

خاک شو نذر ہوا سازد ترا

خاک ہو جا، راکھ ہو جا، ہوا آئے گی تو تمہیں اڑا کر لے جائے گی۔ تمہاری یہ کیفیت ہوگئی۔

سنگ شوبر شیشہ اندازد ترا!

پتھر ہو جا، تو شیشے کو توڑ کر رکھ دے گا۔

شبنمی؟ افتندگی تقدیر تسنت

شبنم کی بجائے سمندر بن جا، ہمیشہ کے لیے پائندہ رہے گا۔

تُو اگر دیگر شوی، او دیگر است!

یہ ہے جی تقدیر! خدا کا جو مسئلہ ہے جیسا تُو ہو جائے گا، اسی قسم کی تیری تقدیر ہوگی اور یہ تمہارے اختیار میں ہے کہ تم کس قسم کا ہونا چاہتے ہو۔ کہا ہے کہ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (61:5) جب وہ ٹیڑھے راستے کے اوپر چل پڑے تو ان کی ذہنیت ہی ٹیڑھی ہوگئی اور آگے ہے۔ کہ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (61:5) جو لوگ ٹیڑھا راستہ اختیار کرتے ہیں، خدا ان کو صحیح منزل پہ نہیں پہنچاتا۔ تم ٹیڑھا راستہ اختیار کرو اور یہ اس کی ذمہ داری لگا دو کہ مجھے صحیح راستے پر پہنچا دینا۔ یہ غلط ہے۔ غلط راستہ اختیار کرنے والے کو ہم منزلِ مقصود پہ نہیں پہنچایا کرتے۔ اس نے غلط راستہ اختیار کیا ہے تو غلط جگہ پہنچے گا۔

---

[1] یہ Frich Fromm کی کتاب کا بھی نام ہے اور یہ چیز اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔ Fromm, Frich (2000). To Have or To Be. New York: Continuum.

## نبی اکرمؐ کا نام قرآن کریم میں احمدؐ کہا ہے اور انجیل میں یہ لفظ جو مابہ النزع چلا آ رہا ہے اس کی وجہ

قومِ موسیٰؑ کے بعد حضرت عیسیٰؑ کا ذکر آ رہا ہے۔ اب ان کے حواریوں کا ذکر آئے گا۔ کہا ہے کہ وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَىَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ (61:6) حضرت عیسیٰؑ نے بھی انہی بنی اسرائیل سے یہ کہا کہ میں بھی خدا کا رسول ہوں تمہاری طرف' جو کچھ پہلے رسولوں نے کہا تھا' میں اس کو سچ کر کے دکھانے کے لیے آیا ہوں۔ عملاً ایک ایسا نظام قائم کروں گا کہ جو انہیں سچ کر کے دکھا دے گا۔ یہ تو ہے جو ماضی میں ہوا ہے۔ میں اس کے متعلق یہ کہہ رہا ہوں تو یہ کروں گا اور اس کے بعد کہا ہے کہ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِىْ مِنْۢ بَعْدِى اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ (61:6) اور میں تمہیں بشارت دیتا ہوں کہ میرے بعد ایک اور رسول آئے گا۔ اس کا نام احمدؐ ہوگا۔ یہ چیز بڑی مابہ النزاع چلی آ رہی ہے۔ ہمارے ہاں مناظرے ہوتے تھے' عیسائیوں میں مذاکرات ہوتے تھے۔ آج کل وہ مناظرے تو کم ہو گئے ہیں کہ قرآن کریم نے یہ احمدؐ کہا۔ یہ تو حضورؐ کا نام عربی زبان میں تھا۔ اب ان کے ہاں اصلی انجیل تو حضرت عیسیٰؑ کی جو زبان ارامی تھی اس میں وہ انجیل ہے ہی نہیں۔ اصل تو یہ ہے کہ یہ ارامی زبان دنیا میں کہیں بھی نہیں ہے۔ ان کے ترجمے یونانی میں ہوئے تھے یونانی کا اصلی ترجمہ بھی کہیں نہیں ہے پھر ان کے ترجمے مختلف زبانوں کے اندر ہوئے ایرانی میں بھی ہوئے اور پھر دنیا کی زبانوں میں بھی ترجمے ہوئے۔ ان ترجموں کی یہ کیفیت ہے کہ میرے پاس ان کے ہاں کے بائبل کے جو مختلف ایڈیشن ہیں وہ ایک کے ساتھ دوسرا نہیں ملتا۔ انہی کا شائع کردہ ہر نیا ایڈیشن پہلے ایڈیشن سے مختلف ❶ ہوتا ہے اس لیے یہ بات کہ جو اوریجنل انجیل حضرت عیسیٰؑ پہ نازل ہوئی تھی اس میں یہ لفظ کیا تھا' جسے قرآن کریم نے کہا ہے کہ انہوں نے کہا تھا کہ اس کا نام احمدؐ ہوگا۔ یہ انہوں نے عربی زبان میں تو لفظ نہیں کہا ہوگا' اپنی زبان میں کہا ہوگا' جس میں انجیل نازل ہوئی تھی' یونانی زبان میں آپ نے Paracbete کا لفظ سنا ہوگا' جسے فارقلیط کہتے ہیں۔ یونانی میں اس کے معنی تسلی دینے والا' اطمینان دینے والا ہیں۔ اب وہ لفظ بھی ان تراجم میں نہیں رہا' اس کے بڑے مختلف ترجمے ہوئے۔ اس کا

---

❶ 1963ء میں جیوئش پبلیکیشنز سوسائٹی آف امریکا کی طرف سے عہد نامہ عتیق (کی کتاب اوّل) کا جدید انگریزی ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ اس میں متعدد مقامات پر' سابقہ ایڈیشنوں سے اختلاف کیا ہے۔ اسی طرح عہد نامہ جدید (انجیل) کا نیا ترجمہ جدید انگریزی میں شائع ہوا ہے' اس میں اور سابقہ ترجمہ میں' جسے King James Version کہا جاتا ہے' کافی فرق ہے۔ جو چار کتب اناجیل موجودہ عہد نامہ جدید کے مجموعہ میں شامل ہیں' ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ متی کی انجیل 61ء اور 100ء کے درمیان تصنیف ہوئی۔ مرقس کی انجیل 64ء اور لوقا اور یوحنا کی انجیل پہلی صدی کے آخیر میں۔ چوتھی صدی میں جیروم نے ان اناجیل کا لاطینی میں ترجمہ لیا۔ اس لاطینی ترجمہ سے 1611ء میں انگریزی میں ترجمہ ہوا لیکن 1870ء میں عیسائی علماء کی ایک جماعت نے اس ترجمہ کو ناقص قرار دے کر ایک اور ترجمہ شائع کیا۔ یہی ترجمہ اس بائبل (عہد نامہ جدید) کہلاتا ہے۔ اس ترجمہ کے ہر نئے ایڈیشن اور ہر نئی زبان کے ترجمہ میں بھی کچھ نہ کچھ فرق ہوتا رہتا ہے۔

وکیل ترجمہ ہوا اور شفیع ترجمہ ہوا' اس کا مددگار بھی ترجمہ ہوا' مختلف انجیلوں میں اس لفظ کے مختلف ترجمے یہ کہنے کے لیے ہیں کہ یہ جو مسلمانوں کے رسول رسول اللہؐ تشریف لائے تھے' اس کو حضرتِ عیسیٰؑ نے بشارت نہیں دی تھی لیکن میں' آپ کو یاد ہوگا' کہا کرتا ہوں کہ ان کی ایک انجیل برنباس ہے۔ اس میں نظر آتا ہے کہ حضرتِ عیسیٰؑ پر' اس کے اوپر جو کچھ نازل ہوا تھا وہ تعلیم یقینی طور پہ نہیں ہے مگر اس کے قریب تر تو ہے' اس کی تعلیم بتا رہی ہے کہ مختلف موجودہ انجیلوں سے وہ بالکل مختلف ہے صاحب! اُس میں احمدؐ چھوڑ' محمدﷺ لکھا ہوا ہے اور کتنے ہی مقامات پر لکھا ہوا ہے' وہ میرے پاس موجود ہے۔ بات پھر وہی ہے کہ احمد حمد کرنے والا اور محمد جس کی حمد کی جائے' بات تو حمد ہی کی ہے۔

## انجیل میں ایک آنے والے کے تصور کی تفصیل

بہرحال' حضرتِ عیسیٰؑ نے' ان سے آنے والے کے متعلق کہا ہے' جو موجودہ انجیلیں ہیں' ان کے اندر بھی یہ نام تو نہیں ہے مگر آنے والے کے متعلق ان میں بھی متعدد مقامات پر پیشن گوئیاں ہیں۔ وہ حواری کہتے ہیں کہ آپ اس نظام کی تکمیل کیوں نہیں کرتے' انہوں نے کہا کہ یہ تکمیل میرے بعد آنے والا جو آئے گا وہ آکر یہ کرے گا اور پھر اس کی اور اس کے قدوسیوں کی' جو ساتھی ہوں گے بڑی تفصیل ہے کہ کس طرح سے یہ نظام تکمیل تک پہنچے گا۔ یہ موجودہ محرف انجیلوں کے ترجموں میں بھی یہاں تک تو موجود ہے' بس اس میں نام نہیں انہوں نے لیا' اتنی گنجائش آنے والا رکھ لی۔ کہنے لگے کہ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (61:6) جب وہ آنے والا آیا تو انہی عیسائیوں نے جن کے نبی نے ان سے کہا تھا کہ وہ آنے والا آئے گا' اس کا اتباع کرنا' وہ میرے پیغام کی تکمیل کرے گا پھر جب وہ آنے والا وہ ساری نشانیاں ساتھ لے کر آیا جو ان کے نبی نے ان سے کہی تھیں تو انہوں نے کہا کہ نہیں صاحب! یہ تو ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے جو شخص یہ بول رہا ہے۔ انہوں نے یہ کر دیا۔ یہ بات وہاں کی تھی کہ جب وہ آنے والا آیا تو انہوں نے یہ کیا۔

## ہمارے ہاں ایک آنے والے کا دعویٰ

عزیزانِ من! ایک ہمارے ہاں آنے والا آیا' وہاں اس کا نام احمد تھا۔ اب پھر کہیں گے کہ اپنا ہی نام لے لیا' نہیں اس کا نام غلام احمد تھا۔ یہ کہنے لگا کہ بھئی! میں وہی احمد ہوں جس کے متعلق حضرت عیسیٰؑ نے کہا تھا کہ وہ آئے گا اور احمد کہا تھا کہا کہ تم تو غلام احمد ہو تو احمد تو تم کوئی اور تسلیم کر رہے ہو جس کے تم غلام ہو تو تم پھر احمد کیسے ہو؟ یہ کہنے لگا کہ غلام والی بات تو میرے ماں باپ نے ایسے ہی رکھ دی تھی' نام رکھ دیا تھا' اصل میں' میں احمد ہی ہوں۔ وہ احمد ہی بن کے آ گئے۔ اب کیا بتایا جائے۔ گورنمنٹ کی خیر' یارو! سناؤ! یہ اکبر الہ آبادی نے کہا تھا: انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ۔

سرخیل صوفیاء محی الدین ابن عربیؒ جنہیں شیخ اکبر کہہ کر پکارا جاتا ہے اور جنہیں سلسلہ تصوف میں سند کی حیثیت حاصل ہے' نے کہا تھا کہ الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ۔ تو جس کا جی چاہتا تھا نبی بن جاتا تھا۔ منصور حلاج کے بنیادی عقیدہ کا ملخص ❶ یہ ہے کہ تخلیق کائنات سے پہلے خدا خود اپنی ذات میں گم تھا۔ اس نے اپنے آپ کو ظاہر کرنا چاہا تو آدم کو پیدا کیا۔ اس طرح خدا (لاہوت) آدم (ناسوت) میں حلول کر گیا)۔ اور یوں خدا اور انسان ایک ہوگئے اور وہ خدا بن ❷ گیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر جناں دے کپڑے' چیلے چور چھپ غلام احمد بنا' نبوت کا دعویٰ کیا۔ وہ خدا ہی بن گیا پتہ نہیں اگلا ہور کی دعویٰ کر چھڈ دا۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ **فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ** (61:6) جب وہ واضح دلائل کے ساتھ آیا تو انہوں نے کہا کہ تو بالکل جھوٹ ہے۔ وہ تو قصہ وہاں ختم ہو گیا۔ وہ کہتا ❸ ہے کہ نہیں وہ ہم ہیں جو آنے والے تھے۔ عزیزانِ من! اب ان باتوں کا کیا فائدہ۔

کہا ہے کہ **وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعٰٓى اِلَى الْاِسْلَامِ** (61:7) اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا کہ جو اپنی طرف سے بات کرے اور خدا کی طرف اس کو منسوب کرے حالانکہ اس کو اسلام کی طرف دعوت دی جاتی ہے یہ دعوت پہلے دن سے ان سے ہے جو نبی آنا شروع ہوئے' حضرتِ نوحؑ سے جو دعوت کا سلسلہ شروع ہوا ہے تو حضورؐ تک اس کی تکمیل ہوئی ہے۔ ان سارے انبیائے کرامؑ کا ایک ہی دین تھا' جس کے اصول دیا کرتے تھے اور وہ حقیقت میں الاسلام ہی تھا کہ اسلام کی طرف دعوت دی جارہی ہو تو اب اس میں دو Categories ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ اپنی طرف سے بات بنائے اور خدا کی طرف منسوب کرے۔ دوسرا یہ ہے کہ سچی بات اس کو پہنچائی جائے اور وہ اس کی تکذیب کرے' کہے کہ یہ جھوٹی بات ہے۔ کہا کہ **وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ** (61:7) پہلے کہا تھا **فٰسِقِيْنَ** (61:7) اور یہاں **الظّٰلِمِيْنَ** (61:7) ہوا کہ جو خود ظلم کا راستہ اختیار کرلے اس کو منزلِ مقصود تک وہ کیسے پہنچائے۔ اللہ نہیں پہنچاتا۔

## نبی اکرمؐ کی دعوت کی مخالفت کرنے والوں کو قرآن حکیم نے ظالمین کہا ہے

یہ بات کہہ رہی ہے کہ یہ نہ کہو کہ یہ اللہ میاں کچھ کرتا ہے' وہ نہیں پہنچاتا۔ یہ جتنے لوگ نبی اکرمؐ کی دعوت کا انکار کرتے تھے' سرکشی برتتے تھے' مخالفت کرتے تھے' کوشش کرتے تھے کہ یہ کامیاب نہ ہو' ان میں یہ اہل کتاب بھی شامل ہیں' خاص طور پہ یہود نصرانی بھی

---

❶ فرانس کے ایک محقق' موسیو لوئی ماسیون نے حلاج کی کتاب (کتاب الطّواسین) اپنے تشریحی حواشی کے ساتھ شائع کی ہے۔ اس میں حلاج کا جو بنیادی عقیدہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کا ملخص یہ ہے (ماخوذ از پرویزؒ: تصوف کی حقیقت (11992) ص ص۔ 77,78)

❷ ابن عربی نے کہا تھا کہ وحدۃ الوجود کی رو سے' حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں ایک ہیں۔

❸ یہ اشارہ غلام احمد قادیانی کی طرف ہے۔

شامل تھے' اور عیسائی بھی۔ یہ باقی انکار کرنے والے ان کو اس زمانے کے اعتبار سے مشرکین عرب کہا گیا۔ کوئی بھی ہوں جو بھی اس دعوت کو قبول نہیں کرے گا وہ وہ ہے جو اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ کہا کہ ان کی کوشش کیا ہے؟ دو مقام پہ یہ آیت آئی ہے کہ یُرِیۡدُوۡنَ لِیُطۡفِـُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰہِ بِاَفۡوَاہِہِمۡ (61:8) یہ چاہتے یہ ہیں کہ خدا کے نور کو پھونکیں مار کر بجھا دیا جائے خدا کا جو دیا ہے اسے پھونکیں مار کر بجھا دیا جائے۔ چاہتے ہیں پھونکیں مار کے بجھا دیں' گھناؤناں کر دیں' اس کی روشنی ختم کر دیں' خدا کے جلائے ہوئے دیئے کو پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں۔ جتنی کوششیں بھی خدا کے نازل کردہ دین کی مخالفت کے اندر ہوئیں وہ کبھی کامیاب نہ ہوئی ہیں' نہ ہو سکتی ہیں۔

## دین خداوندی کے روشن چراغ کو مذہب کی اندھی تقلید کی پھونکیں بجھا نہ سکیں گے دینِ خداوندی سراج

یہ جو آج ہے کہ اسلام کے نام سے ساری دنیا کے اندر ہم سرنگوں پھر رہے ہیں' یہ خدا کے دین کی مخالفت نہیں ہیں' یہ ہمارے بنائے ہوئے مذہب کی مخالفت والے ہیں۔ وہ تو پنپ ہی نہیں سکتا۔ مذہب کو تو ہر مقام پہ شکست ہوئی ہے' وہ دلیل و برہان پہ مبنی ہی نہیں ہوتا۔ وہ تو جب بھی علم و عقل کی دلیل و برہان کی روشنی آئے گی' مذہب کی تاریکی ختم ہو جائے گی۔ یہ دین کا دیا ہے' جگمگاتا ہوا ہے۔ سورۃ النور میں اس کو دیئے سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ یہ سورج ہے قرآن حکیم نے سورج بھی اس کو کہا ہے: سراجِ منیر۔ نبی اکرمؐ بھی اس اس دیئے کو لے کر آئے۔ یہ ہے دعویٰ کہ اس کی مخالفت' جتنا جی چاہے' کیجیے' مخالفت ایسی ہے جیسے کوئی سورج کو پھونکیں مار کے اندھا کر دینا چاہے۔ اس دیئے کو نہیں بجھا سکتے۔ کہا ہے کہ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوۡرِہٖ وَلَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ (61:8). خدا کا قانون اس کا نظام' یہ ہے کہ وہ اس نور کو مکمل کر کے رہے گا' خواہ ان مخالفت کرنے والوں پر یہ بات کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔ دین قرآن حکیم ہے، وہی خدا کا سراجِ منیر دیا ہے' وہی روشنی ہے' اسی کے اتمام کا ذمہ خدا نے لیا ہے۔

## خدا کا یہ آخری دین ایک ایسی تھیوری ہے کہ جس نے بالآخر کامیاب ہو کر رہنا ہے

یہ آخری دین ہے' آخری کتاب ہے' آخری نبیؐ ہیں' تو جو انہوں نے دیا ہے وہ تو قیامت تک تمام نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ یہ اگر معاذ اللہ ایسا ناکام رہ جائے کہ یہ زندہ ہی نہ ہو سکے' تو یہ سارا سلسلۂ رشد و ہدایت ہی ختم ہو گیا اور تو کوئی نبی نہیں آنا اور کوئی کتاب ہی نہیں آنی' اس لیے یہ جو آخری مکمل' غیر متبدل کتاب دی ہے' اس میں دیئے ہوئے نظام کو کامیاب ہو کر رہنا ہے۔ کہا کہ ہُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡہُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ وَلَوۡ کَرِہَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ (61:9)۔ خدا نے ایک رسولؐ ضابطہ ہدایت دے کر بھیجا جسے دینِ حق کہا جاتا ہے۔ صرف ہدایت ہی نہیں کہا ہے دین کہا ہے دین نظام کو کہتے ہیں۔ ہدایت تو ایک ان تھیوری ہوتی ہے' وہ ایک نظری چیز ہوتی ہے۔ قرآن کریم کی دفتین کے اندر' تحریر کے اندر' الفاظ کے اندر' وہ ہدایت ہے' جب عملاً متشکل ہو گی تو ایک نظام کی شکل اختیار کرے گی تو وہ دین ہو گا۔ ہدایت بھیجی قرآن کریم کے اندر اور اس کے بعد اس نے بتایا کہ یہ

ایک محسوس نظام کی شکل میں متشکل ہوگی۔ وہ دین الحق ہوگا۔ اس کو خدا لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ (61:9) کہتا ہے۔ اب آپ آگے دیکھیے پھر دین کا لفظ کہا کہ ادیان عالم پر اس کو غالب کرے گا تو یہ دین کونسے ہیں؟ یہ انسانوں کے بنائے ہوئے نظام ہیں۔ ہمارے مناظرے سارے مذہب کی بنیاد پہ ہوتے ہیں اسلام کو تمام مذاہب پر فضیلت حاصل ہے حالانکہ وہ مذہب ہے ہی نہیں اور اس کا مقابلہ مذاہب سے کر کے بڑے خوش ہوتے تھے کہ ہم نے پتہ نہیں کونسا قلعہ فتح کر لیا ہے۔ ہم نے اسے مذہب بنا دیا حالانکہ وہ تو مذاہب کی تردید❶ کرنے کے لیے آیا ہے۔

## آج تو پوری دنیا اپنے اپنے نظام زندگی سے خود ہی تنگ آچکی ہے

دینِ اسلام مذہب نہیں ہے۔ یہ انسانوں کے بنائے ہوئے جتنے خود ساختہ نظام ہیں، وہ کہتا ہے کہ ان کے مقابلے میں، یہ ان کے اوپر غالب آ کر رہے گا۔ اب یہ ایک لمبی داستان ہے۔ بظاہر تو آج کہیں گے کہ آج تو یہ جسے آپ نظام کہتے ہو دنیا میں کہیں ہے ہی نہیں۔ کہیں اٹھے بھی تو دوسرے دنیا کے جو نظام ہیں، وہ تو ان کو فوراً مغلوب کر دیتے ہیں۔ یہ کیسے؟ عزیزانِ من! میں نے اس کے متعلق بہت لکھا ہے۔ وہ ایک ہی پمفلٹ جو ہے، بڑا جامع ہے: ''کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے''۔ میں نے بتایا یہ ہے کہ ٹھیک ہے کہ مسلمانوں کے ہاں تو یہ ایک عملی نظام کی شکل میں ہے نہیں، لیکن ساری دنیا کے نظام قائم کرنے والے، جنہوں نے انسانوں کے اصولوں پہ نظام قائم کیے تھے، وہ اپنے اپنے نظام کے ہاتھوں مایوس ہو چکے ہیں، تنگ آچکے ہیں، کسی دوسرے نظام کی تلاش کر رہے ہیں۔ ان کو پتہ نہیں کہ وہ نظام ہے کہاں لیکن خود ہی اپنے تجربے کی بناء پر جو وہ کہہ رہے ہیں، وہ اسی قسم کے نظام کی تلاش میں ہیں جو قرآن حکیم نے دیا ہے۔ یہ تو ہماری بدنصیبی یا ہمارے ساتھ اقوامِ عالم کی حرماں نصیبی ہے کہ قرآن کریم ان کے سامنے پیش ہی نہیں کیا گیا۔ وہ اس کی تلاش کر رہے ہیں۔ نظری طور پہ تو اس وقت بھی، آپ اُسے ذہنی طور پہ کہہ لیجیے یہ جو قرآن حکیم کا نظام ہے ذہنوں کے اوپر تو اب بھی مسلط ہوا چلا جا رہا ہے مگر نظری طور پر قائم کرنے کے لیے انہیں مثال نہیں ملتی۔

## مغرب کے عیسائی پادری اعلیٰ تعلیم کے حامل، جو حقیقت کی تلاش میں نکلتے ہیں، تاثرات

میرے پاس جنہیں یہ مغرب کے بڑے بڑے دانشور اور ان کے ہاں یہ عیسائی بھی جنہیں ہم تو پادری کہتے ہیں مگر یہ بڑے پڑھے لکھے لوگ ہوتے ہیں کیمرج یونیورسٹی کی جو آخری کلاس ہے اس تک پہنچنے کے بعد، باقی تو وہاں سے فارغ ہو جاتے ہیں مگر انہیں ڈگری لے کر پادری بننے کے لیے دو سال اور لگانے پڑتے ہیں۔ ہمارے ہاں کا پادری وہ ہوتا ہے جو شروع سے آخر تک قرآن

---

❶ Parwez, G.A. (1968): Islam: A Challenge to Religion Idare-e-Tulu-e-islam, Lahore (Pakistan).

حکیم کو پڑھ جاتا ہے مگر ایک لفظ نہیں سمجھتا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ وہ پادری بھی آتے ہیں' Discuss کرتے ہیں جو اس وقت دنیا کی Problems ہیں۔ قرآنِ کریم وہ Problems حل کرتا ہے۔ وہ یہ نہیں بتاتا کہ اس سے اتنا ثواب ہوگا' تم جنت میں چلے جاؤ گے۔ وہ کہتا ہے کہ یہاں اس دنیا کے اندر کس طرح سے رہنا ہے۔ ان سے جب بات کی جاتی ہے تو بہر حال وہ صحیح دل سے کہتے ہیں یا ویسے ہی' ایک بھی میں نے ایسا نہیں پایا جو اس سے مطمئن نہ ہو کہ بات تو کچھ یہی ہے جو قرآن حکیم کہہ رہا ہے' جو تم نے بتایا ہے اور اگلی بات وہ ہے کہ پھر وہ مور اپنے پاؤں دیکھ کر اپنے پروں کو بھی نیچا کر لیتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ جب یہ قرآن کریم تمہارے پاس ہے' چالیس چوالیس آزاد اسلامی مملکتیں بھی تمہارے پاس ہیں تو یہ نظام رائج کیوں نہیں ہو رہا۔ عزیزانِ من! ان میں سے ہر ایک یہ کہہ کر اٹھتا ہے اور میری آنکھیں جھک جاتی ہیں۔ بات ٹھیک ہے اور پھر وہی قرآن حکیم کی جو بات آجاتی ہے کہ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (61:2)۔ جو نظام تم قائم کر کے نہیں دکھاتے' اس کی باتیں کیوں کرتے ہو۔ یہ نظام قائم ہو کر رہے گا مگر کیسے؟

## خدا تعالیٰ کے ساتھ کاروبار کرنے کا راز

کہا کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنْجِیْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ (60:10)۔ تمہاری دنیا میں ہر شخص کچھ نہ کچھ کاروبار کرتا ہے۔ اس کا نام بزنس نہ بھی رکھے تو بھی ہر ایک ہم میں سے ساری زندگی لین دین کرتا ہے۔ اسی کا نام بزنس ہے۔ کہنے لگے کہ وہ تو اپنی عقل کے زور پر' تجربے کی بناء پہ' کرتے ہو۔ بعض میں کچھ فائدہ ہوتا ہے' بعض میں نقصان بھی ہوتا ہے۔ کہا کہ میں تمہیں ایک ایسا کاروبار بتاؤں۔ یہاں تجارت کا لفظ آیا ہے' ایسا کاروبار بتاؤں' جس میں کبھی خسارہ ہوتا ہی نہیں۔ وہ کون ہے جو کہے گا کہ نہیں صاحب! میں نہیں چاہتا ایسا کاروبار کرنا' جس میں خسارہ ہو ہی نہیں خسارہ ہی نہیں بلکہ اس کے بعد کسی بھی قسم کی تباہی نہ آئے کہ جی ہاں فرمائیے! جی سن لیجیے۔ کہا کہ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ (61:11)۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ خدا نے رسولؐ کی وساطت سے جو بھی صداقتیں دی ہیں' ان کے اوپر یقین ہو کہ یہ کامیابی کا راستہ ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر کام جو شروع کیا جائے' عزیزانِ من! اس کے متعلق پہلے یہ یقین ہونا چاہیے کہ یہ کامیابی کا راستہ ہے۔ کوئی کاروبار بھی جو آپ شروع کریں گے' اگر شروع میں یہ چیز ہو کہ یہ نقصان پہنچائے گا' تو کون ہے جو یہ کرے گا۔ وہ تو مثال ہے کہ یہ پاگل ہو گیا ہے' اس کو اپنے نفع نقصان کا بھی خیال نہیں ہے۔ وہ تو پاگل ہوتا ہے ورنہ ہر شخص پہلے اپنے آپ کو Assure کر لیتا ہے' مطمئن کر لیتا ہے کہ اس میں مجھے فائدہ ہوگا۔

## خدا کے ہاں کامیاب تجارت کا ایک یقینی منفعت بخش اصول کا ثمر

وہ کہتا ہے کہ پہلے یہ یقین کرو کہ یہ جو تجارت کے اصول ہم بتا رہے ہیں' اس میں فائدہ ہوگا نقصان نہیں ہوگا۔ یقین ہے تمہیں اور یقین اندھے یقین کا نام نہیں ہے' عقل و بصیرت کی بناء پہ پرکھ لو' دیکھ لو' جانچ لو' بھانپ لو' وقتی طور پر آگئے تم اس پہ کہ واقعی یہ سچی

بات ہےتو بات پھر یہ ہے کہ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ (61:11)۔ بات اتنی سی ہے خدا نے جو راستہ بتایا ہے لوحِ انسانی کی منفعت کا' اس کے لیے مسلسل کوشش کرتے چلے جاؤ تا آنکہ وہ وقت بھی آجائے کہ میدانِ جنگ میں بھی جانا پڑے۔ جہاد صرف میدانِ جنگ میں جنگ کرنے کا نام ہی نہیں ہے' یہ مسلسل کوشش کا نام ہے۔ اسی کو جہدِ مسلسل کہتے ہیں۔ ساری زندگی جہاد میں گزرنی ہے۔ وہ چمکتی ہوئی حدیث نبی اکرمؐ کی ہے جب حضورؐ سے فرمایا کہ مومن کی زندگی کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ جب جنگ ہو تو میدانِ جنگ میں ہو' جب نہ ہو رہی ہو تو جہاد کے لیے تیاریاں کر رہا ہو۔ مومن کی زندگی یہ ہے اور تیاری یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی تلوار تیز کر رہا ہو۔ وہ جو اپنے معاشرے کا نظام قائم کرے' اس کے اندر ہر فرد اس قسم کا بنتا چلا جائے کہ وقت آنے پر وہ میدانِ جنگ میں کھڑا ہو۔ یہ ہے مسلسل جہاد کی زندگی۔

کہا کہ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ (61:11) جب جنگ نہیں ہے تو اموال کے جہاد بھی ہیں' پھر جان کا جہاد بھی ہے۔ کہا کہ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (61:11) علم کی بارگاہ سے پوچھو تو تمہیں بتائے گا کہ واقعی کہ یہ تجارت ایسی ہے جس میں نقصان نہیں ہوتا' تباہی نہیں آئے گی۔ کہا ہے کہ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (61:12) تمہارے پیچھے جو باتیں بطور الزامات لوگ لگا رہے ہیں' تمہارے پیچھے چپکا رہے ہیں اللہ ان تمام سے حفاظت کا سامان بہم پہنچا دے گا۔ ایک کامیابی ہزار قسم کی ناکامیوں کی تہمتوں سے بچا دیتی ہے۔ آدمی کی دلیل اور اپنے دعوے کی صداقت کا ثبوت ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ کامیاب ہو جائے' اس کے خلاف جو کچھ لوگوں نے الزام تراشیاں کی ہوئی ہوتی ہیں' سب ختم ہو جاتی ہیں۔ وہ دعویٰ کامیاب ہو جاتا ہے۔ کہا کہ یہ ہوگا۔ ان کی باتوں میں نہ آؤ' جو آج تمہارے خلاف یہ کچھ کہہ رہے ہیں۔ یہ سب ختم ہو جائیں گی۔

## قرآنی نظامِ حیات کی برومندی کے لیے مدینہ منورہ کے شب و روز صبر و استقلال کا ثمرِ عظیم

جب تمہاری یہ بات کامیاب ہوگی یہ وہی قرآن کریم کے الفاظ میں ہے کہ ان مساکن کے اندر کامیاب ہوگی۔ مساکن تو ہوم لینڈز کو کہتے ہیں۔ یہ مدینے کی زندگی ہے جہاں یہ اپنے گھر بار چھوڑ کر مکے سے آ گئے۔ یہاں آنے کے بعد آج کے الفاظ میں کہیے کہ یہ پناہ گزینوں کی زندگی ہے یہ مدنی جو زندگی تھی یہ بہت بیچارگی کی زندگی تھی۔ یہ لوگ جو مدینے والے انصار تھے' جو کچھ وہاں تھا' اس کو بانٹ کے' ان کے اندر تقسیم کیا' وہاں یہ کہا جا رہا ہے۔ پہلی چیز قرآن کریم نے کہی ہے کہ خدا تمہاری تقویت پہنچائے گا' تمہیں طیب مساکن دے گا پھر ایسے مساکن ملے۔

عزیزانِ من! تاریخ شاہد ہے کہ دس لاکھ مربع میل کا رقبہ تو نبی اکرمؐ کے زیرِ نگیں تھا۔ حضرتِ عمرؓ کے زمانے میں بائیس لاکھ تک

یہ پہنچ چکا ہوا تھا۔اس زمانے میں یہ کچھ کم بات نہیں ہے۔جب میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ ٹرانسپورٹ کا کوئی ذریعہ اونٹ اور گھوڑے کے سوا تھا ہی نہیں' صحراؤں کو عبور کر کے جانا پڑتا تھا' اس زمانے میں یہ مساکن طیبہ ملے۔وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا (61:13)۔یہیں یہ مساکن نہیں مل جائیں گے کہ رہنے سہنے کی جگہ مل جائے گی۔ بلکہ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (61:13)۔ خدا کے قانون کی تقویت اور دروازے کھل جائیں گے' تمہارے ہاں فتوحات کے اور دوسرے مساکن کے اور دوسری زمینوں کے دروازے کھل گئے۔ایران اور روم اور مصر وغیرہ کے علاقے ملے۔کہاں کہاں تک پہنچ گئے تھے یہ لوگ جو تھے۔کہا کہ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (61:13) یہ بشارت تھی جو مومنین کو دی گئی۔

## خدا تعالیٰ انسانوں کی دنیا میں اپنے پروگرام کی تکمیل انسانوں کے ہاتھوں مکمل کرواتا ہے

کہا ہے کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ(61:14)۔کیا بات ہے! كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ(61:14) اے جماعتِ مومنین! اٹھو' خدا کے مددگار بن جاؤ' خدا کے مددگار یعنی اس کو ضرورت ہے تمہاری مدد کی لیکن وہ تو اپنے پروگرام اس دنیا میں انسانوں کے ہاتھوں سے کامیاب کراتا ہے۔کہا کہ ہمارا پروگرام ہے' ہم چاہتے ہیں کہ یہ کامیاب ہو۔اٹھو! ہماری مدد کرو۔اس کو ذرا کامیاب کر دیجیے کتنا بڑا مقام انسان کو دیتا ہے خدا! کہ اپنے پروگرام کی تکمیل کے لیے اس کی اعانت اور اس کی مدد کا یوں کہیے کہ محتاج ہوتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ تم اٹھو۔یہ اٹھیں تو وہ کامیاب ہوتا ہے۔کہا کہ كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ (61:14)۔حضرت عیسیٰؑ کی حیاتِ طیبہ کے اوپر میری کتاب ہے۔اس میں میں نے لکھا ہے کہ یہ حواری بڑے انقلابی انسان تھے اور بہت بڑا انقلاب برپا کیا تھا۔

## انجیل کے برعکس قرآن حکیم میں حضرت عیسیٰ کے حواریوں کا کردار

قرآن حکیم کی عظمت اور کشادہ ظرفی ملاحظہ فرمائیں۔انجیلیں یہ کہتی ہیں کہ حضرتِ عیسیٰؑ کے بارہ حواری تھے' ساتھی تھے' وہ سارے بارہ ہی تھے۔انجیل یہ کہہ رہی ہے کہ ان میں سے ایک نے تو مخبری کر کے انہیں دشمن کے ہاتھوں تیس روپے کے عوض بیچ دیا اور وہ گرفتار کر کے لے گئے اور باقی گیارہ بھاگ گئے۔یہ خود حضرتِ عیسیٰؑ کے حواریوں کی مثال عیسائی پیش کر رہے ہیں جن کو وہ اپنے کرسچن [1] بتا رہے ہیں کہ یہ ''رسولوں کے اعمال'' میں ہے۔یہ انجیل کی ایک کتاب کا نام ہے اور اعمال ان کے یہ بتا رہے ہیں

---

[1] انجیل کی رو سے ان کا نام ''کرسچن'' پہلے پہل 43ء میں رکھا گیا (اعمال 11/26) لیکن انسائیکلو پیڈیا آف ریلجس نالج میں لفظ ''کرسچن'' کے تحت لکھا کہ یہ ان کا نام 65ء میں رکھا گیا اور رکھا بھی ان کے دشمنوں نے از راہ طعن و تعریض۔انہیں ''کرشچن'' یعنی تیل اور چربی مل کر گندے رہنے والے کہا کرتے تھے۔Christ کے معنی تیل یا چربی سے مسح کرنے والے Anointed کے ہیں۔یہ یونانی لفظ Creaser کے مترادف ہے (پرویزؒ: مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) لاہور' 1996ء ص۔38 کا فٹ نوٹ 1)۔

اورقرآنِ کریم ملاحظہ فرماؤ کہ وہ عیسائی اس کی اتنی مخالفت کر رہے ہیں۔ قرآنِ کریم یہ کہہ رہا ہے کہ حضرتِ عیسیٰؑ کے حواری تو اتنے بڑے انقلابی تھے کہ حضرتِ عیسیٰؑ نے ان سے کہا کہ کون ہے جو اس مہم میں میری مدد کرتا ہے بلکہ خدا کی مدد کرتا ہے۔ کہا کہ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ (61:14)۔ ہم مددگار بنیں گے۔ وہ اپنے ہاں کے ان رسولوں کی حواریوں کی وہ سیرت پیش کر رہے ہیں۔ عیسائیوں کی انجیل یہ پیش کر رہی [1] ہے اور یہ عیسائی مخالفت کر رہے ہیں' قرآنِ کریم حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواریوں کا اعتراف کر رہا ہے۔ یہ ہے صداقت' عزیزانِ من! کہ میرٹ کی چیز دشمن کے اندر بھی ہو تو اس کا اعتراف کرو۔ یہ انصاری کہا ہے۔ ان حواریوں نے یہ کہا کہ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ (61:14)۔ ہم نظامِ خداوندی کے قیام میں خدا کے رفیق اور مددگار بنتے ہیں۔ ان کی ان کوششوں کا نتیجہ یہ تھا کہ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَ كَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ (61:14) [2]۔

## یہودیوں اور عیسائیوں کی سخت باہمی مخالفت کے باوجود مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لیے گٹھ جوڑ کی تاریخ

چنانچہ کہا ہے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ تو حضرتِ عیسیٰؑ پہ ایمان لے آیا' دوسرے نے مخالفت کی۔ یہ یہودی تھے' وہ عیسائی تھے۔ کہا کہ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ (60:14)۔ تو اس کے بعد تاریخ بتا دے گی کہ جو حضرتِ عیسیٰؑ پر ایمان لائے تھے عیسائی' ان کو یہودیوں پر کتنی بڑی کامیابیاں حاصل ہوئیں! یہ یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان اتنا ٹکراؤ ان کے ہاں ہوتا چلا آ رہا ہے کہ یہ مسلسل جنگوں کے اندر رہے تھے۔ یہ اب ہے جو اسرائیل کی حکومت قائم کی ہے۔ اس وقت ان کو یہ خیال آیا کہ یہ بات تو غلط ہے' آپس میں سمجھوتہ کرنا چاہیے۔ کاہے کے لیے کرنا چاہیے؟ کہا کہ مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لیے۔ اس سمجھوتے کے لیے آپ حیران ہونگے کہ پہلے انہوں نے اپنی تاریخ کو بدلا' انجیل کو بدلا' اس میں یہ ہے کہ یہ یہودی بنی اسرائیل تھے' جنہوں نے حضرتِ عیسیٰؑ کو گرفتار کرایا تھا اور ان کو صلیب پہ چڑھانے کا موجب یہ تھے۔ یہ عیسائی ان کو حضرتِ عیسیٰؑ کا قاتل کہتے تھے' اتنی سخت مخاصمت تھی آپس میں۔ انہوں نے تاریخ بدلی کہ یہ مخاصمت نہیں ہے انہوں نے صلیب کا فیصلہ نہیں کرایا تھا' رومن نے کیا تھا۔ انجیل بدلی۔ حیرت ہے۔ میں نے کہا ہے کہ اپنے ابتدائی زمانے میں' ہر سال یہ کرسمس کے موقع پر حضرتِ عیسیٰؑ کی فلم دکھایا کرتے تھے۔ یہ عیسائیوں کی طرف سے آئی ہوئی ہوتی تھی۔ یہ آج سے سمجھ لیجیے کہ کوئی پچاس ساٹھ سال پہلے کی بات میں کر رہا ہوں۔ اب تو میں (80) اسی سال کا ہوں۔ یہ فلم آیا کرتی تھی، اس میں یہ سارا سین تھا کہ یہودیوں نے کس طرح سے ان کو گرفتار کر یا۔ اس میں یہ ہوا کرتا تھا۔ اس کے بعد میں نے پھر وہ فلم دیکھی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اس کے اندر یہودی آتا ہی کوئی نہیں

---

[1] یہ حواری بھاگ گئے اور ایک نے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مخبری کر کے تیس روپے کے عوض بیچ دیا۔

[2] بنی اسرائیل کا ایک گروہ اس نظام کی صداقت پر ایمان لے آیا لیکن دوسرا گروہ اس کا مخالف ہو گیا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1312)۔

ہے' رومن نے یہ کیا تھا جو کچھ کہہ رہے ہیں صاحب! یہ اس وقت اس مصلحت کی بناء پر صلح ہوئی ورنہ آپس میں ان کی مخاصمت اتنی چلی آرہی تھی اور پھر یہ عیسائی اتنے غالب رہے تھے کہ یہ جو Wandering Jews تھے' جس کو کہیں ٹھکانہ نہیں تھا' چھت نہیں تھی' عیسائیوں کے ہاتھوں یہ ہوا تھا' مسلمانوں کے ہاتھوں تو نہیں' مسلمانوں کے زمانے میں تو ان کو امن دیا گیا' پناہ دی گئی' سلامتی کی ضمانت دی گئی۔ اب وہ اپنی کرتوتوں سے باز نہ آئے تو ان کے خلاف یہ کچھ کرنا پڑا ورنہ یہ یہودی جو راندہ درگاہ ہوئے ہیں یہ سارے عیسائیوں کے ہاتھوں ہوئے تھے۔ آج عیسائی اور یہ یہودی ایک ہیں اور پھر کس کے لیے ایک ہیں؟ یہ ہے ایک سوال!

**مجھے تو گلہ تجھ سے ہے عیسائیوں سے یہودیوں سے نہیں**

عزیزانِ من! یہ مسلمانوں کی مخالفت کے لیے ہے' جنہوں نے نہ صلیب میں حصہ لیا۔ ان کے حواریوں کی وہ اس طرح سے تعریف کر رہا ہے عیسائیوں کے متعلق یہ کہہ رہا ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کا جب قرآن کریم میں تقابل آتا ہے تو اس میں قرآن کریم کہتا ہے کہ عیسائیوں کے اندر وہ لوگ ہیں جن کے دل بڑے نرم ہیں اور وہ اچھے آدمی بھی ہیں لیکن وہ سیاست یہ ہے۔ وہ عیسائی اور یہودی دونوں مسلمانوں کی تخریب کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں لیکن اس کا ہمیں گلہ کیا! ٹھیک ہے ان کی مصالحت یہ ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ہم مطلع کر کے' ان کو گالیاں دے کے' کامیابی حاصل کرلیں گے۔ یہی اس وقت ہوا تھا کہ یہودیوں نے عیسائیوں کی مخالفت کی۔ یہی اب ہوگا۔ خود اس قوم مخالفین کے اندر سے ایک ایسی جماعت نکل آئے گی جو اس دین کے مخالفین کا مقابلہ کر کے خدا کے پروگرام کو کامیاب بنائے گی۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑے ہو جائے کوئی تمہارا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔

سورۃ الصف ختم ہوگئی' عزیزانِ من! آئندہ درس میں ہم سورۃ الجمعہ لیں گے۔ یہ 62 ویں سورۃ ہے۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ** (2:127)

❀......❀......❀

# سورة الجمعة

# پہلا باب: سورۃ الجمعۃ (آیات 1 تا 8)

**بسم اللہ الرحمن الرحیم**

عزیزانِ من! آج جولائی 1983ء کی 29 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الجمعۃ سے ہوتا ہے۔ یہ 62 ویں سورۃ کی ابتدائی آیت ہے۔ کہا ہے کہ یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ الْمَلِکِ الْقُدُّوسِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ (62:1) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ بھی ہے، جو فرائض اس کے ذمے عائد کیے گئے ہیں، ان کی بجا آوری کے لیے وہ سرگرداں رہتی ہے۔ یہ اس خدا کی طرف سے عائد کردہ ہیں جس کی تین چار صفات یہاں بیان کی گئی ہیں: اَلْمَلِکِ الْقُدُّوسِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ (62:1) ان سے بھی زیادہ اور تفصیلی صفاتِ خداوندی سورۃ الحشر کی آخری آیات [1] میں آ گئی تھیں۔ وہ چند درس پہلے ہمارے سامنے گزر گئی تھیں: مَلِکِ الْقُدُّوسِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ (62:1) یہاں ان صفات کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد یہ تو خارجی کائنات کے متعلق ہوا، انسانوں کی دنیا کے متعلق بھی اس نے اسی طرح سے قوانین مقرر کیے اور ان کے ذمے بھی کچھ فرائض عائد کیے لیکن اس کا طریق مختلف تھا۔ وہ وحی ایک خاص شخصیت کی وساطت سے، جسے رسول کہا جاتا تھا، دوسرے انسانوں تک پہنچا تا تھا۔

---

[1] ان کے لیے دیکھیے سورۃ الحشر کا دوسرا باب اور تیسرا باب۔ یہ دروس جون 1983 کی 17 اور 24 تواریخ کو ارزاں فرمائے گئے تھے۔

## عرب وہ پہلی قوم تھی جس کی طرف نبی اکرمؐ کی ذات مبعوث ہوئی

اس رسول کے متعلق کہا کہ هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ(62:2) خدا وہ ہے کہ جس نے یہ پہلی قوم، جس کی طرف حضورؐ مبعوث ہوئے، وہ عرب تھے، وہ ان پڑھ قوم تھی اور امی کے معنی ہوتے ہیں: ''وہ بھی کہ جن کی طرف اس سے پہلے کوئی کتاب یا رسول نہ آیا ہو''، مجموعی طور پر وہ ان پڑھ تھے اگرچہ ان میں کچھ لکھے پڑھے تو تھے لیکن بہت کم تھے۔ لیکن امی کے معنی یہاں یہی ہیں کہ جن کی طرف اس سے پہلے کوئی رسول نہیں آیا تھا تو وہ قرآنِ کریم میں دوسرے مقام پہ یہ کہا گیا ہے کہ ان کی طرف، ان عربوں کی طرف، اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں آئی تھی۔ اس اعتبار سے بھی ان کو امی کہا جاتا تھا۔ تو اس قوم کی طرف جن کی طرف پہلے کوئی کتاب نہیں آئی تھی، اس رسولؐ کو مبعوث فرمایا، اس رسولؐ کو انہی میں سے بھیجا گیا ہے۔

## ہر آنے والا نبی ہمیشہ اپنی قوم کا ہی فرد ہوتا تھا

ہر رسول کے متعلق یہ کہا کہ وہ جس قوم کی طرف آتا تھا، وہ اس قوم میں سے ہی ہوتا تھا، کوئی اجنبی، غیر، باہر سے آیا ہوا نہیں ہوتا تھا اور اسی قوم کی زبان میں ہوتا تھا۔ یہ بھی قرآن حمید کے اندر ہے۔ رسول کی تلقین تو مؤثر اسی صورت میں ہوسکتی ہے کہ وہ ان کا جانا پہچانا ہوا ہو اور جانا پہچانا تو ایسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ جب نبی اکرمؐ سے آپؐ کے اس دعوے کا انہوں نے ثبوت مانگا کہ وہ خدا کے رسول ہیں تو آپؐ نے ثبوت میں یہ کہا تھا کہ میں نے تمہارے اندر اس سے پہلے چالیس سال کی زندگی گزاری ہے، کیا تم اس زندگی سے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ یہ ایک جھوٹے کی زندگی ہے یا ایک سچے کی زندگی ہے؟ تو وہ انہی میں سے جو ایک رسول کو بھیجا تو اس کی کیفیت یہ تھی کہ وہ قبل از نبوت کے زمانے میں بھی وہ انہی کے اندر تھا، وہ اس زمانے کے اس کی سیرت اور کردار سے واقف تھے اور اپنے دعوے کی صداقت میں، اپنے سچا ہونے کے ثبوت میں، وہ زندگی جوان میں گزاری گئی تھی بطور ثبوت پیش کی تو اس لیے انہی میں جو رسول ہے اس کا ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ وہ اس سے پہلے کی زندگی سے بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ سچا ہے یا یہ زندگی ایک جھوٹے کی ہوسکتی ہے۔ انہیں میں سے ایک رسول کو بھیجا۔

## مادے کے بنیادی مفہوم کے تحت نبی اور رسول کا فریضہ

یہ جو آگے رسول کے فرائض بتائے گئے ہیں کہ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ(62:2)۔ یہ جو يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ ہے وہ تو قرآن کریم کے احکام ہیں، قرآن کریم کی آیات ہیں، اپنی وحی کو دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ وہ اس کی ذات تک محدود نہیں رہتی۔ ضمناً یہ میں عرض کروں کہ اس کے بعد جو ہمارے ہاں یہ تصوف والوں نے

دعویٰ کرنا شروع کیا کہ انہیں بھی خدا کی طرف سے علم ملتا ہے تو یہ دونوں جو علم کی جہتیں تھیں' ان میں بین فرق یہ تھا کہ رسول کو خدا کی طرف سے جو وحی ملتی تھی' فریضہ تھا کہ وہ دوسروں تک اسے پہنچائے۔ کہا ہے کہ بَلِّغۡ مَآ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ (5:67) اور یَتۡلُوۡا عَلَیۡھِمۡ اٰیٰتِہٖ (62:2) اور ان تصوف والوں کے متعلق یہ چیز تھی کہ صاحب!

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تانہ چشی

یہ تو بھائی صاحب! ایک نشہ ہے۔ ہم تم لوگوں کو کیا سمجھائیں کہ نشہ کیا ہوتا ہے۔ اے تے جیہڑا پیندا اونوں ای پتہ لگدا اے جناب! (یہ تو جو پیتا ہے اُسے ہی پتہ چلتا ہے جناب!) اسی لیے ان کا صدری علم کہلاتا تھا کہ جو رسولؐ ہے' وہ اس کو جو خدا کی طرف سے وحی ملتی تھی اس کا فریضہ ہوتا تھا کہ وہ اسے دوسروں تک پہنچائے۔ وہ چھپا کے کچھ نہیں رکھ سکتا تھا۔ کہا ہے کہ یَتۡلُوۡا عَلَیۡھِمۡ اٰیٰتِہٖ (62:2) یہاں تک تو ہوا کہ وہ اسے پہنچائے۔ اب آگے ہیں جو فرائض عائد ہوتے ہیں۔ اب یہاں آئی حیثیت۔ وہ میں کہا کرتا ہوں کہ مادے یا بنیادی معنی کے اعتبار سے بھی اگر لیں تو نبی کے معنی ہو جائیں گے "جس کو خدا کی طرف سے وحی ملے" اور رسول کے معنی ہو جائیں گے "جو پھر اس وحی کو دوسروں تک پہنچائے ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی وہ نظام قائم کرے کہ جو اس وحی کی رو سے قائم کرنا ہے۔" یہ جو رسول اللہؐ کے فرائض ہیں یہ ہیں ان کے فرائض رسالت۔ آپ کہہ لیجیے نبوت تو حضورؐ کی ذات تک ختم ہوگئی یہ جو اگلا حصہ ہے یہ آپؐ کی زندگی تک محدود نہیں تھا بلکہ امت کو قرآن کریم کا وارث قرار دیا گیا۔ یہی فرائض جو تھے پھر وہ آگے عائد ہوئے امت کے اوپر بھی' یہاں بہرحال ان فرائض کا ذکر ہے۔ قرآن حکیم پیش کیا یُعَلِّمُھُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ وَ یُزَکِّیۡھِمۡ (2:129)

## فرقہ اہل قرآن کی سوچ جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں

وہ جو ہمارے ہاں کہا کرتے ہیں کہ اہل قرآن ایک فرقہ ہے جن کا معاذ اللہ کہنا ہے کہ رسولؐ کی حیثیت تو ایک نامہ بر کی' پوسٹ مین کی تھی' جو چٹھی کو Deliver کر دیتا تھا اور بس اس کے بعد پھر وہ بات ختم ہو جاتی ہے۔ یہ بات غلط ہے۔ یہ اتنی بات نہیں تھی۔

## رسول کا سب سے اہم فریضہ کتاب وحکمت کے ذریعے قلب ونگاہ کی تبدیلی سے تغیر نفس پیدا کرنا ہوتا ہے

رسولؐ صرف وحی کے پیغام کو اس طرح پہنچا ہی نہیں دیتا تھا اس پر آگے فرائض بھی عائد ہوتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ وَیُعَلِّمُھُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ (62:2)۔ تم تو ایک طرف' خدا بھی اس قوم کی حالت میں تغیر نہیں کرتا جب تک کہ وہ اپنے اندر ایک تغیر نہ پیدا کرے یعنی تغیر نفس کے بغیر وہ تغیر قوم نہیں کرتا: اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا

بِاَنۡفُسِهِمۡ (13:11) یہ بڑی اہم چیز ہے۔

## غور وفکر کے بغیر قانون کا احترام پیدا ہی نہیں ہوسکتا

یہ چیزیں پہلے بھی آچکی ہیں جب پھر وقت آتا ہے تو میں دہراتا ہوں کہ پہلا قدم یہ ہے کہ اس قوم کے قلب ونگاہ میں صحیح تبدیلی پیدا ہو جائے۔ تبدیلی کس چیز سے پیدا ہوتی ہے؟ یہ تبدیلی پیدا ہوتی ہے تعلیم سے' تربیت سے' اور یہ اس رسول کا سب سے پہلے فریضہ ہو گیا کہ وہ اس فریضے کو ادا کرے۔ کہا ہے کہ یُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ (62:2) کتاب قوانین کو کہتے ہیں اور حکمت ہوتی ہے کہ ان قوانین کی غرض وغایت اور مقصد' اس سے یہ کرو گے تو کیا ہوگا کیوں یہ قانون دیا گیا ہے؟ اس کے اتباع کے اندر تمہارا کیا فائدہ ہے؟ اس سے انسانیت میں کیا تبدیلی آئے گی؟ یہ تمام چیزیں حکمت کے اندر آجاتی ہیں۔ یہ بڑا ہی جامع لفظ ہے۔ اس کو آپ عقل وبصیرت' علم وفکر' تدبر وشعور' Wisdom یہ تمام چیزیں کہہ لیجیے۔ ان میں Reasons، اور Rationality بڑی اہم چیز ہوگئی۔ یہ جو رسول کے فرائض ہیں یہ اتنے اہم ہیں کہ قرآن حکیم نے متعدد مقامات پر انہی الفاظ میں ان کا ذکر کیا ہے۔ دو ایک حوالے لکھ لیجیے کہ اس میں بڑی اہمیت ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیات 129 اور 151' سورۃ آل عمران کی آیت 163 میں یہی الفاظ ہیں اور چوتھی جگہ یہ سورۃ الجمعۃ کے اندر تعلیم کتاب وحکمت ہے۔ کتاب تو قوانین کو کہتے ہیں' قانون کو سمجھانا اور یہ سمجھانا کہ ان کی غرض وغایت کیا ہے' کیوں یہ قانون دیئے گئے ہیں؟ عقل وفکر کی رو سے ان کو سمجھایا جائے۔ قانون کا احترام پیدا ہی اس صورت میں ہوتا ہے جب اس کی علت' مقصد' غایت سمجھا دی جائے اور وہ مطمئن ہو جائے کہ ہاں بات صحیح ہے۔ اس قانون سے یہ ہوگا تو مجھے اس کی پابندی کرنی چاہیے۔ یہ جو قانون کسی کے اوپر تھوپ دیئے جاتے ہیں اسی لیے ان سے سرکشی برتی جاتی ہے' خلاف ورزی کی جاتی ہے کہ اس سے قلب ودماغ مطمئن نہیں ہوتا۔ یہ جتنی بھی آپ کے ہاں ملوکیت' شہنشاہیت' آمریت ہے' انہیں کیوں قرآن حمید نے ناجائز قرار دیا' غلط قرار دیا ہے اس لیے کہ قانون تو Enforce (نافذ) کرتے ہیں' قوانین کی وہاں حکمت نہیں بیان ہوتی کہ یہ کیوں نافذ کیا جاتا ہے۔ رسول کا فریضہ یہ بتایا کہ وہ قوانین کی تعلیم دے گا اور یہ پھر مطمئن کرائے گا ان کو فکر وتدبر وعلم وبصیرت کی رو سے' Arguments کے ذریعے سے' Reasons کے ذریعے سے کہ یہ قانون کیوں دیا گیا ہے' تمہارا اس قانون کے نافذ کرنے سے فائدہ کیا ہے یا اس قانون کے اتباع کرنے سے کیا ہوگا اور وہ پھر ایسا ہی ہو۔ قرآن کریم میں یہ ہے کہ مومن ہونے کی شرط یہ ہو جاتی ہے کہ یہ معاملہ تمہارے پاس لائیں' جب تم اس میں فیصلہ کرو تو ثُمَّ لَا يَجِدُوۡا فِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيۡتَ وَيُسَلِّمُوۡا تَسۡلِيۡمًا (4:65) تو جو تُو قانون کے مطابق فیصلہ دے یہ اپنے دل میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کریں کیونکہ انہیں تو معلوم تھا' وہ مطمئن ہو چکے ہوئے تھے کہ قانون کے اتباع سے ہمارا ہی فائدہ ہے اور یہ یقین تھا کہ جو رسولؐ کا فیصلہ ہے وہ قانونِ خداوندی

کے مطابق ہے تو مطمئن تو ہو ہی جائیں گے۔ پھر وہ قانون کی حکمت بیان کرنا اتنی عظیم چیز قرآن کریم بتا گیا ہے کہ یہ جتنے بھی کہتے ہیں کہ صاحب! حکومت کی Form (فارم) کیا ہوگی' شکل کیا ہوگی' جزئیات کیا ہوں گی' ارے یہ ساری چیزیں بعد کی ہیں۔

## اسلامی اور غیر اسلامی حکومت میں بنیادی فرق قرآنی قوانین کا نفاذ ہے

دو ہی تو چیزیں ہیں جسے آپ اسلامی نظام یا اسلامی حکومت کہتے ہیں۔ وہ یہ ہیں: مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ (5:44) کفر اور اسلام میں امتیاز یہ ہے کہ جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کی جائے' فیصلہ کیا جائے' وہ اسلامی ہے' جو اس کے خلاف جائے گا' وہ کفر ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ امت کو مطمئن کیا جائے یہ جو کچھ قانون نافذ کیا جا رہا ہے اس کی غایت کیا ہے' اس میں تمہاری بہتری کیا ہے' اس کی منفعت کیا ہے اور امت ہی کو نہیں' بلکہ پوری جو انسانیت ہے' اس کو مطمئن کیا جائے کہ اس قانون کی غایت یہ ہے اور اس قانون کی منفعت بخشیاں یہ ہیں مطمئن کیا جائے تو کتاب کے ساتھ حکمت کی جو تعلیم ہے یہ فریضہ نبوت ہے۔

## تعلیم اور حکمت دو الگ الگ شعبے ہیں' تعلیم ذہن کو مطمئن کرتی ہے جب کہ حکمت قلب کو جلا بخشتی ہے

اب آپ کے ہاں جو حکمت ہے اس پر پھر میں بعد میں آؤں گا۔ اس طرف یہ تو تعلیم ہے۔ تعلیم کا تعلق Intellect سے' دماغ سے' ہوتا ہے۔ یہ ذہنی چیز ہے۔ بڑے بڑے پڑھے لکھے دانشور Highly Educated, Qualified آپ کو ملیں گے۔ ان کا کردار دیکھیے تو اتنا گھناؤنا ہوتا ہے کہ صاحب! اتنا کچھ پڑھ لکھنے کا فائدہ کیا ہوا؟ وہ اس واسطے یہ ہوا کہ انہوں نے دو حصے کیے: ایک ہے دماغ کا مطمئن ہو جانا۔ یہ تو فلسفے سے ہو جاتا ہے' خالص عقل سے ہو جاتا ہے۔ اب اگلی جو چیز ہے کہ صاحب! اس کے کردار پہ اس کا کچھ بھی اثر نہیں' وہ ہے جسے اصطلاح میں ہمارے ہاں قلب کا تغیر کہتے ہیں۔ وہ اگلی چیز ہے۔ وہ پہلی چیز جو ذہنی یا دماغی یا Intellectual Satisfaction ہے' وہ ذہن کو مطمئن کر دیتی ہے۔ جو اگلی چیز ہے کہ وہ قلب کے اندر تبدیلی آئے' یہ تربیت سے آتی ہے۔ یہ ہے جو اگلی چیز بھی رسول کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کی تربیت اس قسم کی کرے کہ وہ دماغی طور پہ مطمئن ہوں کہ جو خدا کے احکام ہیں' وہ کس طرح سے ہمارے لیے' انسانیت کے لیے منفعت بخش ہیں' اس کے بعد سیرت و کردار کی تربیت اس قسم کی ہو جائے کہ پھر ان قوانین کا احترام اور اتباع کا جذبہ ان کے قلب کی گہرائیوں سے ابھرے' یہ نہ ہو کہ پولیس والا کھڑا ہے یا نہیں؟

## نبی اکرمؐ کی طرف سے عرب جیسی قوم کا بت امت مسلمہ میں بدل جانے کا راز قرآن حکیم کے لفظ حکمت سے آگہی میں پوشیدہ ہیں

یہ فریضہ تھا رسالت کا۔ ہمارے ہاں یہ چیز دیکھتے ہیں کہ مثلاً جاہلیت عرب ہے' یہی لوگ تھے جو جاہلیت عرب میں بعد میں

ایمان لا کے پھر حضورؐ کی امت مسلمہ بنے تھے‘ جاہلیت عرب کی‘ وہ جو ساری دنیا کی برائیاں ہیں‘ وہ ہمارے ہاں گنا دی جاتی ہیں اور واقعی ان کے اندر بہت سے عیوب اور ضمائم اور برائیاں تھیں۔ یہ بڑی بڑی تھیں اور اہم لوگ ہی اسلام لاتے ہیں تو اس کے بعد ہمارے ہاں پھر ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ صاحب! یہ دیکھیے! کہ ان کے ہاں یہ خوبیاں‘ یہ حسنات‘ یہ سارا کچھ ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی نہیں بتاتا کہ یہ کچھ کیسے ہو گیا تو ذہنوں میں یہ ہے کہ انہوں نے ادھر کلمہ پڑھا اُدھر سے ان کے لب میں تبدیلی پیدا ہو گئی‘ وہ پیتل تھا ذرا سا‘ انہوں نے بھٹی میں دیا‘ سونا بن گیا۔ یہ یوں نہیں بن گئے تھے۔ یہ تعلیم کتاب وحکمت وتزکیہ رسالتؐ کی رو سے ایسے بنے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان میں ان چیزوں کی صلاحیت تو تھی لیکن انہیں یہ بنا دینا ہے کہ یہ تعلیم وتربیت رسالتؐ کی وجہ سے ایسا ہوا۔ یہ ہے وہ فریضہ جو ہمارے ہاں ہے کہ رسول اللہؐ نے آرزو یا خدا سے دعا کی تھی کہ یا اللہ! مکے کی زندگی میں جب مصائب سے پوری طرح گھرے ہوئے تھے کہ یا اللہ! ابوجہل یا عمر ابن خطاب میں سے کسی ایک کو اسلام لانے کی توفیق عطا فرما دے‘ یہ میرے ساتھیوں میں سے ہو جائیں تو جو بڑا جوہر تھا وہ ان کے اندر ضائع ہو رہا تھا وہ اِدھر آ گیا۔

## حضرت عمر فاروقؓ کی سوچ میں اس قدر تغیر کے پیدا ہونے کی وجہ جواز

وہ جوہر غلط سمت کے اندر ضائع ہو رہا تھا تو وہی عمر تلوار ہاتھ میں لیے ہوئے پھر رہا تھا۔ ابوجہل ہر وقت غیبتیں پیدا کر رہا تھا تو اس میں بھی بڑی صلاحیت تھی۔ ان صلاحیتوں کو دیکھ کر حضورؐ نے یہ کہا کہ ان میں جوہر قابل ہیں‘ یہ سونا مٹی میں ملا ہوا ہے اور میں تو کہتا ہوں کہ کتنی بڑی عظمت ہے ان کی‘ خود حضرتِ عمرؓ کی کہہ لیجیے۔ اگر یہ چیز ہے کہ رسول اللہؐ دعا کرتے ہیں خدا سے کہ یا اللہ! یہ مل جائے مجھے کسی طرح سے‘ اب جو وہ ملا ہے تو عمر تو وہی تھا‘ اس کی جو پہلی زندگی ہے‘ وہ بھی ہمارے سامنے ہے‘ پھر وہ کندن کیسے ہو گیا؟ تعلیم کتاب وحکمت ویزکی سے۔ یوں یہ امت بنی تھی۔ یہ جو فریضہ تھا رسالت کا‘ یہ آگے جاری رہنا چاہیے تھا کیونکہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ ہم نے پھر رسولؐ کی وفات کے بعد اس امت کو وارث بنایا اس کتاب کا‘ تو نبوت تو نہیں مل سکتی تھی‘ اب وحی تو کسی کو آ نہیں سکتی تھی‘ وحی محفوظ مکمل شکل میں موجود تھی امت کے پاس‘ اگلا حصہ جو رسالت کا حصہ تھا‘ فریضہ اس امت کا تھا۔ جب تک یہ فریضہ جاری رہا‘ وہ امت امتِ مسلمہ‘ وہ اسلام دین کی شکل کے اندر قائم رہا۔ اس کے جتنے بھی خوشگوار نتائج تھے‘ آج بھی تاریخ عالم کے اندر وہ درخشندہ موتیوں کی طرح چمک رہے ہیں۔ ساری دنیا ان کو (Quote) کوٹ کرتی ہے۔

## ہزار سال سے خود فریبی میں مبتلا رہنے کی وجہ جواز دین کو مذہب میں تبدیل کرنا ہے مثلاً عرش کی مثال

ہم بھی اس حالت میں‘ جس میں اب ہم ہیں‘ ہمارا فریضہ یہ رہ گیا ہے کہ وہ اس دور کے جتنے خوشگوار نتائج تھے‘ بس دنیا کے سامنے وہ پیش کرتے چلے جاتے ہیں اور اس کے بعد خود فریبی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ہم اپنے ہی متعلق یہ کہہ رہے ہیں کہ صاحب!

ہم اتنے عظیم تھے، ہمارا اسلام اتنا عظیم تھا۔ یہ تھی جب تک یہ کیفیت رہی، پھر چھوڑ دیجیے کہ کون کون سے وہ اسباب اور عناصر پیدا ہوئے جس سے یہ کیفیت نہ رہی۔ ان کو میں نے اپنے ہاں کتابوں میں درج کیا ہے۔ یہ تھا جو کرنا تھا۔ اس کے بعد جب یہ دین مذہب میں تبدیل ہوا تو پھر جو تبدیلیاں آئیں، پوچھیے نہیں۔ کتاب کی تعلیم، وہ تفاصیل جو اس دور کی ذہنی سطح کے مطابق ہمارے آپ جیسے انسانوں نے مرتب کی تھیں، وہ آپ کے ہاں کتاب کے سمجھانے کی حرفِ آخر ہو گئیں، وہ قرآن حکیم کی تفسیر ہونے لگ گئیں، خواہ احادیث کی کتابوں میں تھیں یا آپ کے ہاں بعد میں فقہ کے اندر آئیں، تو وہ کتاب تو چلی گئی، اس کا بدل آ گیا۔

حدیثوں کے متعلق تو کھلے بندوں کہہ ہی دیا کہ وہ مثلہ معہ قرآن کے ساتھ ہیں۔ چلیے، بھائی! فقہ کے متعلق ان کے ہاں ایک بہت بڑے امام ہیں یا ان کا خود عقیدہ ہے کہ فقہ اور قرآن کریم اور حدیث کے کسی حکم کے اندر تضاد پایا جائے تو قراان حکیم کی آیت کی پہلے تو تاویل ایسی کرو کہ وہ فقہ کے حکم کے مطابق ہو جائے اور اگر یہ دیکھو کہ ایسا ممکن نہیں ہے تو سمجھو کہ قرآن حکیم کی آیت منسوخ ہے۔ کتاب کا تو یہ حشر ہوا۔ جو پھر اس کے معنی یا اس کے حقائق اور معارف تھے وہ سمجھائے گئے۔ ان کے متعلق تو میں ہر بار کوئی نہ کوئی آپ کو مثال دیتا ہی ہوں مثلاً عرشِ خداوندی کی مثال۔ اس کی تفصیل آپ کو معلوم ہے کہ وہ عرش پانی میں تھا اور یہ کہ وہ یہاں سے چھ آسمان ہیں، ہر آسمان کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے، ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے، سمندر کی گہرائی بھی چھ سو میل یا سات سو میل کے فاصلے کی ہے۔ اس سمندر کے اندر چھ پہاڑی بکرے کھڑے ہیں، سمندر کا پانی ان کے گھٹنوں تک آتا ہے، ان کے سینگوں کے اوپر خدا کا عرش ہے۔ ایک روایت تو یہیں تک ہی ہے اور ایک اور روایت یہ ہے کہ اتنا بڑا وہ تخت ہے کہ وہ اس کائنات کو محیط ہے لیکن کیفیت خدا کی رحمت کی یہ ہے کہ جب خدا اس کے اوپر بیٹھتا ہے تو وہ عرش اس طرح سے چرچراتا ہے جیسے اونٹ کے اوپر کوئی سوار تو اس کا جو کجاوہ ہے، اس میں سے آواز نکلتی ہے۔

## صدیوں سے ہمارے ہاں قرآنِ حکیم تعلیم براہِ راست ناپید ہے

یہ تو آپ کے ہاں کتاب اور حکمت آ گئی تو اس کے بعد عقل کو تو انہوں نے طلاق ہی دے دیا۔ شریعت کے معاملے میں عقل علم ہے ہی نہیں، اس کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ عقل سے کام لینے والا جو ہے وہ دہریہ ہے، ابلیسی ہے، زندیق ہے۔ کتاب کی حکمت تو چلی گئی۔ یہ حشر ہوا کہ کتاب براہِ راست آپ کے ہاں سے بالکل مفقود ہے۔ ان تفاسیر کی رو سے پڑھیے، احادیث کی رو سے پڑھیے، حکمت جو تھی جس کے معنی Wisdom یا عقل و علم اور بصیرت تھا، وہ تو شریعت سے خارج کر دیا گیا اور حکمت کی جگہ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے ہاں ایک اصطلاح حکمت عملی آئی۔ حکمت عملی کا تقاضا یہ ہے کہ نظریہ ضرورت یوں مصلحت ہو۔ یہ رہ گیا۔ آگے آیا **یــزکیھم**. یہ بڑی عظیم چیز ہے۔ یہ تزکیہ یا زکیٰ یا زکوٰۃ۔ اس کے معنی ہیں نشو و نما دینا اور یہی ہے اصل غایت تربیت کی یا تزکیہ کی۔

انسان کے اندر بہت سی صلاحیتیں ہوتی ہیں' بہت سی استعدادیں ہوتی ہیں' بہت سے جوہر ہوتے ہیں لیکن وہ Undeveloped (غیر نشوونما یافتہ) ہوتے ہیں ان صلاحیتوں کی Development اس طرح کرنا' ان کو نشوونما دینا ان کو جسے انگریزی میں Actuallize کر دینا کہتے ہیں وہ Potentiality ہوتی ہیں' Potential سے Actuallize کر دینا کہ وہ آپ کا کیریکٹر بن جائیں' آپ کا کردار بن جائیں' زندگی میں ان کی نمود ہونی شروع ہو جائے' آپ ان کو جسے کہتے ہیں Channelize کر دیں وہ بہت سی صلاحیتیں جو کھلی چھوڑ دی جائیں تو پانی سیلاب بن جاتا ہے' جو تباہیاں لاتا ہے' ایک ان کو دریا یا نہر کے ساحلوں کے اندر پابند کر دیا جائے تو وہ تعمیری نتائج پیدا کرتا ہے۔ یہ ہوتا ہے تزکیہ کا نتیجہ۔ تو کتاب تو آپ کی رہ گئی وہ تفاسیر' جو ابھی میں نے عرض کیا۔ حکمت جو ہے' وہ تو خارج از بلد ہو گئی۔ آپ کے شریعت کے معاملے میں عقل سے کام ہی نہیں لیا جا سکتا۔ آپ کو پتہ ہے کہ معتزلہ گالی ہے۔ تو پھر کیوں یہ گالی دی جاتی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ قرآن حکیم سمجھنے کے لیے عقل و بصیرت ضروری ہے' قرآن حکیم کو عقل و بصیرت کی رو سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ ان کا جرم تھا یہ معتزلہ کا لفظ ہی گالی ہو گیا اور مجھے تو جو گالیاں پڑتی ہیں وہ آپ کو معلوم ہے۔ ان میں ایک گالی یہ بھی ہے کہ یہ معتزلہ میں سے ہے کیونکہ یہ کہتا ہے کہ عقل سے بھی کام لو۔

فقہ نے ایک مہم جاری کی تھی کہ جو پڑھیا لکھیا بندہ ہووے' اوناں نوں مار دیو' مساوات پیدا کریو کہ بھئی! اپنے اچ اے کر لو کہ کوئی پڑھا لکھا نہ مل جائے۔ اب ہوتا یہ تھا کہ ذرا گاؤں کا ایک نوجوان دیکھا کہ اس نے کچھ دھوئے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ کہنے لگا: اوئے ادھر آ۔ پڑھیا ہویاں ایں؟ کہنے لگا: جی نئیں' میں تے بالکل نئیں پڑھیا ہویا۔ کہنے لگا: لا دے ایہدی گردن۔ کہنے لگا: او کیوں؟ کہنے لگا: پڑھیاں ہویا نئیں تے تینوں کیوں پتہ ہیگا بالکل دا۔ توں معتزلہ ای آں۔ (جو پڑھا لکھا ہوا اسے مار دو اور اس طرح مساوات پیدا کر لو کہ بھئی! اپنے اندر یہ چیز پیدا کر لو کہ کوئی پڑھا لکھا مل جائے تو اسے قتل کر دو۔ اب ہوتا یہ تھا کہ جونہی گاؤں کا ایک نوجوان دیکھا کہ اس نے دھلے ہوئے کپڑے پہن رکھے ہیں تو پوچھا: ابے اِدھر آؤ۔ کیا تم پڑھے لکھے ہو؟ وہ کہنے لگا: جی نہیں' میں تو بالکل پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ وہ کہنے لگا: اس کی گردن اڑا دو۔ اس نے پوچھا: کیوں؟ وہ کہنے لگا: اگر پڑھے لکھے نہیں ہو تو تجھے ''بالکل'' کا کیسے پتہ چلا۔ تم معتزلہ ہی ہو)۔ وہ ''بالکل'' کیا جرم ہے؟ کہا کہ جی! یہ عقل کی بات کرتا ہے وہ آیت آگے آتی ہے جس کا میں نے ترجمہ کیا ہے۔ یہ کتاب کے ساتھ حشر ہوا' یہ حکمت کا حشر ہوا۔

## تصوف کی دنیا میں تزکیہ نفس کی پہچان ترک کرنے کی خواہش کو بھی ترک کر دینا ہوگا

عزیزانِ من! باقی رہ گیا تزکیہ' تو جو تزکیہ نفس ہے' وہ آپ کے ہاں پیروں کے ہاں' ہوتا ہے۔ اب آپ کے ہاں یہ جو ضربیں لگاتے ہیں تو معلوم نہیں' یہاں ہمارے ہاں' قریب ہی کوئی مسجد ہے۔ صبح کی نماز کے بعد پھر جو ضربیں لگانے کا عمل شروع ہوتا ہے'

پھر وہ ریاضتیں مراقبے چلّے جو بیس سال تک یہ نابکار [1] بھی کرتا رہا کہ یہ تزکیہ نفس ہوتا ہے۔ بھئی! وہ ہوتا کیسے ہے؟ کہا کہ نفس کو مار دینے سے ہوتا ہے۔ یعنی اونوں مار دین نال تزکیہ اوہدا ہوندا پیا اے (یعنی نفس Self کو ختم کر دینے سے تزکیہ ہوتا ہے)۔ اس نفس (Self) کا تو جنازہ نکل گیا۔ کہا کہ ترکِ دنیا ترکِ علائق، ترکِ لذائذ ترک حتیٰ کہ ترکِ ترک او یہ ترکِ ترک آپ حیران ہوں گے کہ یہ سب کچھ ہم نے پڑھا یہ سب ہم نے کچھ سیکھا کہا کہ کسی چیز کے ترک کرنے کی یہ خواہش ہے۔ بہرحال اس کو بھی ترک کر دینا چاہیے کڈا اوکھا کم ہے (یہ کتنا مشکل کام ہے!) اے تزکیہ نفس وہ یوں ہوگیا کہ نفس ہی مار دؤ سیاپا مکاؤ۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ اب یہ آ گیا آپ کے ہاں کا اسلام۔ کتاب ہوگئی طبری کی تفسیر۔ حکمت یہاں سے تو ختم ہوئی اور وہ ہوگئی حکمت عملی، جو تقاضائے مصلحت، ہو وہ کر گذرو۔ عقل و کفر کو دی طلاق۔ تزکیہ نفس کے معنی خانقاہیت ہوگئے کہ یہ یہاں اس کو نفس کشی ہوتی ہے۔ کہتے ہیں اور آپ کے ہاں یہ اسلام ہی نہیں، قرآن ہی نہیں، یہ مغز ماز ''قرآں مغز را برداشتیم [2] '' یہ ہے جو ہے، اس کا مغز تو ہم نے لے لیا۔ استخواں پیش سگاں انداختیم یہ جو باقی رہ جاتا ہے یہ قرآن، آپ کے ہاں یہ ہڈیاں ہیں، جو ہم نے کتوں کے آگے ڈال رکھی ہیں۔ اوخدارا! یہ قوم ہے کہ جو اس کی کتاب قرآن کریم کے متعلق یہ چیز بڑے فخر سے، پھر گا گا کر اس رومی کی مثنوی کو پڑھا جاتا ہے۔

## ہمارے ہاں دی جانے والی تعلیم ایجوکیشن نہیں بلکہ وہ انفارمیشن ہوتی ہے

میں کہہ یہ رہا تھا کہ پھر یہ فریضہ رسالت تھا۔ کہا ہے کہ **یَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ** (2:129) آہاہا! عزیزانِ من! جس تعلیم کا نتیجہ یہ **یزکیھم** نہیں، وہ تعلیم نہیں، وہ Education نہیں، وہ Literacy تو ہو سکتی ہے، خواندگی تو ہو سکتی ہے، اس میں لکھ پڑھت تو سکتا ہے لیکن یہ Education تو نہیں۔ یہ Education لفظی معنی نہیں ہیں اس کی ابتداء لیٹن سے ہے۔ Education یہاں Latin سے نکلا ہے: یہ کسی چیز کا اندر سے باہر آنا ہے۔ ہمارے ہاں تو Education [3] کا وہ نصاب بھی الٹا ہے کہ چند معلومات فراہم کر دی جاتی ہیں، اس کا نام ایجوکیشن ہوتا ہے۔ یہ ایجوکیشن نہیں ہے، یہ تو انفرامیشن ہے

---

1. یہ بابا جی کا اپنی ہی طرف اشارہ ہے۔ غلام احمد پرویز علیہ الرحمہ کو عزت واحترام سے بابا جی کہا جاتا تھا۔
2. یہ رومی کے اس شعر کی طرف اشارہ ہے:

ماز قرآں مغز را برداشتیم　　　استخواں پیش سگاں انداختیم

''باطنی معانی، الفاظ سے آزاد اور بے نیاز کر دیتے ہیں۔'' علم الخواص اور صوفیا کا باطنی علم: یہ ہے اسلام اور تصوف میں کشمکش کا نقطہ ماسکہ۔

3. Education کا ماخذ لاطینی زبان educare سے ہے، جس کے معنی ہیں to bring up, to lead. اس کے معنی Information (معلومات) کے نہیں ہیں۔ اس کی سند کے لیے دیکھیے: Reader's Digest (1990), Universal Dictionary. London. P: 491,92۔

کہ مثلاً پنجاب میں اتنے دریا ہیں۔ کیا یہ ایجوکیشن ہے؟ نہیں، ایجوکیشن تزکیہ نفس تھی، انسانی صلاحیتوں کی اس طرح نشوونما کرنا کہ یہ تقاضے دل کی گہرائیوں سے ابھریں۔ یہ کتاب وحکمت رسالت کا فریضہ تھا، یہ امت کا فریضہ تھا، یہ دین کی غایت تھی، عزیزانِ من! یہ ڈھونڈتے پھر رہے ہیں کہ نظام کس طرح سے بنے گا، اور دستور کیا ہوگا، اور حکومت کی شکل کیا ہوگی۔ سوال تو پہلے یہ ہے کہ یہ امت، یہ قوم، کس طرح کی ہوگی۔ یہ پہلی چیز ہے۔ جب تک یہ نہیں ہوگا، آپ جو جی میں آئے، بہترین نظام بھی آپ قائم کرلیں، کچھ نتیجہ نہیں پیدا کرسکتا۔ یہ ہے جسے Man behind the gun کہتے ہیں۔ یہ تو ہیں کہ انسان کس قسم کے ہیں۔

## تشکیل پاکستان کے فوری بعد قوم کی تعلیم وتربیت کے لیے علامہ پرویزؒ کی طرف سے تجویز کردہ علاج

جب تشکیل پاکستان کے بعد ہم یہاں آئے ہیں، تو اس بندہ ناچیز نے یہ چیز کہی تھی۔ میں تو اس تحریک میں دس سال رہا تھا۔ ان سے کہا تھا کہ وہاں یہ جتنی تحریک تھی، وہ صرف پاکستان کا ایک مطالبہ تھا جو ہم نے پیش کیا تھا یہ ہمارا مطالبہ ہے۔ وہاں اتنی فرصت نہیں تھی کہ اس قوم کی تعلیم وتربیت کی جاسکتی اس لیے اب یہ خطہ زمین جو حاصل ہوا ہے، قوم ویسے کی ویسے آئی ہوئی ہے، جس کی ذہنیت نہیں بدلی۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ اسے قرآن کریم کے حکم اور اتباعِ سنت رسول اللہؐ کے مطابق بنایا جائے۔ ان کی تعلیم کا اس طرح انتظام کیا جائے کہ ان کا تزکیہ ہوجائے جو قوم کے موجودہ افراد ہیں ان کے ذمے تو یہ لگا دیا جائے کہ یہ اس ملک کی حفاظت کرتے رہیں تاکہ یہ خطہ زمین محفوظ رہے۔ یہ کام تو ان کے ذمے لگایا اور جو آنے والی نئی نسل ہے ان کی تعلیم کا، ان کی تربیت کا، ایسا انتظام کیجیے کہ یہ جو مقاصد تھے اس خطہ زمین کو حاصل کرنے کے، وہ ان کے دل کا تقاضا بن جائیں مگر کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ آخر الامر وہ جا کر ٹکریں مار کر مایوس ہوگئے۔

آپ کو معلوم ہے کہ میں نے وہ اسکیم اپنے کالج کی تیار کی کہ کم ازکم چھوٹے سے پیمانے سے ہی سہی، اس لائن کے اوپر میں کچھ ایک مثال تو قائم کردوں۔ بدبختی ہماری یہ ہوئی کہ ادھر سے وہ اسکیم بارآور ہونے کو آئی، اُدھر سے وہ آرڈیننس نافذ ہوگیا کہ کوئی کالج بنایا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ اس پر ابھی تک وہ آرڈیننس ہے تو اب یہ جو کہتے ہیں کہ آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے، ساری قوم کرپٹ ہوگئی ہے، کوئی اس میں خوبی باقی نہیں رہی، یہ ساری قوم کو اس طرح سے کہتے ہیں۔ یہ ایسی ہی ہوگئی ہے اور اب اس قوم کے ذریعے یہ کچھ ایسا قانون دستور بنانا چاہتے ہیں کہ یہ اس دنیا کو جنت بنادیں۔

## کتاب وحکمت کی روشنی میں اتباع سنت کے عمل کا تعین اور تزکیہ نفس کے مفہوم کا نتیجہ

کہا ہے کہ **يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ**[1] (2:129) اس طرح کا انتظام وانصرام

---

[1] انہیں اس ضابطہ (کتاب) کی تعلیم بھی دے، اور یہ بھی بتائے کہ ان قوانین کی غرض وغایت کیا ہے اور اس پر عمل کرنے سے کیا نتائج مرتب ہوں گے (2: 23; 17:39; 33:34) اس قسم کی نشوونما، قوت اور حکمت، دونوں کے امتزاج سے ہوسکتی ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 47)۔

کریں گے' تب جا کے یہ ابن خطاب عمر فاروقؓ بنے گا ورنہ اگر یہ تعلیمات نہ ہوتیں تو وہ وہی عرب رہتے' پھر تو یہ چیز نہ بن سکتی جو ہمارے سامنے آئی ہے۔اس لیے جسے کہتے ہیں کہ صاحب! اتباعِ سنت بڑا ضروری ہےلیکن وہ اتباعِ سنت کسے کہتے ہیں۔ میں ویسےنہیں کہہ رہا کہ جی! مسواک کی لمبائی اتنی ہونی چاہیے اتباع سنت یہ تعلیم کتاب وحکمت وتزکیہ نفوس ہے۔ یہ کرو۔حکم خداوندی بھی یہی ہے' اتباعِ سنت رسول اللہؐ بھی یہی ہے۔کہا ہے کہ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (62:2)[1] اس سے پیشتر تم گمراہی میں تھے'ایسی گمراہی جو دنیا دیکھتی تھی' ڈھونڈ نا نہیں پڑتا تھا۔ یہ تو ہوا حضورؐ کے سامنے جو مخاطب قوم تھی' ان کے لیے یہ کچھ تھا۔ اوراس کے بعد کہا کہ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ (62:3) نبی اکرمؐ کی یہ نبوت' حضورؐ کی ذات تک' اولیں قوم تک' ہی محدود نہیں تھی یہ للناس تھی' حضورؐ نوعِ انسانی کے لیے للناس یہ کتاب پوری انسانیت کے لیے تھی ابدی طور پر قیامت تک کے لیے آنے والے انسانوں کے لیے یہ کتاب تھی اور یہی اتباعِ رسالت میں جو طریقہ اختیار کیا گیا تھا' یہ آگے پوری انسانیت کے لیے چلنا تھا تو یہیں یہ بات کہہ دی کہ یہ یہیں تک محدود نہیں ہے بلکہ ان کے بعد جو لوگ آنے والے ہیں' ان کے لیے بھی یہی کتاب ہے اور ان کے لیے بھی یہ طریقہ ہوگا جو ہم نے یہاں تجویز کیا ہے' ان کے لیے جو مخاطب قوم ہے: وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ (62:3)۔اس میں' عزیزانِ من! بحثیں کیا کرتے ہیں ختم نبوت پر کہ ت کی زبر ہے' یا ت کی زیر ہے۔تو زبر اور زیر کا سوال ہی نہیں ہے۔کہا ہے کہ یہ انہی کے لیے نہیں ہے' ان کے بعد آنے والی انسانیت جو ہے' ان کے لیے بھی یہی ہے۔معاملہ ختم ہوگیا۔ یہی کتاب ہے' لیکن یہ جب تفسیروں کے بس پڑ گئی' تو بات آپ کو پتہ ہے کہ اس کا ترجمہ کیا' ترجمہ نہیں' اس کا مفہوم قیامت تک کے انسان کے لیے بیان ہوگیا کہ یہ تھا قرآن نے جو کہا ہے۔ بعد میں یہ جتنے آنے والے ہیں ان کے لیے بھی یہی ہے' نصاب یہی ہے' کتاب یہی ہے' نبوت یہی ہے' رسالت یہی ہے۔اب آگے انہوں نے شانِ نزول پیدا کیا ہے وہ ایک بری سازش ہے۔ وہ قرآن کریم کے ابدی عالمگیر حقائق کو محدود کر دینا ہے' یہ کسی خاص واقعہ کے ساتھ مختص کر دینا ہے کہ یہ وہیں تک تھا' بس وہ واقعہ ہو چکا' معاملہ بھی یہ ختم ہوا' قرآن کریم کی آیت اب ثواب کے لیے باقی رہ گئی۔

## شانِ نزول کا تصور قرآن حکیم کی ابدی تعلیم کو محدود کرنے کی سازش کی وضاحت

میں کیا کیا عرض کروں کہ کس کس قسم کی یہ شانِ نزول کی سازشیں ہوئی ہیں۔قرآن کریم کی آیت تھی کہ قیامت تک کے لیے یہ نبوتؐ اور رسالت باقی رہے گی۔شانِ نزول آئی' بخاری کی حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہؓ نے پوچھا کہ حضورؐ یہ

---

[1] اس رسولؐ کی تبلیغ وتعلیم وتربیت سے' وہ قوم جو اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھی (زندگی کے صحیح راستے پر گامزن ہوگئی۔(پرویزؒ: مفہوم القرآن ص ص۔1313-14)۔

کون سی قوم ہوگی' جو بعد میں کہی گئی ہے جو آنے والی ہے کوئی خاص قوم۔ آپؐ نے اس کو ٹال دیا' تو پھر اس کے بعد دوبارہ پوچھا گیا۔ آپؐ نے ذرا پھر حجاب برتا' پھر پوچھا گیا' جب اصرار کیا گیا تو حضرت سلیمان فارسی فارس کے بیٹھے ہوئے تھے آپؐ نے ان کے مونڈھے پہ ہاتھ رکھا اور کہا کہ یہ ان کی قوم ہے۔ اب نظر آتا ہے کہ ایرانیوں نے اپنے لیے یہ شانِ نزول وضع کی۔ اب عرب کے بعد گویا ان کے Successor یہ ایرانی ہوں گے۔ صاحب! سند قرآن کریم کی آیت اور رسول اللہؐ کی تفسیر۔ غور فرمایا آپ نے کہ جو کچھ آ کر' پھر ایرانیوں نے' عباسیوں کے دور میں' جس طرح سے آپ کے اس اسلام میں روایات وضع کیے ہیں' جس طرح اسلام کے تصور کو مسخ کیا ہے انہوں نے نیا ایک اسلام Introduce کیا' اس کے لیے سند کیا تھی؟ سند یہ تھی کہ رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ عرب کے بعد یہ ایرانی ہیں' جو اسلام کو سنبھالیں گے' وہ اگر پہلے ہوگئے حضورؐ کے مخاطب میں ہیں یہ ایرانی لَمَّا يَلۡحَقُوۡا بِهِمۡ❶ (62:3) ہوگئے اور باقی ساری دنیا' جتنی بھی ہے' وہ پھر ضللٍ مبین میں ہی رہی۔ ان کے لیے تو پھر اس تفسیر کے بعد اور آگے کہا ہے کہ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ(62:3) یہ سب کچھ خدا کے غلبہ اور حکمت کی بنا پر کیا گیا۔ قرآن حمید رہا ہی نہیں۔

## خدا کی طرف سے وحی کا نزول اور نظام رسالت یہ تو خدا کی طرف سے پوری انسانیت کے لیے فضل ہے

کہا ہے کہ ذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ ‌ؕ وَاللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِيۡمِ❷ (62:4)۔ یہ دونوں چیزیں تھیں' یہ وحی جو ملی ہے نبوت کو۔ نبی کو وحی کا ملنا صرف خدا کے فضل پہ منحصر ہے۔ یہ اس کا اپنا حاصل کردہ' تحصیل کردہ نہیں ہوتا' اکتسابی علم نہیں ہوتا۔ یہ نبوت خالصتاً وہبی ہے' خدا کی طرف سے یہ ملتی ہے۔ ایک تو یہ رسول کو یہ نبوت کا ملنا یہ تھا اس کی موہبت' اور پھر یہ کہ یہ جو اس امت کو رسول ملا ہے یا یہ جو نظام ہے اس رسالت کا' یہ خود سے اس امت کے لیے انسانیت کے لیۓ بھی فضل خداوندی ہے کہ اس نے اس رسول کے متعلق یہ طریقہ بتا دیا۔ وہاں دوسری جگہ ہے کہ لَقَدۡ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ (3:164) یہ مومنوں کے اوپر

---

❶ (اس رسولؐ کی رسالت اس کی اوّلین مخاطب قوم تک محدود نہیں)۔ یہ ان کی طرف بھی اسی طرح رسول ہے جو ان لوگوں کے بعد آنے والے ہیں۔ یعنی عالمگیر انسانیت کی طرف رسول' اور موجودہ اور آئندہ تمام نسلوں کے لیے۔ (یہی وہ مقصد ہے جس کے لیے اس قرآن کو ہمیشہ کے لیے محفوظ رکھا گیا۔ اس رسول کا مسئلہ رسالت' اس کی امت کی وساطت سے' قرآن کے ذریعے' ابد تک باقی رہے گا)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1314)۔

❷ خدا کی طرف سے وحی کا ملنا' اس کی موہبت ہے۔ اس منصب جلیلہ کے لیۓ خدا' اپنی مشیت کے مطابق جسے چاہتا ہے' چن لیتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ' یہ حقیقت بھی ہے کہ اس وحی کے ذریعے لوگوں کو رشد و ہدایت کامل جانا بھی خدا کی عنایات میں سے ہے۔ اس کا دروازہ ہر اُس شخص کے لیے کھلا ہے جو اُسے لینا چاہے۔ (یعنی خدا کی طرف سے وحی تو صرف انبیاء کو ملتی تھی لیکن اس وحی کی رُو سے راہ نمائی ہر شخص حاصل کر سکتا تھا' اور کر سکتا ہے) یہ خدا کی کتنی بڑی کرم گستری ہے کہ اُس نے (انسان کی طبعی زندگی کی ضروریات کے لیے سامانِ رزق اس طرح فراہم کر دیا اور اس کی انسانی زندگی کی نشوونما کے لیے وحی کا سلسلہ یوں قائم کر دیا)۔ وہ واقعی صاحب فضل عظیم ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن ص۔1314)۔

احسانِ خداوندی ہے کہ ان میں اس جیسا رسولؐ بھیج دیا۔ اس نے کہا ہے اور یہ پوری انسانیت کے لیے احسانِ خداوندی ہے۔ جب بھی یہ دنیا آئے گی' ٹھکرائے ہوئی درماندہ و واماندہ اس آستاں کے اوپر دستک دے گی' یہاں باب محمد رسول اللہؐ کے اوپر' قرآن حکیم کے دروازے پہ' جب بھی یہ آئے گی' وہ اس جہنم سے نکل جائے گی جس میں یہ صدیوں سے چلی آ رہی ہے تو اس وقت محسوس ہو گا کہ یہ خدا کا کتنا بڑا احسان تھا کہ اس نے قرآن کریم جیسی کتاب دی اور اسوہ حسنہ دیا اس رسولؐ کا جیسا یہ فضل خداوندی ہے۔ کہا کہ یہ تو ہے جو ہم یہ کرتے ہیں۔

## دین کو مذہب میں بدلنے کا انجام اور خدا کی طرف سے ملنے والی وحی کے ساتھ کیے جانے والے حشر کا نتیجہ

یہ دیکھیے! جنہوں نے دین کو مذہب بنا رکھا ہے۔ یہ یہودی پہلی مخاطب قوم کے اندر یہی تھے۔ جو عیسائیت تھی وہ کوئی تصوف والوں کی تھی' یہ یہودی تھے جو اس دین کو مذہب بنا کے' مسخ کر کے' بیٹھے ہوئے تھے۔ کہا کہ اس میں ہوتا کیا ہے؟ کتاب تو اس لیے دی تھی کہ اس کو سمجھایا جائے علم و بصیرت کی رو سے' پھر اس کے اوپر عمل کیا جائے' اور اس عمل کے نتائج سامنے لائیں لیکن جب یہ مذہب بن جاتا ہے تو مثلاً اندازہ لگائیے اور پھر یہ کہا کہ **مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا** (62:5) یہ کتابیں لیے پھرتے ہیں' تورات بھی ان کے بغل میں ہے' سر آنکھوں پہ اٹھائے ہوئے پھر رہے ہیں۔ اس بنا پہ اپنے آپ کو بہت صاحبِ کتاب کہتے ہیں۔ دھوکا دیتے ہیں۔ کہا کہ کیفیت ان کی یہ ہے کہ یوں سمجھو یہ جو کتابیں اٹھائے پھرتے ہیں' جیسے کسی نے گدھے پہ کتابوں کا انبار لاد دیا ہو۔ اب گدھے کے اوپر وہ جس قسم کا جی چاہے کتاب لاد دیجیے' قرآن کریم لاد دیجیے تورات لاد دیجیے انجیل لاد دیجیے' یعنی وہ سوال ہی نہیں ہے اور یہ جو **حُمِّلُوا التَّوْرٰةَ** (62:5) ہے' یہ عربی زبان کا جو یہ لفظ ہے' اس کے معنی ہوتے ہیں ''کسی کے اوپر ذمہ داریاں عائد کرنا''۔ یہ وہ گدھے کے بوجھ اٹھانے والی بات نہیں کہ ان کتابوں کی رُو سے' تورات کی رُو سے' ان کے اوپر جو ذمہ داریاں عائد کی گئی تھیں' ان کو تو پورا نہیں کرتے' کتاب اٹھائے اٹھائے پھرتے ہیں۔ عزیزانِ من! اپنی حالت پہ آپ ہی غور فرما لیجیے۔ ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی۔ کیا یہی ہماری کیفیت نہیں ہے کہ قرآن حمید کو کس طرح سے اٹھائے اٹھائے پھرتے ہیں۔ انہوں نے تو اس طرح اتنی بلندیوں سے اس کو اٹھایا ہی نہیں تھا جتنا آپ اٹھا رہے ہیں اور پھر **لَمْ يَحْمِلُوْهَا** (62:5) کی جو کیفیت ہے کہ یہ کتابیں تو اٹھائے اٹھائے پھر رہے ہیں اور جو کچھ ان میں کہا گیا ہے' اس کی طرف کوئی توجہ نہیں۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے گدھے پہ کتابوں کا انبار لاد دیا جائے۔

## قرآن حکیم کی علمی تکذیب کرنے والوں کو ظالمین کہا گیا ہے

کہا ہے کہ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ(62:5) ہم نے یہ مثال تو دی ہے' ناگوار تو گذری ہوگی جناب کو' لیکن سوچ لیجیے کہ کتنی سچی چیز ہے' کتنی بری مثال ہو جاتی ہے اس قوم کی۔ اس کو کہا ہے کہ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ (62:5) یہ قوانین خداوندی کا زبان سے تو اقرار کرتے ہیں لیکن عملاً اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ آپ کو معلوم رہے میں نے بتایا تھا کہ قرآن کریم کی اصطلاحات میں ایک ایک اپنی جگہ ہمالیہ پہاڑ ہے۔ ایک تو ہے ''کفر''۔ ہم مانتے ہی نہیں ہیں۔ اس کو غیر مسلم ٹھیک ہے اعلانیہ کہہ رہا ہے۔ ایک یہ چیز ہے کہ یہ اس قرآن حکیم کو یا ان کتابوں کو جو خدا کی وحی کی رو سے ملی ہیں سر آنکھوں پہ اٹھائے ہوئے ہیں۔ چوم رہے ہیں غلافوں میں بند ہے' تعظیم ہو رہی ہے' اس کی طرف پیٹھ نہیں کرتے۔ کیفیت یہ ہے۔ لیکن ان کے جو احکام ہیں' ان کی تکذیب کر رہے ہیں' مانتے نہیں ہیں۔ اسے تکذیب کہتے ہیں کہ ''کسی چیز کو ماننا لیکن عملاً اس کے اوپر نہ آنا''۔ کہا کہ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ(62:5) یہ ہے قوم الظٰلمین۔ یہ صحیح راستے پہ نہیں آسکتی۔ ان میں سے تو اکثر مطمئن ہو جاتے ہیں Self deception (خود فریبی) سے کہ واقعی ہم صحیح اسلام پہ چل رہے ہیں باقیوں کو دھوکے میں رکھتے ہیں۔ وہ سب جاہل ہوتے ہیں تو یہ سیدھے راستے پہ کیسے آسکتے ہیں۔ وہ تو آئے گا جو عقل و فکر کی رو سے قرآن حکیم کو سمجھے گا۔

## حصول جنت کے سلسلہ میں بنی اسرائیل کا عقیدہ اور قرآن حکیم کا ارشاد

کہا ہے کہ قُلْ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّکُمْ اَوْلِیَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ [1] (62:6) دعوائے صداقت کے ثبوت کا بہت بڑا معیار بتایا اگر تم یعنی یہ یہودی کہتے تھے کہ ہم خدا کی چہیتی اولاد ہیں' جنت ہمارے لیے مختص ہے' اوّل تو کوئی بنی اسرائیل والا جہنم میں جائے گا ہی نہیں' اور ان کا ایک گروہ تھا' اس کا عقیدہ تھا کہ چند دنوں کے لیے جہنم میں جائیں گے کہ جتنے میں ہمارے ہاں کے سفارشیوں کو پتہ نہیں چلے گا' کہ انہوں نے ہمیں جہنم میں بھیج دیا ہے۔ جب پتہ چلے گا تو بھاگے بھاگے جائیں گے خدا کے پاس' اور وہاں سے جا کے معافی نامہ لے آئیں گے' اور پھر ہم جہنم سے نکل کر جنت میں چلے جائیں گے۔ لیکن بہرحال جنت میں جائیں گے اور اس کے بعد یہ تھا کہ کوئی غیر از بنی اسرائیل جنت میں جا ہی نہیں سکے گا۔ کہا یہ کہ اگر تم اس دعوے میں سچے ہو کہ خدا کی چہیتی اولاد ہو' اس کے بہت بڑے یار ہو' دوست ہو' سب کچھ ہو' تو پھر مرنے کی آرزو کیوں

---

[1] (حالت تو ان بنی اسرائیل کی یہ تھی کہ خدا کی کتاب سے راہ نمائی حاصل کرنے کے بجائے' اسے محض اٹھائے اٹھائے پھرتے تھے۔ لیکن زعم باطل یہ کہ ساری خدائی میں صرف ہم ہی خدا کے پیارے ہیں)۔ ان سے کہو کہ اگر تم واقعی خدا کے عزیز ترین دوست ہو' تو اس کی راہ میں مرنے کی تمنا کرو۔ یہی تمہارے دعوے کی صداقت کی دلیل ہوگی (2:94)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1315)۔

نہیں کرتے' تمہاری جان کیوں جا رہی ہے اس سے۔ وہ تو ایسے ہے کہ وہاں تمہیں بڑا ڈر لگتا ہے' جسے اس زندگی کے فوری بعد جو ذلت اور خواری کی زندگی تمہاری ہے' جو Homeless Wandering Jews کی زندگی ہے' جنت جیسی چیز' تم کہتے ہو کہ مل جائے گی تو پھر اس کی آرزو کیوں نہیں کرتے' اس موت سے بھاگ کیوں رہے ہو۔

## مردان کے ایک قرآنی فرد کا قصہ

یہ کیسی عمدہ دلیل ہے کہ یہ خواہش خود کیوں نہیں کرتے! مردان میں ایک بہت بڑے مولانا تھے۔ انہیں مولانا عرب [1] کہتے تھے۔ وہ بڑے قرآنی آدمی تھے۔ ان کے خلاف حسب معمول مرتد ہونے کا فتویٰ لگ گیا۔ یہ مولانا احسن محمودؒ نے لگایا تھا۔ مولوی صاحب نے یہ کہہ دیا کہ وہ مرتد ہو گئے ہیں' جو شخص ان کو قتل کر دے گا' وہ سیدھا جنت میں چلا جائے گا۔ جب صبح ہوئی تو مولوی صاحب کے دروازے پہ کسی نے دستک دی۔ آپ کو پتہ ہے کہ پٹھان کیسے ہوتے ہیں۔ انہوں نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ایک شخص ہے اس کے ہاتھ کے اندر خنجر لیا ہوا تھا۔ وہ آن کھڑا تھا۔ کہنے لگے کہ کیا بات ہے بھئی؟ کہنے لگے جی! مولوی صاحب نے یہ بتایا ہے کہ آپ مرتد ہیں' جو آپ کو قتل کر دے گا وہ سیدھا جنت میں چلا جائے گا' تو میں اس لیے آیا ہوں' چھپا کر نہیں بات کرتا' جھوٹ نہیں بول سکتا' میں اس کام کے لیے آیا ہوں۔ کہنے لگے کہ بہت بہتر بات ہے۔ ٹھیک ہے' میں تیار ہوں' لیکن پہلے میری ایک بات سن لو۔ جس مولوی صاحب نے یہ کہا ہے' اس سے جا کر پوچھو کہ کیوں آپ کو جنت میں جانے کی خواہش نہیں ہے' اس نے جو کہا ہے کہ جا کر قتل کر آؤ تو جنت میں چلے جاؤ گے' تو آپ کو خواہش نہیں ہے۔ کیا آپ کو جہنم میں جانے کی بات ہے؟ اگر آپ کو خواہش ہے تو آپ کیوں نہیں جاتے' پھر وہ واپس نہیں آیا۔ اسی طرح ایک اور سن لیجیے۔ یہ جب ہجرت Movement (تحریک) یہاں چلی ہے۔ چلا جا رہا تھا قافلہ در قافلہ مگر یہ بیٹھے ہوئے تھے یہاں لاہور اسٹیشن پر۔ میں نام نہیں لینا چاہتا کہ کون لوگ تھے۔ وہ ہمارے جذباتی لیڈر تھے وہ لاہور میں بیٹھے ہوئے تھے میز کرسی بچھا کے' تو ہجرت پہ جانے والوں کے نام وام لکھتے تھے تو ان سے کہا کہ اس میں لوگوں کو آپ نے بھیج دیا ہے' آپ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں' آپ ہجرت کیوں نہیں کرتے؟ کہنے لگے کہ ہم ریکروٹنگ آفیسر ہیں کہا ہے کہ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ o وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًا ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ (62:6-7) پتہ ہے ان کو کہ ہمارا حشر کیا ہونا ہے۔ یہ جو بھاگا ہوا مجرم ہوتا ہے وہ جاتا کیوں نہیں تھانے میں؟ خود اسے پتہ ہے شاہی قلعے میں کیا سلوک ہوگا۔

## مکافاتِ عمل ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جو کسی شکل میں بھی اوجھل نہیں ہو سکتی

کیا بات قرآن کریم نے کہی کہ پتہ ہے کہ ہمارا حشر کیا ہونا ہے اس لیے موت کی تمنا کیوں کرے لیکن انہیں پتہ نہیں کہ وَاللّٰهُ

---

[1] مولانا عرب کا نام نور احمد ولد عبدالبصیر تھا (م۔1957ء)

عَلِيۡمٌ بِالظّٰلِمِيۡنَ (62:7)۔کہاں تک بھاگ جاؤ گے' ہم تو تمہارے دل میں گزرنے والے خیالات سے بھی واقف ہیں۔ قُلۡ اِنَّ الۡمَوۡتَ الَّذِىۡ تَفِرُّوۡنَ مِنۡهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيۡكُمۡ ثُمَّ تُرَدُّوۡنَ اِلٰى عٰلِمِ الۡغَيۡبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ(62:8) اُن سے کہو کہ جس موت سے بھاگے بھاگے پھر رہے ہو' وہ تو ایک دن آ ہی جاتی ہے' اس نے تمہیں پکڑ ہی لینا ہے اور اس کے بعد پھر وہ مکافاتِ عمل کا جو دور ہے اس نے جانا ہی ہے۔ آرزو کر دیا نہ کرو' تم اس سے بھاگ نہیں سکتے اور وہاں يُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ (62:8) یہ قیامت' عزیزانِ من! جو کچھ کسی نے کیا ہے' خواہ وہ چھپائے ہوئے ہے یا ظاہر کیا ہے' اس کو ظاہر کر کے سامنے لے آنا ہے اور اس کا جو نتیجہ ہے اس کو بھگتنا پڑے گا۔ یہ ہے' عزیزانِ من! خیالات بالآخرۃ کے معنیٰ' جو قرآن کریم کہتا ہے اس لیے تم یہ نہیں چاہتے۔ یہاں ایک الگ آیت آئی ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ اسے اگلے درس کے لیے چھوڑ دیا جائے۔

## جمعہ کے سلسلہ میں پیش کی جانے والی آیت کا عام ترجمے کے بعد اس کا حقیقی مفہوم

کہا ہے کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا نُوۡدِىَ لِلصَّلٰوةِ مِنۡ يَّوۡمِ الۡجُمُعَةِ فَاسۡعَوۡا اِلٰى ذِكۡرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الۡبَيۡعَ ذٰلِكُمۡ خَيۡرٌ لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ (62:9)۔ یہ بڑی اہم آیت ہے۔ کہا ہے کہ اے صاحبان ایمان! اس کا عام ترجمہ یہ ہے جب تمہیں جمعہ کی نماز کے لیے آواز دی جایا کرے تو تم فوراً آ جایا کرو' بھاگ کر' ذکر اللہ کی طرف آ جایا کرو اور کاروبار چھوڑ دیا کرو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھو۔ آگے کہا کہ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانۡتَشِرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ وَابۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِ اللّٰهِ وَاذۡكُرُوا اللّٰهَ كَثِيۡرًا(62:10) بس پھر نماز سے فارغ ہو جاؤ' تو پھر تم پھیل جاؤ' اللہ کا بہت زیادہ ذکر کرو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ یہ عام کہا جاتا ہے۔ اسلام پرائیویٹ عقیدے کا نام نہیں ہے۔ یہ ذاتی زندگی کی چیز نہیں ہے' یہ ایک اجتماعی نظام ہے اور اجتماعیت کا تو کعبہ سے ہوتا کہ اکٹھے ہو کر کچھ سوچا جائے' سمجھا جائے' معاملات کے لیے' مشورہ کے لیے' کیا جائے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جہاں مشورہ کرنے کا حکم ہے' وہاں یہ ہے کہ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ (42:38) ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے۔ اس کے پہلے ہے کہ یہ اقامت صلوٰۃ کریں گے اور ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے۔ اب اس کا کچھ تو تعلق ہونا چاہیے۔

## عہد اولیٰ کے حقائق تک پہنچنے کے لیے احادیث اور تاریخ دونوں ناقابل یقین ہیں

ان دو آیتوں کے درمیان اقامت صلوٰۃ کا' مشاورت کے ساتھ' کچھ تو واسطہ ہونا چاہیے۔ عزیزانِ من! آج یہ بہت مشکل ہے کہ ہم جو کچھ ہوتا تھا عہد رسالت مآبؐ اور خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں جس طرح اسلام پہ عمل ہو رہا تھا' مشکل نہیں' شاید ناممکن

ہے کہ یقینی طور پر ہم بتا سکیں کہ وہ کیسے ہوتا تھا۔ اس کے لیے دو ہی ذرائع ہو سکتے تھے۔ ایک انہوں نے' جس کو احادیث کہا دوسرا جسے تاریخ کہا۔ اصل میں دونوں ہی ایک ہیں۔ اس زمانے کے واقعات کو محفوظ کرنا' وہ احادیث کی کتابوں میں ہوں' یا تاریخ کی کتابوں میں ہوں' دونوں ہی ظنی ہیں' نا قابل یقین ہیں۔ تیسرا ذریعہ کوئی نہیں ہے۔ جب یہ کہا جائے کہ وہ جو قرآن کریم نے کہا تھا کہ بعد میں جو آنے والے ہیں ان کے لیے بھی یہ اسی طرح سے نظامِ قرآنی موجود ہے اور حدیث کہہ دے کہ یہ سلمان فارسی کے لیے مخصوص ہو گیا اور تاریخ کہہ دے کہ پھر ایرانیوں میں' اس طرح سے اسلام کا احیاء کر دیا۔ اب آپ کے لیے اس چیز کا کیا ذریعہ ہے کہ اس کے علاوہ کچھ اور اس کے متعلق معلوم کر سکیں۔ ذرائع ہیں نہیں۔

## جنگ جمل کے اندر ہزار صحابہ کا بہیمانہ قتل؟

قانون سازی کے لیے یہ جتنے الجھاؤ اور جتنی پیچیدگیاں آپ کے ہاں پیدا ہو رہی ہیں' یہ ساری اس لیے ہو رہی ہیں کہ یہ کہتے ہیں کہ صاحب! چلیے Back وہاں چلیے! تیرہ سو سال پہلے' عہد رسالت مآبؐ خلفائے راشدینؓ کے اندر۔ وہاں چلیے! کوئی کھڑا ہو کر نہیں سوچتا کہ اس کے لیے تمہارے پاس ذریعہ کیا ہے۔ احادیث ذریعہ بناتے ہو تو ہر حدیث سے پہلے کہتے ہو' ''قال رسول اللہؐ رسول اللہؐ نے فرمایا' آگے الفاظ ہوتے ہیں' حدیث کے آخر میں ہوتا ہے ''اوکما قال رسول اللہؐ '' یہ یا جیسے رسول اللہؐ نے فرمایا ہو۔ ہر حدیث کے ساتھ یہ ہوتا ہے' یقینی طور پر ایک حدیث بھی نہیں پیش کی جا سکتی اور تاریخ کا تو پوچھو ہی نہیں۔ جو تاریخ یہ کہتی ہے کہ پہلے ہی دور کے اندر سارے صحابہؓ جنگ جمل میں دو حصوں میں بٹ گئے تھے' ساری کی ساری امت صحابہ کبارؓ ایک دوسرے کے ساتھ جنگ میں قتل کرتے تھے' ایک دوسرے کو۔ ایک دن میں دس ہزار صحابہ قتل ہو گئے تھے۔ یہ آپ کی تاریخ بتا رہی ہے۔ کہاں سے یہ چیز لاؤ گے۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔

## مملکت اسلامیہ کے لیے قوانین سازی کے لیے قرآن حکیم کی راہنمائی ہی آخری اور یقینی سہارا ہے

قرآن کریم موجود ہے اور ہمارا ایمان یہ ہے کہ وہ قرآن حکیم کے مطابق عمل کرتے تھے تو جو تاریخ میں' یا احادیث میں' کوئی واقعہ اس دور کا ایسا ہو' جو قرآن حکیم کی تعلیم کے خلاف جاتا ہے تو بلا تامل کہہ دیجیے کہ یہ ان کا نہیں ہو سکتا' یہ غلط ہے اور یہاں سے آپ Reconstruct کیجیے اپنے ہاں کے قوانین کو' نظام کو' قرآن کریم کی روشنی میں' ان حدود کے اندر رہتے ہوئے۔ ان آیات کے صحیح معنی اس وقت سمجھ میں آئیں گے ورنہ جو کچھ آپ کو تفاسیر سمجھائیں گی یا روایات سمجھائیں گی یا تاریخ سمجھائے گی یا جو کچھ اب کہتے ہیں ''ہوتا چلا آ رہا ہے'' سلف صالحین کا مسلک' علمائے امت جس کا نام رکھا ہوا ہے'' جس کو تواتر کہتے ہیں' ان میں سے کسی سے بھی آپ کے ہاں یہ مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ قرآن حکیم کے احکام قرآن حکیم سے سمجھیے۔ عربی زبان سے سمجھیے اور اس کے بعد پھر یہ دیکھیے کہ

ان پر آج عمل کس طرح سے ہوسکتا ہے، مسئلہ حل ہو جائے گا۔

وقت تھا چار ہی منٹ، یہ بات میں نے ابتداء کی ہے۔ آیت پہ آیا نہیں ہوں، اگلے درس میں ان شاءاللہ میں یہ عرض کروں گا کہ یہ چیز کیا چیز ہے اور میں نے اس کی یہ تمہید کیوں باندھی ہے۔

ہم سورۃ الجمعۃ کی آیت 8 تک آ گئے تھے، نویں میں نے تلاوت کی ہے۔ اس کے متعلق تفہیم اگلے درس میں لوں گا۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ** (2:127)

❀......❀......❀

# دوسرا باب: **سورۃ الجمعۃ** (آیات 9 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج اگست 1983ء کی 5 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الجمعۃ کی آیت 9 سے ہو رہا ہے: (62:9)

## قرآن حکیم کو سمجھنے کے لیے پہلے مذہب اور دین کے فرق کو سمجھنا ضروری ہے

اس آیت کی تلاوت تو میں نے سابقہ درس میں کر دی تھی لیکن اس کی تشریح آج کے درس پر ملتوی کر دی گئی تھی کیونکہ میں نے کہا تھا کہ یہ بڑا اہم ایک بنیادی نقطہ ہے جس کی وضاحت کے لیے زیادہ وقت کی ضرورت ہے اور وہی آج پیش ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ آیات بلکہ قرآنِ کریم پورے کا پورا سمجھ میں نہیں آ سکتا تاوقتیکہ ہم مذہب اور دین کا فرق نہ سمجھیں۔ آج اسلام مذہب کی سطح پہ ہے اور یہ سارا کچھ دین کی چیزیں ہیں تو وہ اس تصور کے اندر fit in نہیں ہوتا۔ اس کے اپنے تصورات ہیں، اپنے نظریات ہیں، اپنا پروگرام ہے، اپنے احکام و قوانین ہیں جو fit in نہیں ہوتے جسے دین کہا جاتا ہے۔ مذہب کے اندر تو کھینچ تان کر کسی نہ کسی طرح سے لے آئے اور پھر ان کی تاویلیں ہوئیں، ان کے اپنے مقصد کے مطابق تفسیریں ہوئیں۔ بنیادی غلطی یہی تھی کہ اس کو دین کی جگہ مذہب سمجھ لیا گیا۔

## مذہب کی اصطلاحات کا قرآنی نظامِ اجتماعیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا

مذہب خدا اور بندے کے درمیان کسی قسم کے پرائیویٹ سے تعلق کا نام ہے جسے کوئی متعین نہیں کر سکتا کہ وہ ہوتا کیا ہے۔ تعلق باللہ الفاظ ہیں، چند اصطلاحات ہیں کہ وہ قائم ہو جاتا ہے اس کے قائم ہونے کا ذریعہ پرستش ہے۔ عبادت کا یہ ترجمہ ہوا ہے۔ پرستش، بندگی بھگتی، Worship ہر مذہب میں ہے۔ یہ ہر اہلِ مذہب اپنے اپنے طریقے سے یہ کچھ کر لیتا ہے اور مطمئن ہو جاتا ہے کہ میں

نے مذہب (Religion) ' دھرم کا فریضہ ادا کر دیا۔ اب اس کے لیے یہ ہے کہ صاحب! اس سے ہوتا کیا ہے۔ تو اب پھر ایک اور اصطلاح آ جاتی ہے کہ اس سے ''ثواب'' ہوتا ہے۔ تنہا نماز پڑھی تو اس کا کم ثواب ہوا' با جماعت پڑھی یعنی مسجد میں جا کر پڑھی تو زیادہ ثواب ہو۔ وہاں بھی ہر شخص اپنی اپنی ہی نماز پڑھ رہا ہوتا ہے' بس وہ ایک صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں وہ ایک طریقہ ہوتا ہے' یہ کرتے ہیں کہ بھئی! یہ با جماعت پڑھنے سے کیا ہوتا ہے؟ کہ جی' زیادہ ثواب ہوتا ہے۔ یہی کچھ کہتے ہیں اس کے بعد یہ ہے کہ جی' پھر وہ جمعہ کی نماز ہوتی ہے' وہ بڑی با جماعت ہوتی ہے۔ بھئی! اس میں شمولیت سے کیا ہوتا ہے؟ اس سے بھی زیادہ ثواب ہوتا ہے۔ وہ ثواب نہ کوئی سمجھا سکتا ہے' نہ بتا سکتا ہے کہ ہوتا کیا ہے۔ یہ اپنے ذہن کی چیز ہے' وہ یہ کہہ کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ مجھے یہ زیادہ ثواب ہو گیا۔ دین میں ہر عمل' ہر حکم' ہر قانون' بلکہ یہ جتنے آپ کے دین کے ارکان کہتے ہیں جیسے نماز روزہ حج زکوٰۃ کہا جاتا ہے' یہ سارے اپنے نتائج اسی دنیا میں پہلے دکھاتے ہیں۔ یہاں تو یہ صورت ہے کہ بھئی! نماز ہو گئی؟ مولوی صاحب نے کہہ دیا کہ ہو گئی۔ کیسے ہو گئی؟ یوں ہو کہ ہاتھ جہاں باندھنا چاہیے تھا وہاں باندھا' ہاتھ جہاں تک اٹھانا چاہیے تھا وہاں تک اٹھایا' رکوع میں جیسا جھکنا تھا یہ وہاں ویسے جھکے' سجدے میں یہ پانچوں انگلیاں زمین پہ لگیں' یہ سارا کچھ اس طریقے سے کیا اور پھر وہ بھی جو شرط تھی کہ پاجامہ یا پتلون ٹخنے سے اونچی ہوئی۔ یہ اگر ساری چیزیں ہو گئی ہیں' تو نماز ہو گئی۔ اس نے یہ کہا تھا۔

## مذہب میں ہر شخص انفرادی نجات کی فکر لیے ہوئے ہوتا ہے

نماز تو خیر لفظ ہی عربی کا نہیں ہے فارسی کا لفظ ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اس صلوٰۃ سے معاشرے سے برائیاں اور بے حیائیاں ختم ہو جائیں گی تو دین میں تو نماز اس وقت ہو گی جب یہ ہو جائے گا اور یہ ایک محسوس چیز ہے' معلوم ہو جائے گا کہ صلوٰۃ ہوئی ہے یا نہیں۔ یہ بے حیائیاں نہیں ختم ہوئیں تو نماز نہیں ہوئی' ہو گئیں تو نماز ہو گئی۔ یہاں ان برائیوں اور بے حیائیوں سے تعلق ہی نہیں ہے۔ برائیوں اور بے حیائیوں کے لیے سب ٹکریں مارتے ہیں' ڈور کو سلجھا رہے ہیں اور سرا ملتا نہیں بس یہ نماز ہوتی چلی جا رہی ہے۔ مذہب میں تصور انفرادی نجات کا ہے کہ میری بخشش ہو جائے' وہ ان چیزوں سے ہو جاتی ہے جیسے وہ ثواب زیادہ سے زیادہ ثواب پر ہے اور اس کے بعد اگر پھر اس پہ بھی نہیں تو وہ اللہ کے فضل پہ ہوتی ہے' حضورؐ کی شفاعت پہ ہوتی ہے' وہ بھی اپنے ذہن میں ایک اطمینان کر لیا جاتا ہے کہ ان عقائد سے میری نجات یا بخشش بھی ہو جائے گی۔ یہ ہے ماحصل۔ یہ تو' عزیزانِ من! دنیا کا ہر مذہب' اپنے اپنے طریقے سے' یہ کچھ کرتا ہے۔ یہ پرکھنے کا کیا Touch stone ہے؟ یہ پرکھنے کی کیا کسوٹی ہے کہ آپ کے ہاں کے طریق سے یہ جو آپ نے پرستش کر لی ہے' یہ تو اس مقصد کو پورا کرتی ہے' خدا راضی ہو جاتا ہے' اس سے نجات ہو جاتی ہے' بخشش ہو جاتی ہے' ہندو جس طرح سے بھگتی کرتا ہے' کرسچن جس طرح سے اپنے ہاں Worship کرتا ہے' اس سے یہ نہیں ہوتا۔ آپ یہ کیسے ثابت

کر سکیں گے؟

## نوعِ انسانی کی حد تک دین کی طرف سے صلوٰۃ کا وہ نظام کہ جس نے ایران اور رومن جیسی تہذیب کو ہی ختم کر دیا تھا

دین یہ کہتا ہے کہ میں جو معاشرے کا نظام انسانیت کے لیے یہاں قائم کرتا ہوں اُس سے جو خوش آئند' خوشگوار نتائج مرتب ہوتے ہیں' عملاً وہ کسی مذہب کی رو سے نہیں ہو سکتے' انسان کے کسی بنائے ہوئے نظام کی رو سے نہیں ہو سکتے۔ پرکھنا چاہتے ہو تو پرکھ کر دیکھ لو' نبی اکرمؐ نے دین کا نظام بنا کر دکھا دیا' متشکل کر کے دکھا دیا' اور اس زمانے کی تاریخ جسے آپ ہم عصر تاریخ کہتے ہیں اس زمانے میں بڑی بڑی یہی ایران کی تہذیب اور رومن کی تہذیب دو تہذیبیں تھیں جب یہ نظام کھڑا ہوا ہے تو ان دونوں تہذیبوں کو دھندلا کے' گہنا کے' رکھ دیا۔ یہ تہذیبیں ہی ختم ہو گئیں' چل ہی نہیں سکتی تھیں' یہ تہذیب چھا گئی' ساری دنیا کے اوپر۔ یہ ثواب ہوا اس قوم کو۔ اس پہ پرکھا گیا' نہ دھرم والوں کا دھرم سامنے آتا تھا' نہ انسانوں کا بنایا ہوا نظام کوئی مقابلے میں آتا تھا۔ کہا ہے کہ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (9:33) قرآن حمید نے کہا ہے کہ یہ الدین وہ ہے کہ دنیا کے انسانوں کے بنائے ہوئے ہر نظام پر یہ غالب آ کر رہے گا۔ یہ ہے پرکھ اور یہ ایک انفرادی چیز تو ہے نہیں۔ ایک سپاہی کتنا ہی Efficient کیوں نہ ہو' کتنی ہی صحیح وردی کیوں نہ پہن رکھی ہو' جتنے وہ آرمی رولز' ریگولیشن ہیں' ایک سپاہی کو دیئے وہ بجا لا رہا ہے' وہ گاؤں میں صبح اٹھ کر گلیوں میں' اگر لیفٹ رائٹ کرتا پھرتا ہے' یہ تو مقصود نہیں ہے' نہ یہ کوئی نتیجہ پیدا کرتا ہے' اسے تو آرمی کی صف میں کھڑا ہونا پڑے گا' وہ آرمی کا جزو بنے گا' پھر اس کی یہ جو Efficiency صلاحیت اور قابلیت ہے' وہ نتیجہ خیز ہوگی' تنہا یہ سارے سپاہی بھی اپنی اپنی جگہ' اپنے اپنے گاؤں میں' یہ کرتے پھریں گے' تو کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوگا۔ یہ مذہب ہے' وہ دین ہے۔ ہر سپاہی کا Efficient ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ جب فوج اور فوج کا آپس میں تقابل ہوگا' مقابلہ ہوگا تو وہ تو یہ جو افرادِ فوج ہیں یعنی جن کو آپ سپاہی کہتے ہیں' وہ ان کے جوہرِ ذاتی' ان کی قابلیت' ان کی Efficiency' ان کا کردار' اس پہ بھی تو مبنی ہوگا' وہاں یہ کام دے گا۔ یہ بھی ضروری ہے لیکن اگر یہ کتنا ہی Efficient سپاہی کیوں نہ ہو' اپنے گاؤں کے اندر کھڑا الگ الگ پریڈ کر رہا ہے' اس کی Efficiency کسی کام نہیں آئے گی۔ یہ ہے مذہب اور دین میں فرق۔

## مذہب کا لفظ فقہ کا ایجاد کردہ ہے قرآن حکیم تو دین کی نظام کی بات کرتا ہے

مذہب کا تو لفظ ہی قرآن حکیم میں نہیں آیا۔ یہ تو بعد میں' جب یہ فقہ وغیرہ ہمارے ہاں مرتب ہوئی ہے' تو یہ اصطلاح ہی اس وقت ہوئی۔ یہ جو اصطلاح تھی' یہ اسلام کے لیے نہیں تھی۔ مذہب کے معنی ہوتا ''راستہ' طریقہ' جانے کی جگہ' وہ عقیدہ جس کی طرف کسی

کا رجحان ہو"۔ یہ اصطلاح ہے کہ فُلَانٌ یَذْهَبُ اِلٰی قَوْلِ اَبِیْ حَنِیْفَةَ ۔اس کے معنی ہیں کہ فلاں شخص امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کا پیروامام کا رہے' ابوحنیفہؒ کے مسلک کے مطابق چلتا ہے۔ یہ جتنے فقہ وغیرہ کے ائمہ تھے یہ ان کے مسلک پر چلنے کا نام مذہب تھا۔اب اس کے بعد انہی میں سے کسی کے مسلک پر چلنے کا نام اسلام ہو گیا' تو یہ لفظ اسلام کے لیے بھی استعمال ہونے لگ گیا۔اب مذہب اسلام ہی ہے۔انگریزی میں Religion کے سوا کوئی دوسرا لفظ ہی نہیں تھا۔ان کی Christianity (عیسائیت) تو Religion تھی' انہوں نے بھی اس کا ترجمہ Religion کیا' ہمارے ہاں والوں نے بھی ترجمہ Religion ہی کیا' اردو میں مذہب کیا انگریزی میں Religion کیا۔الدین کے لیے تو لفظ ہی کوئی نہیں تھا۔a system, an order آج کل کی اصطلاح میں ہیں۔ اس کے لیے لفظ نظام ہے۔اصل میں اس کے لیے جو ہے وہ دین ہے اس کے اندر اجتماعیت آتی ہے۔

## دین کا نظام ایک اجتماعی نتیجہ مرتب کرتا ہے

یاد رکھیے! اسلام کے یہ جتنے بھی ارکان ہیں' یا تو یہ جو احکام ہیں' یہ اس کے اجتماعی نظام کے علمبردار ہیں اس پروگرام کی مختلف کڑیاں ہیں' اس کے اجزاء ہیں' فوج کا جرنیل اگر اپنے ہیڈکوارٹر میں بیٹھا ہوا نقشہ بنا رہا ہے' وہ بھی اس نظام کا ایک جزو ہوتا ہے۔تو جیسے پھر سپاہی میدانِ جنگ میں عمل میں لاکر دکھا رہا ہوتا ہے' یہ سارے ایک نظام کے مختلف اجزاء ہوتے ہیں' جن پر عمل پیرا ہوا جائے تو وہ اس کا ایک Accumulative Effect ہوتا ہے۔ یہ اس نقشے بنانے والا کا بھی' اور اس سپاہی کا بھی جو میدان میں دشمن کے مقابلے میں کھڑا ہے' ان تمام کا ایک اجتماعی نتیجہ ہوتا ہے' جس کو آپ فوج کی فتح کہتے ہیں۔ یہ تھا یہ نظام قرآن حکیم کا' ایک ایسے معاشرے کا' نظام کا' تمدن کا' تہذیب کا' قیام کہ جو انسانیت کو عدل اور انصاف کی برکات سے متمتع کر سکے' انسانیت کو کسی خاص قوم کو نہیں' کسی خاص فرد کی بات نہیں' یہ ہے جس کا نام ہے اجتماعیت۔اب یہ جو کہا جائے کہ نماز تو جماعت کے ساتھ ہی ہوتی ہے' بالکل صحیح کہا ہے' سپاہی تو فوج کی صف کے اندر سپاہی ہے۔اب اس کا مفہوم سمجھ میں آجائے گا یہ جو اس پہ زور دیا گیا ہے۔

## زندگی کے حصول کی خاطر خدا کی آواز پر لبیک کہنے کی دعوت

اجتماعیت کے اوپر قرآن حمید میں تمام احکام جمع کے صیغے میں آئے ہیں اور جتنی چیزیں اجتماعی ہوں گی' واضح ہے کہ ان کے لیے ایک Appointed وقت ہوگا' متعین وقت ہونا چاہیے۔آپ یہاں جمع ہوتے ہیں' درس کے آخر میں یہ اعلان کرنا پڑتا ہے کہ اگلا درس اتنے بجے ہوگا۔ مجھے اکیلے آپ کو ملنے کے لیے تو الگ وقت کی بات ہے۔ یہ جو اجتماعی طور پہ آپ نے اکٹھا ہونا ہے' اس کے لیے تو ایک وقت متعین ہونا چاہیے۔اب یہاں سے بات سمجھ میں آجائے گی کہ قرآنِ کریم میں جو کہا' اب اس نے یہ بتانا تھا کہ جسے آپ صلوٰۃ کہتے ہیں یہ نہیں ہے کہ انفرادی طور پر جس وقت جس کا جی چاہے اس نے اپنے طور پر نماز ادا کر لی' یہ تو ایک مقصد کے

لیے اکٹھے ہونے کی بات تھی اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (4:103) صلوٰۃ جو ہے یہ ایسا فریضہ ہے جماعت مومنین کا کہ جو Appointed Time کے اوپر ادا کیا جائے گا۔ آپ یوں بہتر سمجھ سکتے ہیں جو وقت مقرر کیا گیا ہے اس وقت کے اوپر جمع ہوں گے تو یہ فریضہ ادا ہوگا' اس کے لیے ایک وقت مقرر کیا گیا ہے۔ یہ کا ہے کے لیے جمع ہوں گے؟ کہا کہ وَالَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ (42:38) کیا بات ہے استجاب کی! یہ قرآن حکیم کی بڑی اہم اصطلاح ہے''جو لوگ خدا کی آواز پر' اس کی دعوت پر لبیک کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں'' اور دوسرے مقام کے اندر یہ بڑی عجیب آیت ہے۔ یہ سورۃ انفال کی آیت ہے۔ کہا ہے کہ اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (8:24) خدا اور رسولؐ کی آواز پر لبیک کہو جب وہ رسول تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی عطا کردے۔ یہ دعوت اس نظام کی طرف تھی کہ جو زندگی عطا کردے اور ضمناً کہا جا رہا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (8:24) اے ارباب ایمان! اور ظاہر ہے کہ وہ زندہ تو ہیں یعنی یہ ایک چیز بڑی غور طلب ہے کہ وہ تو زندہ ہیں جن سے کہا جاتا ہے کہ لبیک کہو خدا اور رسول کی اس دعوت پر' اس بلاوے پر' اس Call پر' جو تمہیں زندگی عطا کردے۔ یہ زندہ انسانوں سے کہا گیا ہے کہ آؤ اس دعوت کی طرف' جو تمہیں زندگی عطا کردے۔ تو زندگی اور زندگی میں فرق ہوگیا۔ یہاں پہلی زندگی تو فزیکل لائف ہے' طبعی زندگی ہے۔ وہ تو حیوانوں کو بھی میسر ہے' کفار کو بھی میسر ہے' گنہگاروں کو بھی میسر ہے' فاسق و فاجر کو بھی میسر ہے۔ فزیکل لائف میں تو سب موجود ہوتے ہیں۔ تو قرآن حکیم اس لائف میں' جو صرف فزیکل سطح پہ زندگی تھی' ان لوگوں کو آواز دیتا ہے کہ آؤ! اس نظام کی طرف' جو تمہیں زندگی عطا کردے گا۔ تو مجھے یاد ہوتا ہے' پھر بار بار وہی آجاتا ہے۔ وہ بات تو غلط ہی ہے لیکن وہ جو شاعر نے فرق کیا ہے' وہ بڑا عمدہ فرق ہے کہ

زندگی عمر بھر نہیں ہوتی ❶

## عمر اور زندگی میں فرق کی نوعیت

عمر (Age) اور زندگی (Life) میں کیا فرق ہے؟ اس نے عمر طبعی ساٹھ سال پائی۔ یہ سال کا نام ہے۔ کتنی عمر ہوگئی؟ جی! ساٹھ سال کی ہوگئی۔ اس ساٹھ سال میں تمہارے زندگی کے دن کتنے ہیں؟ کہا ہے کہ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (8:24) اے وہ جو عمروں کے حساب سے اپنی زندگی کو گنتے ہو! آؤ تمہیں بتائیں کہ اس عمر میں تمہارے زندگی کے دن کتنے ہیں' تو کا ہے کے لیے آیا؟ کہا کہ وَالَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ (42:38) جو اپنے رب کی اس دعوت کے اوپر لبیک کہتا ہے۔ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ (42:38) اور قیامِ صلوٰۃ کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ جمع کا صیغہ ہے جی! جو شخص نہیں' جو لوگ اقامت صلوٰۃ کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ یہ کا ہے کے

---

❶ جی لیے چار دن جوانی میں — زندگی عمر بھر نہیں ہوتی

لیے ہے؟وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ (42:38) تا کہ ان کے تمام معاملات باہمی مشورے سے طے ہوں۔ یہ سوچیے تو سہی۔اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ (42:38) یہ اقامت صلوٰۃ اور باہمی مشاورت کتنا اہم معاملہ ہوگا جس کے لیے آواز دی جارہی ہے۔اس کی اصطلاح اقامت صلوٰۃ کس کے لیے؟ کس مقصد کے لیے یہ جمع ہوں گے؟ کہا کہ اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ (42:38) ان کے معاملات' ان کے باہمی مشاورت سے طے ہوں۔اس کے لیے وہ اکٹھے ہوں گے۔تو یہ تو اجتماعی چیز ہے۔

## ایسی اسلامی حکومت جو باہمی مشاورت سے قائم ہوگی اس میں ملوکیت نہیں ہوگی

عزیزانِ من! پھر آپ اسے دیکھیے قرآن مجید کے یہ ایک ایک چار چار الفاظ آپ کے سارے سیاسی الجھنوں کو دور کر دیتے ہیں' گتھیاں سلجھا دیتے ہیں مگر میرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہوں، یہ ہے اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ (42:38)اَمۡرُهُمۡ نے تو یہ بتا دیا کہ کسی ایک فرد کی حکومت یا اقتدار یا مملکت نہیں ہوتی' وہ ہم ہے' وہ پوری امت ہے اور پھر وہ کسی ایک فرد کی رائے سے نہیں آگے چلتی' وہ شُوۡرٰى ہے اور بَيۡنَهُمۡ ہے اور انہی کے ساتھ مشورہ ہوگا۔اگر وہاں غیر مسلم ہوں گے' تو ان کے ساتھ یہ مشورہ نہیں ہوگا' ان کا یہ امر نہیں' یہ ان کے لیے شوریٰ نہیں ہے۔بات میں یہ کہہ رہا تھا کہ صلوٰۃ یہ اجتماع کاہے کے لیے ہوا؟ کہا کہ اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ (42:38) امر کے لیے ہوا' نظام کے معاملات حکومت کے لیے ہوا' معاملات مملکت کے لیے ہوا' وہ معاملات جو ان کی اپنی ہے۔

## الصلوٰۃ کے لیے وقت کا تعین تو حکومت وقت کرے گی

باہمی مشاورت کے لیے تو ظاہر ہے کہ اس کے لیے تو پھر اجتماع ہی ہوگا۔جسے آپ انفرادی نماز کہتے ہیں کہ میں نے پڑھ لی ہے' یہ تو اجتماعی چیز ہے اور اس مقصد کے لیے ہے اور اب وہ بات سمجھ میں آئی کہ جب اس نے یہ کہا کہ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتۡ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ كِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا (4:103) یہ فریضہ وہ ہے کہ جو اس کے لیے وقت مقرر کیا جائے اس وقت کے اوپر وہاں حاضر ہوا کرو جو مملکت مقرر کرے' حکومت کرے گی' سربراہ مقرر کرے گا' وہ نظام مقرر کرے گا' اجتماع کے لیے یہ تاکید کی کہ وہ ایسے ہی نہ اس کو Lighgtly لیا کرو جو وقت مقرر کیا جائے اس وقت کے اوپر وہاں حاضر ہوا کرو کیونکہ بڑے اہم معاملات میں مشاورت کرنی ہے تم سے' اب سمجھ میں بات آ گئی کہ یہ کتاب موقوتا کیوں ہے؟ یہ دین تھا۔

## ہمارے ہاں لکھی گئی تاریخ کا معیار

میں نے عرض کیا ہے کہ ہمارے ہاں کی تاریخ تو عام اصول پر بھی پوری نہیں اترتی۔سچ تو یہ ہے کہ دین تو ایک طرف رہا وہ عام تاریخ کا بھی جو اصول ہوتا ہے' اس پہ بھی پوری نہیں اترتی۔دو اڑھائی سو سال بعد جا کر بغیر کسی قسم کے Previous Written

Record کے لکھی گئی۔ تاریخ کوئی مسالہ نہیں تھا۔ دواڑھائی سو سال بعد جا کے حدیثیں مرتب ہوئیں سب سے پہلی تاریخ بھی آپ کے اس دور میں اڑھائی سو سال بعد لکھی گئی جبکہ پہلے سے کوئی Written record موجود نہ تھا تو جو کچھ وہ مرتب ہوگی' کیا اسے آپ تاریخ کہیں گے؟ لیکن اس میں بھی بہرحال کچھ نہ کچھ تو چمکتی چیز مل ہی جاتی ہے۔ یہ ہے اس کے اندر کہ جب کوئی اہم معاملہ پیش ہوتا تھا تو اس وقت وہ ایک ڈونڈی پیٹنے والا جسے کہتے ہیں' منادی کرنے والا' اس زمانے میں یہی طریقے تھے' وہ شہر میں مدینے میں منادی کرتا تھا: **الصلوٰۃ الجامع' الصلوٰۃ الجامع** ۔ آؤ صلوٰۃ کے لیے جمع ہو جاؤ' یعنی وہ وہاں آتے تھے یہ ٹھیک ہے کہ جس طرح سے ہر اپنے عمل اپنے کام کی نسبت خدا کی طرف پہلے کرتے ہیں اس کے لیے یہ ٹھیک بات ہے کہ یہ بھی جو قرآن حکیم میں ہے کہ وہ صلوٰۃ کے لیے کھڑے ہوں تو امام یہ کرے اور مقتدی یہ کریں تو جیسے ہم اپنے اجلاس میں تلاوتِ قرآنِ کریم کی رسم پوری کرتے ہیں' وہ اس کی ابتداء اس طرح سے کرتے تھے کہ جو کچھ بھی ہم یہاں مشورہ کریں گے یا طے کریں گے' ہمارے امور جتنے بھی ہیں' وہ خدا کے مقرر کردہ نظام کے لیے ہیں' اس کی تعمیل کے لیے ہیں' اس کی اطاعت کے لیے یہ ہیں' اس کے لیے ایک رسم بھی ادا کرنا ضروری ہوتی ہے یعنی محسوس شکل میں' جسے آپ رسم کہتے ہیں' لیکن آواز یہی ہوتی تھی کہ ایک اہم معاملہ درپیش ہے اس کے لیے اکٹھے ہو جاؤ۔ یہ تھا کتابِ موقوت' جس وقت ضرورت پڑے' وہ اعلان کرتا ہوگا کہ اتنے بجے آ جائیے' جبھی ایک وقت میں اکٹھے ہو سکتے تھے کہ وقت مقرر کیا جائے۔ اب کتاباً موقوتاً آپ سمجھ لیجیے کہ معنی کیا ہوئے۔

## ہمارے ہاں کی نماز میں امت کے لیے اجتماعی قرآنی نظام کی تشکیل کی خاطر کسی مشاورت کا تصور تک بھی نہیں ہوتا

قرآن کریم کے لیے وہ جمع ہونے کا وقت یوں مقرر کرتے تھے۔ مذہب آیا تو اس موقوتاً کے معنی ہو گئے کہ پانچ وقت نماز کے جو مقرر کر دیئے۔ یہ ہو گیا اس نماز کے لیے کہ جو محض ثواب کی خاطر پڑھی جاتی ہے اس میں اجتماعی نتائج یا نظام کی کوئی صورت نہیں ہوتی' باہمی مشاورت کے یہ فیصلے' یہ جتنے بھی تھے' ان میں ایک ہی بنیادی شرط تھی کہ وہ خدا کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے کیے جائیں گے اس لیے جو بھی مشورہ کرنا ہوتا تھا' خدا کی یہ جو حدود ہیں ان کو پیش کیا جاتا تھا' ان کو دہرایا جاتا تھا۔ یہ تھی تلاوتِ قرآنِ کریم' جو ابتداء میں اب ہمارے ہاں رسماً رہ گئی ہے کہ اس معاملہ پیش نظر کے متعلق خدا کی رہنمائی یہ ملتی ہے' اس کی یہ حدود ہیں' اس کے یہ احکام ہیں۔ اب آیئے ان کی روشنی میں' ہم یہ باہمی مشاورت سے طے کریں کہ ان پر کس طرح سے عمل پیرا ہوا جا سکے گا۔ اس کے لیے یہ اجتماعات ہیں اور یہی وہ اجتماع ہے جس کے لیے یہ سورۃ الجمعۃ ہمارے سامنے آئی ہے۔

## عربی زبان میں لفظ یوم کا مفہوم

کہا ہے کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ (62:9) اے جماعت مومنین! جب معیّن 'یوم الجمعۃ کے لفظ کے معنی ہیں' اجتماعِ صلوٰۃ' یوم الجمعۃ کے صلوٰۃ کے لیے آواز دی جائے تو یہ بڑا اہم اجتماع ہے' جو کام بھی اس وقت کر رہے ہو' اس کو چھوڑ دو اور فوراً ادھر چلے آؤ۔ یوم کے معنی دن بھی ہوتا ہے' یہ بڑا وسیع المعنی لفظ ہے۔ عربی زبان کا ایک دن' تاریخ کا ایک پورا وقفہ' ایک Age ایک Period ایک زمانہ' ایک دور' ایک عہد' اور وقت کا تھوڑا سا لمحہ بھی ہوتے ہیں۔ جب ہم بھی کہتے ہیں کہ اس وقت میں نے یہ سوچا تو یہ وقت یہ ہوتا ہے' اس کے معنی وہ ذرا سا لمحہ ہوتا ہے۔ یہ یوم ان معنی میں بھی آتا ہے۔ عربی زبان میں کسی مقصد کے لیے جو متعین وقت ہے وہ بھی اس کا یوم ہے۔ اب یہ جمعہ کا تو لفظ ہی بتا رہا ہے: اجتماعیت' اکٹھے ہونے کا وقت' اس نظام کے انداز میں لیا جائے تو یہ وہی ہوگا۔ کہا ہے کہ نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ (62:9) اجتماع کے وقت کے لیے جب تمہیں بلایا جائے' آواز دی جائے تو کام کاج چھوڑ کر فوراً آ جایا کرو اور یہ اجتماعیت تو ہر صلوٰۃ کے لیے بھی ہو سکتی ہے اس کے لیے تو آواز نہیں ہوتی۔ یہ انفرادی یا انفرادی نماز' یہ تو ہم نے کہا کہ یہ تو تصور ہی نہیں ہے۔ قرآن کریم تو کہتا ہے کہ وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ (2:43) یہ تو اجتماعی چیز ہے' باقیوں کے ساتھ مل کر کچھ کرنا ہے۔ اس اعتبار سے تو ہر اجتماع کے لیے اسلامی مملکت یا حکومت کی طرف سے وہ جو آواز آئے گی' اس آواز کے اوپر لبیک کہتے ہوئے فوراً اکٹھا ہونا پڑے گا۔ یہ جسے کہیں گے کہ once for all اور قیامت تک کے لیے یہ اوقات مقرر کر دیئے۔ مذہب میں تو یہ ہے کہ ان اوقات کے اندر نہ وہاں کوئی مسئلہ درپیش ہے' نہ اس کے لیے کوئی مشورہ کرنا ہے' نہ یہ ہے کہ جب اہمیت ہو' جب بھی ضرورت پڑے' تب اس وقت آواز دینی ہے۔ وہ تو ایک ثواب کا کام ہے جس کے لیے آنا ہے' الگ الگ پڑھ لیجیے تو بھی ہو جاتی ہے' باجماعت پڑھیے تو ثواب زیادہ ہو جاتا ہے۔

## مذہب کے مقابل دین میں امام کا مقام اور اس کا فریضہ

وہ مملکت' وہ حکومت' وہ اس کے مشورے' وہ اس کی سیاست' اس کا تو اس سے دخل ہی نہیں ہے۔ یہ ثنویت (Dualism) ہے' وہ کام حکومت کا ہے وہ کرتی رہے گی۔ یہ مذہب والوں کا کام ہے' سربراہِ مملکت اور ہے' نماز کا امام اور ہے۔ دین میں دونوں ایک ہوتے ہیں۔ اس دور کی جیسی بھلی بری بھی تاریخ ہے' ہمارے سامنے صحیح یا اس میں اختراع ہوا ہو' اس میں بھی یہ چیز ہے کہ یہ الگ الگ مسجدوں کے اندر امام اس قسم کے نہیں رکھے ہوئے ہوتے تھے' حکومت کے جو اعمال تھے وہی یہ فرائض سرانجام دیتے تھے۔ اہم معاملے میں مشورہ کرنے کے لیے اجتماع ہوتا تھا وہ جو اس علاقے کا سیکرٹری یا ایس ایچ او کہہ لیجیے یا انجینئر کہہ لیجیے وہ اس علاقے کا

جو عامل اس کو کہتے تھے عربی زبان میں اس کا لفظ ہی یہ ہے: the Worker of the Government وہ یہ فریضہ ادا کرتا تھا۔ آواز دیتا تھا' وہ آتے تھے' وہاں باہمی مشاورت ہوتی تھی یہ ٹھیک ہے ابتداء ان کی خدا کے اقدار کے سامنے لانے سے یاد دہانی کرنے سے یہ ہوتا ہے اس کا ایک طریق مقرر کیا ہوا تھا۔ وہ ٹھیک یہ جسے صلوٰۃ کہتے ہیں' جس کو نماز کہتے ہیں' لیکن مقصد اس کا یہ تھا۔ وہ اس مقصد کے لیے تمہید تھی۔

## مذہب اور دین میں ثنویت پیدا کرنے کا نتیجہ اقبالؒ کے الفاظ میں ''رہ گئی رسم زاں' روح بلالی نہ رہی''

اسلام سے پہلے' عربوں کے ہاں بھی' وہ اگرچہ حکومت ان کے ہاں نہیں تھی' قبائلی زندگی تھی' لیکن اس قسم کی باہمی مشاورت سے معاملات میں فیصلے کرنے کے لیے اجتماعات' ان کے ہاں ہوتے تھے۔ یہ ان کے ہاں یوم العروبہ یا یوم الجمعۃ تھا۔ یہ ان کے ہاں جاہلیت کے زمانے میں بھی تھا کہ ایک جمع ہونے کا جسے آپ مشورہ گاہ کہتے ہیں ان کے ہاں بھی تھا اس کے لیے وہ بھی جمع ہوتے تھے لیکن میں اس سے بحث نہیں کرتا وہ مقرر شدہ اوقات ہوں once for all مقرر کر دیئے گئے ہوں کہ دن میں اتنی مرتبہ فلاں فلاں وقت میں آواز دی جائے تو آ جایئے یا ہفتے میں ایک دن کے لیے آواز دی جائے تو آ جایئے۔ یہ چیزیں جزئیات ہیں آج' جس مقصد کے لیے آ جایئے۔ وہاں فرق پڑتا ہے دین میں اور مذہب میں یہ نہیں آ جایئے' اور چپکے سے امام خطبہ دے تو خاموشی سے سنتے رہو' نہ امام کو پتہ کہ وہ عربی زبان میں جو بول رہا ہے' اس کے معنی کیا ہیں' نہ سننے والوں کو پتہ ہے کہ اس کے معنی کیا ہیں۔ لفظ وہی خطبہ آ گیا جس کے انگریزی کا ترجمہ ہی Address ہے You address a people خطاب تو ہم سمجھتے ہیں۔ اب دیکھیے ہمارے ہاں خطاب میں اور خطبے میں فرق ہو گیا۔ خطبہ تو وہی مذہبی ہوتا ہے جو جمعہ کو امام دیتا ہے' خطاب قوم کا ہر لیڈر کرتا ہے۔ دیکھا آپ نے یہ Dualism جو پیدا ہوئی مذہب اور دین میں' الفاظ وہی رکھے جاتے ہیں' ان کا مفہوم بدل جاتا ہے اور وہ اٹھ کر چھپا ہوا کتاب کے اندر' کسی زمانے کا چھپا ہوا خطبہ' پڑھتے۔

## دورِ ملوکیت کے وضع کردہ تصورات کے تحت خطبے کا انداز

ہم نے تو بچپن میں سنا تھا۔ وہ مولوی صاحب ایک خطبہ دیا کرتے تھے۔ اس خطبے کے اندر جو یہ چلا آ رہا تھا ملوکیت کے زمانے کا' وہ جو سلطانِ وقت یا خلیفہ یا بادشاہ ہوتا تھا' خطبے میں اس کا نام لیا جاتا تھا۔ ہمارے ہاں وہ مسجد تھی' ایک مولوی صاحب تھے' ان کے ہاں کوئی پرانے زمانے کا ہمارے ہاں تو جتنی کوئی پرانی چیز ہو جائے اتنی مقدس ہو جاتی ہے وہ چیز' پتہ نہیں کب کا وہ تھا' ہم بچے تھے' ہمیں تو معلوم نہیں تھا' وہ اس خطبے کے اندر پڑھتے پڑھتے اورنگزیب کا نام لیا کرتا تھا کیونکہ چھپا ہوا یہی تھا اور وہ سلطان ابن سلطان خاقان ابن خاقان وہ خلیفہ ابن خلیفہ پڑھتا تھا۔ خلیفہ خلافت بھی ہو گئی' ختم ہو گئی' قصہ ختم ہو گیا' خطبوں کے اندر اسی کا نام

پڑھتے چلے جارہے تھے کیونکہ وہ جو چھپا ہوا خطبہ تھا' پڑھنا تو وہی تھا' خطبہ مسنونہ اس کا نام تھا۔ اس میں جو لکھا ہوا تھا وہ پڑھتا تھا۔

## دین ایک اجتماعی سسٹم کا نام ہے اس کی نظر نتائج پر ہوتی ہے اور ان سے زندگی ثمر بار ہو جاتی ہے

عزیزانِ من! مذہب میں یہ رسم پوری ہو جاتی ہے اور اپنے آپ پر اطمینان ہو جاتا ہے۔ یہ فریب نفس ہوتا ہے' خود اپنے آپ کو مطمئن کر لینا ہے' یہ نتائج سے نہیں پرکھنا ہے کہ آیا یہ ہو گیا ہے یا نہیں۔ دین میں یہ جتنے بھی ارکان ہیں' یہ جتنے بھی پروگرام ہیں' یہ اس اجتماعی نظام کے ہیں جسے قائم کرنا اور باقی رکھنا جماعت مومنین کا فریضہ ہے اور اس کے نتائج۔ کہا کہ **اٰتِنَـا فِـی الـدُّنۡیَـا حَسَنَةً** (2:201) وہ ایک لفظ میں کہوں تو یہ ہے کہ اس نظام میں زندگی بڑی حسین ہو جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ جامع لفظ نہیں ہے' قرآن حکیم نے بھی تو یہی لفظ استعمال کیا ہے اور عاقبت کے لیے پھر آخرت بھی اس کے ساتھ ہے۔ یہ زندگی بھی حسین ہو جاتی ہے اور مستقبل کی زندگی بھی حسین ہو جاتی ہے۔ زندگی سے تعلق ہے ان تمام ارکان کا' جو دین نے قرآن حمید نے متعین کیے ہیں۔ یہ ایک فرد کے ذاتی اطمینان کی بات نہیں ہے' یہ تو ہر فرد اپنے طور پر اس اطمینان کو حاصل کر لیتا ہے۔ یہ جو کسی مذہب سے بھی متعلق نہیں ہوتے' یہ خانہ بدوش' اور اس قسم کے لوگ' ان کے ہاں بھی جا کر دیکھیے تو وہ ڈگڈگی بجا کر' کہیں گھڑا پیٹ کر ہی سہی' کہیں ناچ (Dance) کرنے سے سہی' وہ بھی اپنا اطمینان کر لیتے ہیں۔ یہ اپنا اطمینان تو کوئی Criterion یا معیار نہیں ہے۔ کسی چیز کے سچے یا غلط ہونے کا معیار تو وہ نتائج ہیں جو وہ پیدا کرتا ہے' جسے قرآن حکیم نے کہا ہے کہ تباہی ہے ان نمازیوں کے لیے جو نماز کو سمجھتے ہیں کہ یہ جو محسوس ارکان ہیں اس کا نام صلوٰۃ ہے' اس کے مقصود کو نظر انداز کیے ہوئے ہیں۔ نماز یہ پڑھتے ہیں اور رزق کو' جو بہتے ہوئے پانی کی طرح' ہر ایک کے لیے ہونا چاہیے تھا' اس پر بند لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ قرآن حمید کہتا ہے۔ کہ یہ تباہی ان نمازیوں کے لیے ہے (107:4)۔

## نظامِ صلوٰۃ کے لیے حضرت شعیبؑ کی دعوت پر اس کی قوم کا جواب

صلوٰۃ کا تو اتنا گہرا تعلق ہے جیسے شعیبؑ سے کہا کہ **قَالُوۡا یٰشُعَیۡبُ اَصَلٰوتُکَ تَاۡمُرُکَ اَنۡ نَّتۡرُکَ مَا یَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَاۤ اَوۡ اَنۡ نَّفۡعَلَ فِیۡۤ اَمۡوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّکَ لَاَنۡتَ الۡحَلِیۡمُ الرَّشِیۡدُ** (11:87) انہوں نے کہا کہ اے شعیبؑ! (تم جو کچھ کہتے تھے اس سے ہم نے سمجھا تھا کہ تم صرف پوجا پاٹ کا کوئی اپنا طریقہ لے کر آئے ہو۔ اس لیے ہم نے اس سے کچھ تعرض نہیں کیا تھا۔ ہمارے ذہن میں تھا کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کے طریقے پوجا پاٹ کرتے رہیں گے۔ تم اپنے طریق پر کرتے رہو۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ معاملہ صرف پوجا پاٹ کا نہیں۔ تیری صلوٰۃ صرف پرستش نہیں۔ یہ تو ہماری روزمرہ کی عملی زندگی کے اُن شعبوں میں بھی دخیل ہو رہی ہے جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں)۔ کیا تیری صلوٰۃ تجھ سے یہ کہتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑیں جن کی عبادت ہمارے اسلاف

کرتے چلے آئے ہیں اور یہ کہ نہ ہم جس طرح ہمارا جی چاہے دولت حاصل کریں اور نہ ہی جس طرح جی چاہے اسے خرچ کریں؟ چہ خوب؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے آباؤ اجداد جن سے یہ موجودہ نظام منتقل ہو کر چلا آ رہا ہے سب ظالم اور جاہل تھے اور عقل و فہم، تحمل اور بردباری، غریبوں کی ہمدردی اور غمخواری سب تمہارے حصے میں آ گئی۔ انہوں نے اپنی قوم سے یہ کہا کہ تم بہت مخالفت کرتے ہو۔ یہ سب کچھ ہے، ٹھیک ہے بھئی! مجھے صلوٰۃ کی تو اجازت دے دو۔ انہوں نے بھی سمجھا ہوگا کہ یہ ہماری طرح پوجا پاٹ پرستش کی کوئی رسم ہے جو ادا کرتا ہے کر لے، ہم اپنے طور پہ کر لیتے ہیں، یہ اپنے طور پہ کر لیا کرے گا اور قرآن کریم نے بات یہاں سے کہی کہ انہوں نے یہ کہا کہ او شعیب! ہم نے تو یہی نماز کا سمجھا تھا کیا تیری صلوٰۃ ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنے مال کو بھی اپنی مرضی کے مطابق خرچ کر سکیں؟ کیا بات ہے! شعیبؑ کی صلوٰۃ کی! کہ وہ اس کی اجازت نہیں دیتا، اس کے لیے یہ مال و دولت جو کمایا ہوا ہے، یہ محتاجوں مفلسوں غریبوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کھلا رکھنے کے لیے ہے، بند لگا کے رکھنے کے لیے نہیں ہے۔ سَاھُوْنَ (107:5) صلوٰۃ کا مقصد نہیں، ھُمْ یُرَآءُ وْنَ (107:6) جو چیزیں لوگ دیکھ سکتے ہیں، یہ وہ کچھ کر دیتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے صلوٰۃ کا فریضہ ادا کر دیا۔ صلوٰۃ کا فریضہ یوں ادا کیا اور جا کر وہ پانی کے چشمے کے آگے بند لگا کر اس کو اپنے کھیت کی طرف موڑ لیا (107:7) یہ ہے فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ الَّذِیْنَ (107:4)۔

## مذہب کے پیدا کردہ غیر قرآنی تصورات کی پیدا کردہ جہنم

عزیزانِ من! یہی نہیں کہ ان کو اس کا کوئی اجر نہیں ملے گا۔ کہا ہے کہ ان مصلین کے لیے تباہی ہے۔ یہ جو تباہیاں ہمارے اوپر آئی ہوئی ہیں، ہم تو شاید ابھی انتظار کر رہے ہیں کہ وہ تباہی کا جو تصور ہے یہ تو آئی ہوئی تباہی قیامت موجود ہے، عزیزانِ من! ہر دن جو ہے اس میں آ کے پھر شعلوں کا جہنم بھڑک رہا ہے۔ کہا ہے کہ نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ o الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ (104: 6-7) خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں کو لپیٹ لیا کرتی ہے۔ کوئی دل بھی خالی ہے اس معاشرے میں جسے اس آگ نے لپیٹ نہ لیا ہو؟ نماز پڑھنے والے مصلین کی تعداد تو کم ہوئی ہے۔ کم ہو گئی تو کوششیں یہ ہو رہی ہیں کہ ان میں اور اضافہ ہو جائے اور وہ جتنا کچھ کر رہے ہو، اس نے کیا کر کے دکھا دیا کہ جو اور اس میں اضافہ کر دو گے تم جو اضافہ کرنے والے ہیں وہ اسلام کے احیاء کے لیے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے بہت کچھ کیا، وہ کرنے والے اپنے طور پہ مطمئن ہو جاتے ہیں اور یہ تباہیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔

## نظامِ صلوٰۃ کو عملاً قائم کرنے کا نتیجہ اور یوم الجمعہ کا حقیقی مقصد

عزیزانِ من! یہ میرے کہنے کی بات نہیں، قرآن حمید میں جب کہا ہے کہ صلوٰۃ کا پہلا Criterion (معیار) یہ ہے کہ اس معاشرے سے برائیاں اور بے حیائیاں ختم ہو جاتی ہیں تو اس صلوٰۃ کو قائم کرو۔ وہ کہتا ہے، وہ پڑھو تو نہیں کہتا، قیام کہتا ہے۔ یہ

Establish کرنا ہے کسی ایسی چیز کو جس سے یہ برائیاں اور بے حیائیاں ختم ہو جائیں۔ کہا ہے کہ وہ کرو، وہ ایسا کرنا ہے کہ وہ صلوٰۃ والا مطمئن نہ ہو جائے کہ میں نے محسوس حرکات ادا کر دیں تو صلوٰۃ ہو گئی۔ کہا کہ یہ نہیں۔ اگر وہ رزق کے بہتے ہوئے سرچشمے پہ بند لگا لیتا ہے تو اس کی یہ جو صلوٰۃ ہے تباہی کا موجب ہے، فرد کا نہیں، معاشرے کی تباہی کا موجب ہے۔

یوم الجمعہ ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ خواہ وہ حکومت یہ آٹھویں دن مقرر کر دے، خواہ کسی وقت اس کے لیے Appoint کر دے، جو Appointed hour ہوگا، جب اس کے لیے آواز دی جائے، پکارا جائے تو **فَاسۡعَوۡا اِلٰی ذِكۡرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الۡبَيۡعَ** (62:9) چھوڑ دو کام کاج، بہت اہم معاملہ ہے جس کے لیے تمہیں بلایا گیا ہے کیونکہ **ذٰلِكُمۡ خَيۡرٌ لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ** (62:9) ذرا سا بھی سوچ سمجھ کر اس پہ غور کرو تو تمہیں پتہ چل جائے کہ کتنی بہتر بات ہے، جس کے لیے بلایا جا رہا ہے۔ کہا کہ **فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانۡتَشِرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ** (62:10) اور جب پھر یہ صلوٰۃ ختم ہو جائے، یہاں تو ٹھیک ہے، پھر جاؤ، کام کاج کرو۔ **وَابۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِ اللّٰهِ** (62:10) اور تلاشِ معاش میں نکلو، سب کچھ کرو جو پہلے کر رہے تھے۔ یہ اس کے لیے ہے جو تمہیں بلایا گیا تھا۔

## ذکر کے متعلق مذہب کا پیدا کردہ تصور

عجیب بات ہے، یہاں یہ ہے کہ جاؤ، دنیا میں تلاشِ رزق میں اور کہا ہے کہ **وَاذۡكُرُوا اللّٰهَ كَثِيۡرًا** (62:10) (جب تم جو کاروبار کے لیے نکلو) تو قوانین خداوندی کو ہر وقت اپنے پیش نظر رکھو۔ اب آج ایک یہ ذکر ہے ہمارے ہاں کا جو وہ ضربیں لگاتے ہیں، نہ آپ سوندے نیں، نہ اگلیاں نوں سون دیندے نیں (نہ خود سوتے ہیں، نہ دوسروں کو سونے دیتے ہیں) اب ذکر یہ ہو گیا۔

## ذکر کا قرآنی مفہوم کسی چیز کو کسی لحہ بھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دینا

یہاں پہلے کہا ہے کہ **فَاسۡعَوۡا اِلٰی ذِكۡرِ اللّٰهِ** (62:9) اس کے لیے بھی ہے اور اس کے بعد یہ ہے کہ یہاں سے یہ کچھ کرنے کے بعد جب نکل جاؤ، تلاشِ روزگار میں چلو، پھرو، تو وہاں اس سے بھی زیادہ ذکر کرو۔ ذکر کے لفظی معنی ہوتے ہیں ''کسی چیز کو ہر وقت نگاہ میں رکھنا''۔ یہاں آؤ تو جو معاملہ پیش نظر ہے، اُسے نگاہ کے سامنے رکھو کہ خدا کے ارشادات کیا ہیں تا کہ اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ یہ ہے مقصود و مطلوب۔ وہاں سے نکل کر دنیا میں جاؤ تو زندگی کے ہر گوشے میں ذہن میں رکھو کہ اس کے لیے خدا کا حکم کیا ہے۔ قرآن کریم نے اس کو ذکر کثیر کہا ہے کیا بات ہے قرآن کریم کی، عزیزانِ من!

## ذکر کے قرآنی معیار پر پورا اترنے کا زندہ ثبوت

کہا ہے کہ **لَّعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ** (62:10) یہ کاہے کے لیے ہے تا کہ تم ہر پروگرام میں، زندگی کے ہر مرحلے میں، کامیاب ہو

جاؤ۔اب یہ بات ہوگئی اور یہ ہوگیا معیار۔اگر اس میں کامیابی ہے تو یہ آپ کا اجتماع قرآنی اجتماع ہے' آپ کی صلوٰۃ قرآنی صلوٰۃ ہے' اگر وہاں ہر معاملے میں ناکامی ہورہی ہے تو یہ ساری رسوم ہیں' جو آپ ادا کر رہے ہیں۔آپ کا مطمئن ہوجانا اس بات کا کوئی معیار نہیں ہے کہ قرآن حمید نے جو فریضہ عائد کیا تھا' اسے ہم نے ادا کر دیا۔

## انگریز کے وقت پارلیمنٹ میں نابالغ لڑکیوں کی شادی کو ممنوع قرار داد دینے کا بل اور مولوی حضرات کی مخالفت

عزیزانِ من! ضمناً ایک بات یاد آگئی۔میرے استادِ محترم مولانا اسلم جیراجپوریؒ یہ بہت دیر کی بات ہے' آپ لوگوں کو معلوم نہیں ہوگا' انگریز کے زمانے کی پارلیمنٹ میں ایک بل پیش ہوا تھا۔ساردا اس کو کہتے تھے۔یہ بل ایک ہندو نے پیش کیا کہ نابالغ لڑکیوں کی شادی ممنوع قرار دے دی جائے۔یہ بل بڑا مشہور تھا۔یہ ہندو نے پیش کیا اور مسلمانوں کی طرف سے اس کی مخالفت ہوگئی اور مخالفت میں جب یہ دیکھا کہ حکومت مان نہیں رہی' میں تو شاہد ہوں ان چیزوں کا' میں درمیان میں موجود تھا' تو انہوں نے اس کے خلاف Agitation شروع کی کہ حکومت کرلے' جو کرنا ہے۔ایجی ٹیشن کا مرکز دہلی میں تھا ایک علاقہ فیروز باغ کہلاتا تھا وہاں جامعہ ملیہ اسلامیہ تھا' میرے استاد مولانا اسلم جیراجپوریؒ وہیں قریب میں رہتے تھے میں بھی وہیں رہتا تھا تو وہاں ایجی ٹیشن جو شروع ہوئی تو اس کا طریق یہ تھا اور آج ہمیں حیرت ہوتی ہے وہاں صرف یہ مولوی صاحبان ہی نہیں تھے' مولانا محمد علی جوہر جیسا شخص اس ایجی ٹیشن کا ہیڈ تھا یہ شخص کامریڈ کا ایڈیٹر تھا جس کی انشاء پردازی نے' صحافت میں سیاست میں' یورپ کی پارلیمنٹ کے در و دیوار میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔اعلان ہوا کرتے تھے کہ اپنے بچے بچیوں کو' جن کا تم نکاح کرانا چاہتے ہو' لے آؤ۔لوگ چھ چھ مہینے کے بچے گود میں اٹھائے ہوئے لیے چلے آرہے ہیں تانتا بندھا ہوا ہے۔نکاح تو کرنا ہی ہے' ایک تو ثواب یہی ہے۔دوسرے یہ کہ جو اس انگریز کے ایکٹ کی خلاف ورزی سے' جو ثوابِ عظیم حاصل ہوگا' اسکو کیوں گنواتے ہو' لوگ اس جہاد میں حصہ لینے کے لیے چلے آرہے تھے اور وہ وہاں بیٹھے ہوئے نکاح پڑھا رہے ہیں سوچتے ہیں کن ادوار سے یہ قوم گزری تھی؟

عزیزانِ من! اے کاش کہیں تاریخ لکھی جاتی! اس چیز کی ساری چیز جذبات کا مرقع تھی یعنی کوئی کھڑے ہوکر سوچتا نہیں تھا کہ کر کیا رہے ہیں چلے ہوئے ہیں صاحب! اس کے بعد ان کے ہاں طے یہ ہوا کہ ایک Deputation جائے' وائسرائے کے ہاں جائے اور وہاں جا کر کہے کہ مسلمانوں کو یہ قابل قبول نہیں ہے' ان کو مستثنیٰ قرار دیا جائے۔تو ڈیپوٹیشن جو وہاں بن کر چلا اس میں تمام فرقوں کے نمائندے تھے۔وہ جا رہے تھے تو مجھے اب تک یاد ہے' حضرتِ علامہ اسلم جیراجپوریؒ کی بڑی نگاہ تھی' بڑے قرآنی انسان تھے۔زبان پہ بارِ خدایا! یہ کس کا نام آیا! آنکھیں ڈھونڈ رہی ہیں میری ان لوگوں کو۔کہنے لگے' طبیعت میں شگفتگی بھی تھی' کہ یہ ہماری

تاریخ کا ایک عجیب سانحہ ہے کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کا جب بھی کبھی اجتماع ہوا ہے باطل پہ ہوا ہے۔ یہاں اس وفد میں ہر فرقے کا نمائندہ موجود ہوگا۔ یہ کہنے کے لیے جا رہے ہیں کہ نابالغ کی جو شادی ہے' ہمارے ہاں ممنوع نہ قرار دی جائے۔ ہر فرقہ اس میں متفق ہے۔ ان کے ہاں نکاح ہر فرقے کا الگ الگ ہوتا ہے کیا بات ہے کہ ہماری تاریخ کا یہ عجیب سانحہ ہے کہ اس میں مختلف فرقوں کا جب بھی اجتماع ہوا ہمیشہ باطل پہ ہوا۔ ایک احیائے اسلام کی یہاں بھی بات ہوئی ہے کہ چھٹی اتوار کے دن کی نہیں' جمعہ کے دن کی کی جائے۔ بڑا چرچا ہوا تھا۔ پھر کہو گے کہ پنجابی اچ کیندے نیں بڑی بھل ماری جناب (پنجابی میں کہیں گے کہ جناب! بڑا ہی کارنمایاں کیا!) بڑی مبارکباد دی کہ لیجیے صاحب! جمعہ کے دن کی چھٹی ہوگئی۔

## چھٹی کے سلسلہ میں عیسائیت کا یہودیوں سے باہمی اختلاف

پہلے تو ہفتے میں ایک دن کی چھٹی ہوئی تھی۔ یہ تصور ہی یہودیوں کا تھا۔ وہ اسے Holy Day کہتے ہیں یعنی مقدس دن۔ تورات میں یہ ہے کہ خدا نے چھ دن میں یہ ساری کائنات بنائی اور تھک گیا۔ یہ تورات میں ہے اور ساتویں دن پھر اس نے آرام کیا اور وہ دن سب کا تھا یعنی Saturday تو ساتویں دن چونکہ اللہ میاں بھی ساتھ وہیں سوتے رہے' اس لیے ان کے اتباع میں اس دن کاروبار بھی بند رکھتے تھے اور اس کا نام تھا ہولی ڈے (مقدس دن) یہ شروع شروع میں تھا آپ کو شاید اس تاریخ کا پتہ نہ ہوگا۔ یہ جو عیسائیت ہے' ان کے الگ قوانین نہیں تھے۔ یہودیوں میں قوانین ہی تو Follow کرتے تھے۔ یہ بھی اسی دن کو off ہوتے تھے' چھٹی مناتے تھے۔ بعد میں جب ان کے ہاں آپس کی مخاصمت ہوئی ہے تو پھر عیسائیوں نے یہ طے کیا کہ ہر وہ چیز جو یہودیوں کی ہے' ہم اس کے خلاف جائیں گے۔ ان کے ہاں سور حرام ہے ہم سور کھائیں گے۔ ان کے ہاں ختنہ کیا جاتا ہے' ہمارے ہاں ختنہ بند۔ یہ اس طرح سے ضد میں عیسائیوں کے ہاں یہ احکام بنے ہیں یہ ہفتے کے دن چھٹی کرتے ہیں' ہم اتوار کو کریں گے تو وہ چھٹی یوں ہوتی ہے۔ اب آپ کے ہاں وہ چلی آتی تھی ایک رسم اتوار کی چھٹی کی۔ انہوں نے کہا کہ اسلامی چھٹی ہونی چاہیے۔ جمعہ کے دن چھٹی اور کاروبار بند۔ اگر یہ معاشرتی مسئلہ ہوتا تو ٹھیک ہے ایک دن ہفتے میں off کر لیجیے۔ جمعہ سوٹ کرتا ہے' وہ کر لیجیے' نہیں' یہ اسلامی ہے اور اسلامی کی جو سند ہے خدا کا قانون' خدا کا قرآن حمید۔ جو خدا کی کتاب ہے' اس میں یہ ہے کہ جب جمعہ کی نماز کے لیے آواز دی جائے تو کاروبار چھوڑ کر ادھر آجایا کرو۔ تو پہلی چیز تو یہ ہوئی کہ جمعہ کی نماز سے پہلے سارا کاروبار کرنا ہے اور اس کے بعد یہ ہے کہ جب نماز ختم ہو جائے تو پھر جاؤ کاروبار میں اور تلاشِ معاش میں نکل جاؤ پھر اس کے بعد بھی کاروبار کرنا ہے۔ وہ جو جمعہ کی یعنی عجیب اتفاق ہے کہ اس کے متعلق قرآن حکیم میں یہ ہے کہ اس نماز سے پہلے بھی کاروبار کرو' نماز کے بعد بھی جاؤ کاروبار کرو' یہ وقفہ صرف نماز کے لیے ہے اب یہ جو اس قسم کی چیز کہ پہلے بھی کاروبار بند رکھو' بعد میں کاروبار بند رکھو' یہ تو قرآن حکیم کے اس حکم کے خلاف جا

رہا ہے۔ یہ احیائے اسلام ہے اور جس پہ تمام فرقے متفق ہیں۔ کہا ہے کہ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ (62:9) جب تمہیں ملی اجتماع صلوٰۃ کے لیے آواز دی جائے' تو سب کام کاج چھوڑ کر اس کی طرف لپک کر آ جاتا کرو۔ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ (62:10) تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

## اپنے متعلق یہ نہ کہو کہ ہم ایمان لے آئے ہیں تاوقتیکہ یہ ایمان دل کی گہرائیوں تک نہ پہنچ جائے

کہتا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ ابھی نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں۔ ان کی حالت یہ ہے۔ کہا کہ وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَۃً اَوْ لَهْوًا انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ[1] (62:11) یہ ضروری نہیں کہ جمعہ کے خطبے کے متعلق ہی یہ بات ہو۔ قرآن مجید نے بات عام کی ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ خصوصیت سے یہ جو منافقین اس زمانے میں آتے تھے' ان کی حالت تھی یا قرآن مجید نے یہ کہا ہے کہ یہ بدو لوگ جو ابھی نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں' ان سے کہیے کہ اپنے آپ کو یہ نہ کہا کریں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں' ان سے کہو کہ یہ کہا کریں کہ ہم تو اس مملکت کے سامنے جھک گئے ہیں' ہم نے سرنڈر کر دیا ہے اپنے آپ کو۔ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (49:14) ایمان ان کے دل کی گہرائیوں تک ابھی نہیں پہنچا تو ابھی نہ مومن کہیں اپنے آپ کو' بعد میں یہ ہو جائے گا لیکن ابھی تو یہ نہ کہیں تو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ جو مجمع تھا اس میں یہ لوگ بھی موجود ہوتے ہوں گے۔ وہ کچے ایمان والے کہا۔ ان کی صورت یہ ہے کہ یہاں باہر بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں اگر کوئی تجارت کا قافلہ آ گیا تو ان کے ہاں تو ہر وقت مارکیٹ نہیں ہوتی تھی' قافلے آتے تھے تو اس وقت ہی خرید و فروخت فوراً ہو جاتی تھی اور جو پہل کر لیتا تھا اس کو زیادہ منفعت ہوتی ہوگی' تجارت کا قافلہ کوئی آ جاتا یا ویسے ہی کوئی بندر نچانے والا' ڈگڈگی بجاتا' آ جاتا' کہنے لگے کہ ان کی یہ صورت ہے کہ تُو کتنی اہم بات کیوں نہ کر رہا ہو' تجھے چھوڑ جاتے ہیں اور اُدھر بھاگ جاتے ہیں۔ ان سے کہو کہ جس بات کے لیے تمہیں خدا یہاں بلا رہا ہے اور جو تمہیں وہ دے رہا ہے' وہ تجارت کے نفعوں سے بھی زیادہ منفعت بخش ہے اور یہ جو اس قسم کا کھیل تماشا ہے' اس سے بھی زیادہ زندگی کے لیے زیادہ لذیذ اور خوشگوار ہے۔ کہا ہے کہ وَاللّٰہُ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ (62:11) رزق کی بات ہی کہتے ہو۔ اس نظام کے تابع آپ نے دیکھنا ہے کہ کس طرح جھولیاں بھر بھر کے رزق تمہیں ملتا ہے اور ذرا توقف تو کرو۔ اتنی سی جو

---

[1] چونکہ یہ لوگ (جو نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے ہیں' ہنوز تربیت میں ناپختہ ہیں۔ اس لیے ان کی حالت یہ ہے کہ) جب دیکھتے ہیں کہ کسی اچھے کاروبار کا موقعہ ہے یا کوئی کھیل تماشا ہے' تو (اے رسول!) تجھے کھڑے کا کھڑا چھوڑ کر اٹھ دوڑتے ہیں۔ انہیں سمجھاؤ کہ تمہیں جو کچھ قوانین خداوندی کی رُو سے ملے گا' وہ اس تمام کاروبار سے زیادہ نفع بخش اور کھیل تماشے سے زیادہ جاذب ہے۔ یاد رکھو! جو سامانِ زیست' قوانین خداوندی کے مطابق ملتا ہے وہ بڑا ہی خوشگوار اور منفعت بخش ہوتا ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1316)۔

Temptation ہوتی ہے' اس کو Overcome نہ کرنے دو' اپنے اوپر نہ آنے دو' مسلط نہ کرو کہ ذراسی Temptation ہوئی اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ بات تو قرآن حکیم نے اس زمانے کے ان بدوؤں کی کہی ہے۔

## اگر کہیں بھی قرآنی معاشرہ وجود میں آچکا ہوتا تو نوجوان نسل کی کیا' کرہ ارض کی بھی یہ حالت نہ ہوتی

عزیزانِ من! کیا ہم سب کا یہی حال نہیں؟ کہ ذراسی کہیں سے Temptation ہو' یہ سوال نہیں ہے کہ وہ خطبہ دینے والا کیا کہتا ہے۔ اُسے ہم چھوڑ جاتے ہیں' سارے قرآن حمید کو چھوڑ جاتے ہیں' اسلام کو چھوڑ جاتے ہیں' دین کے اصولوں کو چھوڑ جاتے ہیں ذراسی Temptation ہو اور پھر یہ جو لہو ولعب کی Temptation ہے' کھیل تماشے کی Temptation ہے وہ تو پوچھو ہی نہیں صاحب! وہ سوداگری کی منفعت والی تو بڑوں کو ہوتی ہوگی' ہمارا تو نوجوان طبقہ ہے' یہ اس کے اندر بہے چلا جا رہا ہے۔ یہ کیوں ہے؟ اس لیے کہ خدا نے جو کہا تھا کہ ہمارے ہاں اس سے کہیں بہتر کچھ ہے۔ وہ کہیں بہتر ہے نہیں اس لیے یہ بہے چلے جا رہے ہیں۔ بہتر دیجیے تو کون پاگل ہے جس کو اپنے نفع نقصان کا بھی ہوش نہ ہو۔ دیکھیے خدا نے دلیل کیا دی ہے کہ جس چیز کے پیچھے یہ لپک کر جاتے ہیں' ہم اس سے انہیں بہتر دیتے ہیں اور اگر ذرا سا بھی عقل و ہوش سے کام لیں تو نظر آئے گا کہ بہتر کو چھوڑ کر کمتر کی طرف جانا تو اچھی سوداگری' اچھا کاروبار نہیں ہے صاحب!

سورۃ الجمعۃ کی یہ آیت آخری تھی' یہ ختم ہوگئی اور قریباً وقت بھی ختم ہوگیا۔ اگرچہ ہم نے درس دیر میں شروع کیا تھا لیکن ختم ہوا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگلی آیت کو اگلے درس میں لے لیا جائے۔ وہ ہم سورۃ المنٰفقون سے شروع کریں گے۔ وہاں بھی ابتدا ہی میں' پہلی ہی آیت میں' ایک بڑا اہم نفسیاتی سوال ہے جو حل کیا گیا ہے۔ اسے ہم آئندہ جمعہ پر رکھتے ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

# سورة المنٰفقون

# پہلا باب: سورۃ المنٰفقون (آیات 1 تا اختتام)

عزیزانِ من! آج اگست 1983ء کی 12 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المنٰفقون سے ہو رہا ہے۔ یہ 63 ویں سورۃ ہے۔

## منافقین کا عمل اور ان کی نفسیاتی کمزوری

اس سورۃ کی پہلی آیت ہی ایک عظیم حقیقت کی نقاب کشائی کرتی ہے۔ کہا یہ ہے کہ اِذَا جَآءَکَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ (63:1) منافق تمہارے پاس آتے ہیں اے رسول! تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ تُو اللہ کا

رسول ہے' تو وہ بالکل سچی بات کہتے ہیں۔ اس سے بڑی سچی بات اور کیا ہوگی کہ وہ حضورؐ سے آ کر کہتے ہیں کہ نشھد (63:1) ہم اس کی گواہی دیتے ہیں' تسلیم کرتے ہیں کہ تُو اللہ کا رسولؐ ہے۔ تو یہی بات سچی تھی اور اس میں سچے ہونے میں شبہ ہی نہیں تھا اور زیادہ اس کی تائید کی کہ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ وَاللّٰهُ (63:1)۔ اور خدا بھی جانتا ہے کہ' تو اس کا رسول ہے' تُو گویا ایک ایسی چیز ہے جس کی تائید خود خدا کر رہا ہے' وہ اس کی گواہی دے رہے ہیں کہ بات بالکل سچی ہے۔ اس میں کسی قسم کا شبہ نہیں لیکن کہا ہے کہ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ (63:1) خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں۔ ہیں!!! کہ وہ اتنی اہم سچی بات کہہ رہے ہیں' ایسی سچی کہ جس کے سچ ہونے کی شہادت خدا خود دے رہا ہے اور شہادت دیتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں۔ سچی بات کہی جا رہی ہے اور کہا جا رہا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں۔

## اصطلاح کا مفہوم متعین کیے بغیر مسائل کا حل ممکن نہیں ہو سکتا

میں نے عرض کیا تھا کہ یہ ایک عظیم حقیقت ہے کہ سچی بات کہنے والا بھی جھوٹا ہوتا ہے۔ خیر' آپ کو یاد ہوگا' درس میں یہ باتیں کبھی کبھی آ جاتی ہیں۔ ہمارے دور میں' حال ہی میں وائیٹ ہیڈ (Whitehead) ایک بہت بڑا افلاسفر مغرب میں گزرا ہے۔ فلاسفی تو اس کی بڑی اونچی ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جسے انگریزی میں Define کہتے ہیں' وہ Define کرتا ہے' چیزوں کی تعریف کرتا ہے۔ تعریف ہمارے ہاں ایک اصطلاحی لفظ ہے۔ اس کے معنی Praise کے نہیں ہوتے بلکہ جسے Define کرنا کہتے ہیں' وہ ایک چیز متعین کر دینا ہے۔ وہ اس کی بڑی خصوصیت ہے اور اس کا تو بلکہ دعویٰ یہ تھا کہ اگر کسی پرابلم کو Define کر دیا جائے تو آدھا مسئلہ اسی میں حل ہو جاتا ہے۔ وہ بڑی صحیح بات کہتا ہے۔ آپ کے ہاں یہ مسائل حل اس لیے نہیں ہو رہے کہ کوئی Define نہیں کرتا۔ مثلاً نظریہ پاکستان ہے' جس کے اوپر پاکستان کی بنیاد رکھی گئی' 35 سال ❶ سے کسی نے Define نہیں کیا کہ یہ نظریہ ہے کیا؟ اسلامی نظام' اسلامی شریعت' اسلامی قانون کسی نے Define نہیں کیا کہ اسلامی ہوتا کیا ہے۔ یہ سارے الجھاؤ' پیچیدگیاں' بحثیں نزاعات' اس لیے ہیں کہ Define نہیں کیا گیا۔ بہر حال یہ اس کے فلسفہ کی خصوصیت ہے کہ وہ کرتا یہ ہے۔ اس نے Truth (سچائی) کی Definition یہ دی ہے "Truth is conformation of appearane to reality" جو حقیقت (Reality) میں چیز ہے' جو کچھ ظاہر (Appearance) کی جا رہی ہے' اگر ان دونوں میں ہم آہنگی (Conformation) ہے تو اسے سچ (Truth) کہیں گے۔ اس Definition پہ بہت تعریف ہوئی کہ مسئلہ حل کر دیا۔ کسی نے اسے یہ نہیں بتایا کہ یہ بات آج جو آپ نے کہی ہے' یہ چودہ سو سال پیشتر' عرب کی سرزمین میں پیدا ہونے والے ایک امی کی زبان سے کہی گئی تھی کہ منافق کہہ رہے

---

❶ یاد رہے یہ بات اگست 1983 کی 12 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

ہیں کہ تُو اللہ کا رسول ہے اور خدا شہادت دیتا ہے کہ تُو واقعی رسول ہے لیکن وہ کہہ رہا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں۔

## دل و دماغ کی ہم آہنگی کی اہمیت کے سلسلہ میں قرآن حکیم کا ارشاد

سوال یہ ہے کہ یہ کیوں جھوٹے ہیں۔ کہا ہے کہ **یَقُوۡلُوۡنَ بِاَفۡوَاهِهِمۡ مَّا لَيۡسَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ** (3:16) یہ وہ بات کہتے ہیں جو دل سے نہیں مانتے تو گویا جو بات ان کے دل میں ہے وہ ان کی زبان پہ نہیں ہے۔ Reality & Appearance کے درمیان ہم آہنگی نہیں ہے اس لیے یہ جھوٹے ہیں لیکن بات سچی ہے یہ جھوٹے ہیں کیونکہ قلب اور زبان میں ہم آہنگی نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص کے علم میں ایک بات ایسی آئی ہو جو صحیح نہیں ہے' غلط ہے لیکن وہ دل سے Believe کرتا ہو کہ واقعی ایسے ہے اور اسی طرح سے وہ کہہ رہا ہو۔ بات وہ غلط ہوگی مگر یہ جھوٹا نہیں ہوگا۔ آپ اس کو یہ کہہ سکتے ہیں۔ آپ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔ دل اور زبان ہم آہنگ ہے' بات جھوٹی ہے' یہ سچا ہے۔ اس کے برعکس اگر ان کا دل اور زبان ہم آہنگ نہیں ہے' بات سچی ہے' یہ جھوٹے ہیں۔ Truth کی یا جھوٹ کی Definition اس انداز سے چودہ سو سال پہلے اس دور کا کوئی انسان یہ بات کہہ نہیں سکتا تھا' یقیناً یہ فکرِ انسانی سے مافوق سرچشمہ علم تھا' جہاں سے یہ بات کہی گئی کہ بات باون تولے سچی ہے' خدا شہادت دیتا ہے کہ یہ سچی بات کہہ رہے ہیں لیکن یہ جھوٹے ہیں کیونکہ دل اور زبان میں ہم آہنگی نہیں ہے اسی لیے اقبالؒ نے کہا تھا کہ

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق' دل اور زبان کے اندر رفاقت ہو' پھر وہ بات سچی ہوتی ہے' یہ نہ ہو تو سچی بات کہنے والا بھی جھوٹا ہوتا ہے۔ یہ جو چیز ہے' وہ مولانا ظفر علی خان مرحوم نے جوان کا ترنگ کا اپنا انداز ہوتا تھا' جس میں وہ کہا کرتے تھے' کہا ہے کہ

نکل جاتی ہو سچی بات جس کے منہ سے مستی میں
فقیہہ مصلحت بیں سے وہ رندِ بادہ خوار اچھا

## آج ہمارے ہاں معاشرتی تباہی کی بنیادی وجہ

آپ سمجھ گئے وہ کیا کہہ رہا ہے۔ فقیہہ مصلحت بیں سے وہ رندِ بادہ خوار اچھا۔ نکل جاتی ہو سچی بات جس کے منہ سے مستی میں۔ آپ کے دور میں اس وقت جس قدر بھی جرائم عام ہو رہے ہیں' برائیاں عام ہو رہی ہیں' معاشرہ سارے کا سارا بگڑا ہوا ہے' اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دل اور زبان ہم آہنگ نہیں۔ آہستہ آہستہ تجربے نے جب یہ بتا دیا کہ یہ ہم آہنگی نہیں ہے تو آپ کا اعتماد ہی اٹھ گیا۔

## آج ہمارے ہاں ہر سو معاشرتی بربادی کی بنیادی وجہ

اور اب یہ ہے کہ

نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری

نہ سیاست میں، نہ مذہب میں، نہ معاشرے میں، نہ معاشرت میں، نہ معیشت میں، کسی مقام کے اوپر بھی، کسی دوسرے پر آپ کا اعتماد ہی نہیں کہ یہ ٹھیک کہتا ہے، یہ سچ کہتا ہے۔ اسی کو قرآن کریم نے منافقت کہا ہے۔ آپ موقع پرستی کہہ لیجیے، مفاد طلبی کہہ لیجیے، کچھ بھی کہیئے، یہ ایک چیز ہے جو آپ کے معاشرے کے اندر عام ہوگئی ہے کہ جو کچھ بظاہر نظر آتا ہے، فی الحقیقت وہ وہ نہیں ہوتا۔ ہمارا سارا معاشرہ آج منافقت پہ مبنی ہوگیا ہے اور قرآن حمید کہتا ہے کہ خواہ یہ بات سچی بھی کہیں لیکن یہ جھوٹے ہوتے ہیں جو سامنے آتا ہے، جو کہا جاتا ہے کہ یہ ہے، وہ درحقیقت نہیں ہوتا۔ قرآن حکیم نے ایسے معاشرے کے لیے کہا ہے کہ مُحِيطٌ بِالْكٰفِرِيْنَ (2:19)۔ یہ سارا معاشرہ اس کی لپیٹ میں آجاتا ہے؟ پھر۔ اس معاشرے کے اندر ہماری یہ جو مصلحت بینی سے، جو اسلام یہاں رائج کیا گیا، پہلے تو وہ سارا اسلام منافقت پہ مبنی، زندگی کی ضرورتوں کے لیے جھوٹ بولنا واجب ہوجاتا ہے، اجازت نہیں کہ صرف اجازت ہے کہ صاحبق مارلو، جھوٹ بولنا واجب ہوجاتا ہے ❶۔

## آج مذہب میں سچ کی جگہ جھوٹ بولنا واجب ہے اور پھر معاذ اللہ اسے سنت رسولؐ کہا جاتا ہے

مذہب میں ایک چیز ہوتی ہے فرض، جو خدا نے کہی ہو۔ اس کے بعد عام طور پر ایک چیز ہے جسے سنت کہتے ہیں۔ ایک چیز واجب ہوتی ہے، یہ فرض سے ذرا ہی نیچے ہوتا ہے۔ واجب کو ترک کردینے سے بھی گناہ ہوتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ ''جھوٹ بولنا واجب ہوجاتا ہے''، یعنی وہاں اگر سچ بولیں تو گناہ ہوگا۔ کہا یہ گیا کہ کسی مخالف کو مکاری فریب سے قتل کرادینا۔ معاذ اللہ۔ سنتِ رسول اللہ ہے۔ کہا گیا کہ ابتدائے جماعت سازی کے لیے بڑے بڑے بلند آہنگ اصول پیش کردینا اور لوگوں کو ساتھ ملا لینا اور اس کے بعد جب اقتدار حاصل کرنے کا وقت ہو تو ان تمام اصولوں سے پھر جانا، یہ اسوہ رسول اللہ ہے۔ معاذ اللہ۔ نہ خدا کا خوف، نہ رسول اللہ کی ناموس کا کوئی پاس، نہ اقدار کا کوئی کسی قسم کا بھی لحاظ، اور اس کا نام اسلام ہے۔ تو جب یہ اسلام معاشرے کے اندر عام ہو جائے تو آپ سوچیے کہ کس طرح سارا معاشرہ اس کی لپیٹ میں نہیں آجائے گا۔ پہلے اگر کسی کے دل میں وہ جو پنجابی میں کہتے

---

❶ یاد رہے کہ یہ بات امیر جماعت اسلامی مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے کہی تھی کہ ''راست بازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہوں میں بدترین برائی ہے لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خار جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض معاملات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے (حوالہ ترجمان القرآن، مئی 1958ء اور طلوعِ اسلام جنوری 1968ء ص 3)

ہیں کہ کرک تھوڑی سی ہوندی سی (تھوڑی سی خلش ہوتی تھی) کہ میں نے جھوٹ بولا ہے' دھوکا دیا ہے' اس سے وہ کرک ہی اٹھ گئی' سارے مطمئن ہوگئے کہ یہ تو اسلام کے مطابق ہے جو کچھ ہم کر رہے ہیں۔اب سارا ہی معاشرہ اس کی لپیٹ میں آ گیا۔آپ غور کیجیے گا جہاں جہاں آپ کو انسانوں سے معاملہ پڑتا ہے وہاں آپ کا پہلا ردِعمل کیا ہوتا ہے؟ یہی چیز کہ پتہ نہیں کہ جو کچھ یہ کہہ رہا ہے کہ یہ سچ بھی کہہ رہا ہے یا نہیں؟

## منافقت تو ہر جگہ شب و روز کا عمل بن چکا ہے

انسانوں سے آگے بڑھیے' عزیزانِ من! یہ جو منافقت ہے کہ جو کچھ نظر آتا ہے' درحقیقت وہ وہ نہیں ہوتا' صبح سے شام تک دیکھیے! دودھ کہہ کر جو آپ کو دیا جاتا ہے' وہ دودھ نہیں ہوتا' ظاہر میں اور باطن میں ہم آہنگی نہیں ہوتی یعنی Reality (حقیقت) میں اور Appearance (ظاہر) میں ہم آہنگی نہیں ہوتی' جو چیز آپ گھی سمجھ کر خرید رہے ہوتے ہیں' وہ گھی نہیں ہوتا۔ان چیزوں کا تو تجربہ شاید ذہن میں ہو' میری بیٹیاں بہنیں بیٹھی ہیں' اب یہ اس کی گواہی دیں گی کہ جسے مونگ کی دال کہہ کر لایا جاتا ہے شکل تو اس کی مونگ کی دال کی ہوتی ہے۔کیوں بیٹیو پکانے کے بعد وہ مونگ کی دال ہوتی ہے' ماش کی دال؟ اب مصیبت یہ ہے کہ ہم لوگوں نے ابھی کل ماش اور مونگ کی دالیں کھائی تھیں۔اب وہ جو ماش کی دال آتی ہے تو نظر تو ماش کی دال آتی ہے پتہ نہیں وہ کیا ہوتا ہے۔چنے کی دال نایاب ہوگئی ہے۔بیسن بیسن کہہ کر لیا جاتا ہے' بیسن نہیں ہوتا۔یہ روز کی سبزیاں' بڑی تروتازہ' یا لک ٹنڈے لوکی کریلا' آپ دیکھ لیجیے ان میں سے کوئی سبزی پکائیے' اس کا ذائقہ وہ نہیں ہوتا جو اس سبزی کا ہوتا تھا جو اس سے پہلے پکتی تھی۔روز کا صبح شام کا یہ ہمارا قصہ ہے۔انسانوں میں ہی منافقت نہیں' ان اشیاء کے اندر منافقت آئی۔پھل دیکھیے! آج کل ذرا آم دیکھیے تو سہی۔یہاں کا آم دنیا بھر میں مشہور تھا۔اس کی اتنی ورائٹی اور یہ اتنا عمدہ چیز تھا۔اب آپ موسم میں آم دیکھیے! دیکھنے کے اندر نہایت عمدہ آم لیجیے' دوسہری لیجیے' سندھڑہ لیجیے' چونسہ تک بھی صاحب! لیجیے۔وہ پڑے ہوئے نہایت عمدہ نظر آتے ہیں۔کسی اچھے سے آم کو کاٹ کر دیکھیے! یا تو گلا سڑا نظر آئے گا یا کیڑے نظر آئیں گے اور اگر ایسا نہیں ہے تو ذائقہ تو اس کا وہ ہوگا ہی نہیں جو ہوا کرتا تھا۔حقیقت (Reality) اور Appearance (ظاہر) کے اندر کوئی ہم آہنگی (Conformation) نہیں ہے۔انسان تو انسان رہے ہمارے ہاں کی تو اشیاء منافق ہوگئی ہیں اور یہ قوموں کے اوپر خدا کا عذاب ہوتا ہے کہ جب انہیں اس معاشرے میں زندگی بسر کرنی پڑے کہ حکیم صاحب نے کہا ہے کہ اس کو ماش کی دال' مونگ کی دال کا شوربہ دیجیے اور جو آپ دیں' وہ مونگ کی دال نہ ہو۔یہ ابتدائی چیز' پہلی چیز قرآن حمید نے یہاں کہی' جو کہہ رہے ہیں سچ ہے' خدا شہادت دیتا ہے کہ بالکل صحیح بات ہے' لیکن یہ جھوٹے ہیں۔یہ بات اس زمانے کے منافقین ہی کی نہیں کی جارہی' یہ ایک ابدی حقیقت ہے جسے بیان کیا جا رہا ہے کہ سچ وہ ہے جس میں دل اور زبان' جس

میں Appearance (ظاہر) اور Reality (باطن) جس میں باطن اور وجود دونوں ہم آہنگ (Conform) ہوں تو وہ سچ ہے کہنے والا سچا ہے۔ اگر یہ نہیں ہے تو خواہ بات سچی ہو کہنے والا منافق ہے۔ کہیے کہ اس معیار کو ذرا عام کریں پھر دیکھیں کہ کیا صورت پیدا ہوتی ہے۔ آپ کی یہ اتنی چنے کی دالیں کیا دھلنے کے بعد وہ ویسی ہی نظر آتی ہے۔ چہروں پہ سے نقاب اٹھ جائے گا۔ معیار یہ رکھ دیا جاتا ہے۔

## منافقت اپنی ہوتی ہے اور ڈھال اسلام کو بنایا جاتا ہے

لیکن میں نے عرض کیا ہے کہ جب اس چیز کو اسلام بنا دیا جائے تو اب منافقت اسے کہا ہی نہیں جائے گا۔ اسے ایک نظریئے کے طور پہ پیش کرتے ہیں اس نظریئے کو اسلامی کہہ کر پکارا چلا گیا ہے تو اب پھر انسان اور کہاں جائے جب اسلام یہ کچھ بن جائے۔ معاذ اللہ معاذ اللہ۔ جب ''اسلام'' یہ تعلیم دیتا ہو تو پھر کفر کے لیے کہیں جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ کہا ہے کہ **اِنَّ الْـمُـنٰـفِـقِـیْـنَ لَكٰذِبُوْنَ** (63:1) کیا بات شدت سے کہی ہے قرآن حکیم نے! بالکل یقینی بات ہے یہ۔ کہا کہ **اِتَّخَذُوْۤا اَیْـمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَـنْ سَبِیْـلِ الـلّٰــهِ** (63:2) یہ کہتے ہی نہیں قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ یار! بالکل ٹھیک ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ اپنی قسم کو اپنی منافقت کو چھپانے کے لیے یہ ڈھال بناتے ہیں۔

## خدا کی طرف جانے والوں کے راستے میں خود ساختہ اسلام سب سے بڑی رکاوٹ ہے

کہا ہے کہ **فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ** (63:2) کرتے کیا ہیں؟ خود تو ڈوبے تھے خدا کی طرف جانے والے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی راست باز رہنا بھی چاہے اگر کوئی فریب کاری نہ بھی کرنا چاہے صحیح راستے پہ چلنا بھی چاہے تو راستے میں ہی اگر کہہ دیا جائے کہ نہیں میاں! یہ جو فریب کاری اس قسم کی تم کہتے ہو فریب کاری نہیں ہے یہ اسلام ہے بالکل اسلام کے مطابق ہے یہ سنت رسول ہے۔ معاذ اللہ! بالکل ایسی ہے تو وہ پھر رکے گا ہی نہیں۔ کہا کہ خود بھی اپنی ان فصلوں کو ڈھال بناتے ہیں اپنی فریب کاریوں کے لیے خدا کی طرف جانے والے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کہا کہ **اِنَّهُـمْ سَـآءَ مَـا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ** (63:2) کس قدر بری روش ہے جو انہوں نے اختیار کر رکھی ہے! **ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا** (63:3) یہ اس لیے ہے کہ انہوں نے زبان سے کہا ''ہم ایمان لائے'' اور وہ درحقیقت کفر کا کفر تھا۔ ہر آن ہر سانس میں کفر اور ایمان کی کشمکش ان کے اندر رہتی ہے۔ دل میں کفر ہوتا ہے زبان پہ ایمان ہوتا ہے۔ یہ ہے دلوں پر مہر۔

## دلوں پر مہر خدا نہیں لگاتا بلکہ انسان کی اپنی بدعملی اس کے نامہ اعمال کو سیاہ لباس پہنا دیتی ہے

کہا کہ **فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ** (63:3) وہ جو ہے کہ پھر ان کے دلوں پر مہر لگ گئی وہ ہم کہا کرتے تھے کہ صاحب! وہ ختم

اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِھِمۡ(2:7) کے معنی ''خدا نے مہر لگا دی' وہ خدا ہی نے مہر لگا دی' تو پھر وہ خدا الزام کا ہے کا دے رہا ہے عزیزانِ من! خدا نے مہر نہیں لگا دی۔ پہلے تو منافقت کی یہ حقیقت بیان کی پھر یہ کہا کہ ہر سانس میں کفر اور ایمان کی کشمکش چلی آ رہی ہے' پھر اس کے بعد کہا کہ دلوں پہ مہر لگی اور اگلی بات ہے کہ کیوں لگی؟ کہا کہ فَھُمۡ لَا یَفۡقَھُوۡنَ (63:3) وہ عقل وفکر سے کام نہیں لیتے' جذبات کے پیچھے چلتے ہیں۔نظر آ گیا کہ جسے دلوں پہ مہر لگ جانا کہتے ہیں وہ خدا مہر نہیں لگاتا' انسان جب عقل وفکر سے کام لینا چھوڑ دے اور جذبات ہی کے پیچھے چلے' مفاد پرست ہو جائے' Opportunist ہو جائے' موقعہ پرست ہو جائے' پھر آہستہ آہستہ سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو جایا کرتی ہیں۔

## جھوٹ بولنے کی روش کا نتیجہ انسانی معاشرے کو بے یقینی کے عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے

ان بڑے بڑے لوگوں کو دیکھیے مفاد پرست موقعہ پرست ہیں' جہاں اپنے مفاد کی بات نہیں آئے گی' یہ اتنے بڑے دانشور نظر آئیں گے آپ کو سمجھ سوچ والے علم وعقل والے لگیں گے لیکن جہاں اپنی مفاد پرستی کی بات آئے گی' یہ ہر قسم کا فریب دیں گے اور یہ بات اتنی سی نہیں سوچیں گے کہ اگر یہی روش ہر ایک نے اختیار کر لی' سوچیے' عزیزانِ من! اگر صورت یہ ہو کہ ہر شخص جھوٹ بولے اور آپ یہ جانتے ہوں کہ یہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ یہ ہے کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے' تو کس عذاب میں آپ کی زندگی ہو جائے گی۔ یہ اتنی بات نہیں سمجھتے ہیں کہ اگر یہ روش عام ہو جائے جو انہوں نے اختیار کر رکھی ہے تو یہ کتنا بڑا جہنم ہو گا جس میں زندگی گزرانی پڑے گی۔ وہ اس لیے ہے کہ جھوٹ بولنے والا جھوٹی بات کہہ کر آخر میں یہ نہیں کہتا کہ دیکھو میاں صاحب! میں نے یہ جھوٹ بولا ہے' اسے سچ نہ سمجھ لینا تو وہ جھوٹ تو کامیاب ہی نہیں ہو سکتا وہ اس وقت کامیاب ہو گا کہ قدم قدم پر آپ کے ساتھ وہ قسمیں کھاتا چلا جائے کہ میں نے بالکل سچی بات کہی ہے' لفظاً لفظاً سچ ہے' اس میں ذرا جھوٹ نہیں ہے' وہ یقین دلاتا چلا جائے اور اگر آپ کو یہ یقین ہو کہ یہ لَکٰذِبُوۡنَ (63:1) ہے' یہ ابھی تک بالکل جھوٹ بولتا ہے اس لیے جھوٹ کا معاملہ بھی چل رہا ہے کہ آپ ہر ایک کے متعلق یہ نہیں فرض کر لیتے کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ جھوٹ معاشرے پر محیط ہو جائے تو معاشرہ جہنم بن جاتا ہے' اب بھی جہنم بن چکا ہوا ہے۔ ہم قیامت موجود کا انتظار کر رہے ہیں کہ وہاں جا کر جہنم آئے۔

## جھوٹے آدمی کی شخصیت اندر سے گھن کھائی ہوئی لکڑی کی طرح ہوتی ہے

کہا ہے کہ وَاِذَا رَاَیۡتَھُمۡ تُعۡجِبُکَ اَجۡسَامُھُمۡ وَاِنۡ یَّقُوۡلُوۡا تَسۡمَعۡ لِقَوۡلِھِمۡ(63:4) کیفیت ان کی یہ ہے کہ بظاہر دیکھیے تو بڑے شریف آدمی نظر آتے ہیں' بڑے دیانتدار' بڑے ایماندار ہیں۔ اسے کہتے ہیں کہ بہت عمدہ قد کاٹھ ہے' شخصیت نہایت شریف نظر آتی ہے اور ایسے باتونی کہ جب وہ بات کریں تو تُو بھی کان لگا کے سننے لگ جائے کہ سن تو لوں کہ یہ کیا کہتے ہیں یعنی ان کا

First impression یہ ہوتا ہے۔ یہ آتے ہی نہیں کہہ دیتے کہ میں آیا ہوں اور میں جھوٹ بولوں گا جو کچھ کہوں گا اور میں تمہیں فریب دینے کے لیے آیا ہوں' نہیں کبھی کوئی یہ بات نہیں کہے گا' بڑے معتبر بنیں گے' بڑے ایماندار بنیں گے' باتیں ایسی معصومانہ انداز سے کریں گے کہ تُو کان لگا کر سنے لیکن درحقیقت یہ ہیں کہ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ (63:4) بظاہر تو ایسے بنے ہوئے ہیں' درحقیقت ان کی کیفیت یہ گھن کھائی ہوئی لکڑی کی ہے۔ گھن کھائی ہوئی لکڑی کو کبھی آپ نے دیکھا ہے' اوپر سے وہ لکڑی بالکل صحیح سلامت ہوتی ہے' اندر سے کھوکھلی ہوتی ہے۔ اب تو ہمارے ہاں کے وہ شہتیر نہیں رہے ورنہ پہلے تو یہ لکڑیوں کے شہتیر ہوا کرتے تھے' روز اس چھت کے نیچے سوتے ہیں' رہتے ہیں' شہتیر دیکھ رہے ہیں' بالکل ٹھیک ٹھاک نظر آ رہا ہے' کسی دن ذرا سے اوپر ایک بچے نے یوں دھمکی دی' وہ دھڑام سے نیچے گر گیا۔ وہ دیکھا کہ اندر سے کھوکھلا ہو رہا تھا۔ کہا کہ منافقین کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ بظاہر بڑی صحیح سلامت لکڑیاں نظر آتی ہیں' گھن کھائی ہوئی لکڑیاں تو اپنے سہارے پہ کھڑی نہیں ہو سکتیں' کسی اور سہارے پہ ٹیک لگا کر کھڑی ہوتی ہیں' اندر سے گھن کھائی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان کی اس قدر کھوکھلی شخصیت ہوتی ہے۔

## جھوٹی یا منافق کھوکھلی شخصیت ہمیشہ دوسرے کے سہارے کی محتاج بھی ہوتی ہے اور بزدل بھی

قرآن حمید نے یہ عجیب چیز کہی ہے یہ لکڑیاں کسی نہ کسی چیز کا سہارا لیے ہوئے کھڑی رہتی ہیں' اپنی شخصیت کا سہارا نہیں' وہ تو گھن کھائی ہوئی ہوتی ہے اور سہارے ہوتے ہیں جن کے آسرے یہ کھڑے ہوتے ہیں اور دھوکا دے سکتے ہیں کیفیت ان کی یہ ہوتی ہے۔ یہ بڑی عجیب بات کہی ہے۔ منافق سب سے زیادہ بزدل ہوتا ہے۔ اول تو اس بات پر ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ جو بات جھوٹ بول گیا ہوں' فریب دے گیا ہوں' وہ کہیں بات کھل نہ جائے۔ یہی چیز اب جھوٹ کے اوپر' فریب کے اوپر ہے کہ جو کچھ بنایا ہوا ہوگا اس کو Face کرنے کی جرأت اس کے اندر نہیں ہوتی' بڑا بزدل ہوتا ہے۔ یہی اگلی بات قرآن حکیم نے کہی ہے بزدلی کی یہ کیفیت ہے کہ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ(63:4) کہیں ذرا پتہ کھڑکا اور انہوں نے کہا کہ آئی موت ہماری۔ یہی وجہ ہے کہ یہ منافق جن میں کچھ Stand لینے کی جرأت نہیں ہوتی' کہیں ذرا اس کو شبہ بھی پڑے کہ میری مخالفت میں یہ کچھ ہوتی ہے وہ اس میں بوکھلا اٹھتا ہے اور بوکھلا جانے میں تو پھر آپ کو معلوم ہے' میں کہا کرتا ہوں کہ وہ بلی کمرے میں بند ہو جائے تو بلی کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ شی کرو' بھاگ جاتی ہے لیکن جب کمرہ بند ہو جائے اور اسے معلوم ہو کہ خطرہ ہے تو پھر اس بوکھلاہٹ میں وہ آخری حربے استعمال کر لیتی ہے' آنکھیں نوچ لیتی ہے۔ یہ ہوتا ہے۔

## قرآن حکیم نے جھوٹے شخص کی ظاہرداری سے ہمیشہ محفوظ رہنے کی تاکید کی ہے

کہا ہے کہ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ(63:4) بزدل ایسے کہ کہیں ذرا سا کھٹکا ہو تو ان کی جان نکل جائے کہ ہم پر کوئی

مصیبت آئی۔ دل میں ہر وقت دغدغا کہ کہیں ہمارے خلاف کوئی سازش تو نہیں ہو رہی؟ بظاہر بڑے محکم اور پائیدار' بباطن بالکل کھوکھلے اور بے جان۔ یہ ہے ان کا عالم۔ جماعت مومنین سے کہا کہ هُمُ الْعَدُوُّ (63:4) ان کی ظاہرداری پہ نہ جانا' یہ تمہارے سخت دشمن ہیں۔ اس لیے فَاحْذَرْهُمْ (63:4) بڑی احتیاط برتو ان سے قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ (63:4) کہا کہ ان کا ستیاناس جیسے ہم اپنے ہاں یہ کہتے ہیں کہ ان کو خدا سمجھے یہ عربی زبان کا محاورہ ہوتا ہے کہ خدا ان کو تباہ کرے' خدا سمجھے ان کو' ستیاناس ان کا۔ کہا کہ اَنّٰی یُؤْفَكُوْنَ (63:4) سمجھ بوجھ کی صلاحیتیں رکھنے کے باوجود' یہ کدھر بہتے جا رہے ہیں' یہ روش تو تباہی کی روش ہے' خود بھی تباہ ہوں گے' معاشرے کو بھی تباہ کریں گے' کدھر بہتے چلے جا رہے ہیں۔

## قرآن حکیم کی اصطلاح استغفار کا حقیقی مفہوم

آگے کہا کہ وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا یَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَیْتَهُمْ یَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ [1] (63:5)۔ یہاں ہے استغفار کہ آؤ رسول کی طرف' وہ تمہارے لیے استغفار کرے۔ تو استغفار تو ہمارے ہاں بخشش کے معنی میں آتا ہے۔ مغفرت ہی اس معنے میں آتی ہے تو تمہارے لیے رسولؐ بخشش کی دعا کرے اور وہ سر پھیر کر چل دیتے ہیں' خود بھی چل دیتے ہیں' دوسروں کو بھی روکتے ہیں کہ ادھر نہ جانا' بڑے تکبر کے لہجے میں یہ کرتے ہیں۔ تو یہ کیا بات تھی کہ وہ تمہارے لیے بخشش کی' مغفرت کی دعا کرے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ رسولؐ نے ہی کچھ کرنا تھا۔ یہ تو منافقت برتتے۔ یہ جو قرآن حکیم کی اصطلاحیں ہیں عزیزانِ من! ان میں یہ ایک استغفار ہے' مغفرت وغیرہ ہے۔ یہ درس کے اندر بار بار آ چکی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ استغفار کے معنی ہوتے ہیں ''غلط روش پہ چلنے والا' جب اپنی غلطی کا احساس کر لے' تو وہ پھر کھڑا ہو جاتا ہے' اس مقام پہ' آگے نہیں بڑھتا' لیکن اتنی سی چیز تو کافی نہیں ہوتی' پھر وہ پیچھے پلٹتا ہے' جس غلط راستے پہ چلتا آ رہا تھا' اسے چھوڑ کر صحیح راسے پہ چلنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ جو پلٹنا ہے' یہ توبہ ہے اور یہ صحیح راستے پہ اس کے بعد جو چلنا ہے' یہ اصلح ہے۔'' یہ ہے استغفار۔ قرآن حمید نے مَن تَابَ وَ اَصْلَحَ کہا ہے۔ جس نے اپنی غلطی کا احساس کر لیا وہ اس سے رک گیا' اس سے پلٹ گیا اور پھر صحیح رستے پہ چل پڑا۔ کہا کہ اس سے غلط راستے پہ چلنے سے جو اس کا نقصان ہوا تھا صحیح راستے پر چلنے سے اس کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ یہ جو کسی کے متعلق یہ کہنا ہے کہ آؤ بھئی! یہ صحیح راستہ ہے' میں تمہیں بتاتا ہوں' اس کے اوپر چلو' اس کے نقصانات سے اس کا ازالہ ہوتا ہے' اس کی حفاظت ہوتی ہے۔ اسے مغفرت کہتے ہیں۔ وہ اپنے لیے مغفرت خود کرتا ہے۔ یہ جیسے ہم دوسرے کے لیے کہتے ہیں وہ اتنی سی بات ہوتی ہے کہ اس کی راہنمائی صحیح راستے کی طرف کی جاتی ہے اس کے لیے چاہا جاتا ہے کہ وہ اپنے نقصانات سے محفوظ رہ جائے۔ محفوظ اس نے خود رہنا ہوتا ہے' چلنا اسی نے ہوتا ہے۔

---

[1] جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم آؤ (اور اپنی لغزشوں اور کوتاہوں کا اقرار کرو) تا کہ خدا کا رسولؐ تمہارے لیے نظام خداوندی سے سامانِ حفاظت طلب کرے' تو وہ اس سے اعراض برتتے ہیں۔ ذرا رکتے ہیں اور متکبرانہ انداز سے چل دیتے ہیں۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1318)

## ہمارے ہاں لفظ استغفار کا استعمال تسبیح کے دانے پھیرنا اور یا پھر حضرت صاحب سے دعا کرانا ہوا

اب ہمارے ہاں اس کا نام استغفار ہوا۔ اس استغفار کے لیے طریق کیا ہے؟ یہ کہ وہ صبح اٹھے۔ استغفر الله رب من کل ذنب و اتوبوا علیه، استغفر الله رب من کل ذنب و اتوبوا علیه تسبیح رکھی ہوئی ہے، ڈھیر لگا ہوا ہے، دانے پہ دانہ چل رہا ہے: استغفر اللہ استغفر اللہ۔ یہ استغفار ہو گیا اور اس سے بھی آگے بڑھے، خود اتنا بھی نہیں کرنا، حضرت صاحب کے پاس تشریف لے جا رہے ہیں، حضرت صاحب! میری مغفرت کے لیے دعا کیجیے، دعا کیجیے کہ اللہ میرے گناہوں کی بخشش کرے۔ گناہوں کی بخشش کے لیے ان سے دعا منگواتے ہیں اور اس کا نام استغفار ہے۔ قرآن حمید نے تو ایک ہی اصول بتایا تھا کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (11:114) یاد رکھو! غلطیاں ہوگئی ہیں، اس سے کچھ نقصانات ہوگئے ہیں، اس کے ازالے کی صورت یہ ہے کہ اس سے زیادہ بہتر کام کرو۔ کیا بات ہے! غلط غذا کھانے سے کمزوری ہوگئی ہے، بیماری ہوگئی ہے، علاج بھی کرو اور اس سے بہتر Nutrition والی غذا کھاؤ، کمزوری ہوگئی ہے، اس کا بھی ازالہ ہو جائے گا اور اس کے بعد اور بھی بالیدگی یا نشوونما ہو جائے گی۔ استغفار اس کا نام ہے اس کا نام مغفرت ہے اور سارا دارومدار بخشش پر ہے۔ جنت، اعمال کی وجہ سے نہیں مل سکتی، صرف خدا کی بخشش کے ساتھ مل سکتی ہے اور پھر ساتھ آیا شفاعت۔

## مسلم کی ایک حدیث

شاید آپ کو وہ حدیث یاد ہو جو عام طور پہ کوٹ (Quote) کرتے ہیں اور وہ حدیث یہ ہے، یہ مسلم کی حدیث بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ اگر اے قومِ مومنین، اے مسلمانو! اگر تم نے گناہ نہ کیا تو خدا تمہیں اٹھا لے گا اور تمہاری جگہ ایک اور قوم لے آئے گا جو گناہ کرے گی تاکہ خدا کی بخشش ظہور میں آ جائے۔ سودا او بیچنا اوُنے تسی نا خیر دار بنو گے تے ہور بن جان گے۔ چلو اوئے چل۔ دوسرے خریدار (اس نے سودا بیچنا ہے۔ تم نہیں خریدو گے تو دوسرے خریدار بن جائیں گے)۔ معاذ اللہ! یہ مسلم کی حدیث ہے مغفرت بخشش استغفار ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ یہ جرائم عام ہو رہے ہیں صاحب! جنہیں اتنی ضمانت مل جائے اور واجب ہو جائے کہ اگر گناہ نہ کرو گے تو خدا تمہیں اٹھا کر لے جائے گا تمہاری ساری کی ساری قوم ہی ختم کر دے گا، تمہاری جگہ ایسی قوم لائے گا جو گناہ کرے گی، پھر ہاں خدا سے بخشش مانگے گی۔

## رسولؐ کا شیوہ زندگی

کہا ہے کہ يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ (63:5) کے معنی یہ ہیں کہ رسولؐ کی طرف آئے، جتنی غلطیاں تم کر چکے ہو، ان کی وجہ سے جو نقصانات ہوئے ہیں، وہ تمہیں بتائے گا کہ ان نقصانات کا ازالہ کس طرح سے ہو سکتا ہے۔ تو وہ تو صحیح راستے پہ چلنے کی بات ہی کرے

گا اور اسی لیے کہا کہ وہ یہ سنتے ہیں تو سر مٹکا کر کہتے ہیں' چل دیتے ہیں' کوئی ادھر جانے والا ہوتا ہے' اسے بھی روک دیتے ہیں کہ نہ جانا' وہ تو تمہیں پتہ ہے کیا کچھ کہہ رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جھوٹ بولنا چھوڑ' فریب کرنا چھوڑ دیجئے' صحیح راستہ اختیار کرو' دیانتداری اختیار کرو' وہ تو یہ کہہ رہا ہے۔ اس لیے ادھر نہ جانا' بڑھے' وہ تصور میں چل دیتے ہیں۔ کہا ہے کہ سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ اَسۡتَغۡفَرۡتَ لَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ لَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ(63:6) یعنی ایسی قوم کے لیے' ایسے لوگوں کے لیے تو لگتا ہے وہ انہیں یہ صحیح راستے کی طرف دعوت دے یا نہ دے' راہنمائی کرے یا نہ کرے' جنہوں نے پہلے سے فیصلہ کر لیا کہ ہم نے یہ بات ماننی نہیں ہے' انہیں اس وعظ ونصیحت کا فائدہ کیا ہوگا' اس طریق سے نہیں' یہ گناہوں کے' یہ جرائم کے نقصانات کا ازالہ ہوا کرتا' اب یہ جو ذہن میں تھا کہ لَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ (63:6) کے معنی ہوں تو خدا بخشش کرے گا ہی نہیں ان کی' یہ ترجمے ہو جاتے ہیں ان کے کہ تو بخشش کی دعا مانگ یا نہ مانگ' خدا تو ان کی بخشش کرے گا ہی نہیں' تو چلو فیصلہ ہو گیا کہ رسول بھی بے شک کوشش کر کے دیکھ لے' یعنی یہ ان کے ترجموں کے مطابق خدا اس کے باوجود نہیں کرے گا' پھر آ گئی ذمہ داری خدا کے اوپر کہ وہ نہیں کرے گا' وہ تو خدا ہے' اس نے جونہی یہ دل میں شبہ پیدا ہوا' اسے پتہ تھا اس نے فوراً آ کر کہہ دیا کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِيۡنَ (63:6) جو قوم صحیح پیٹرن چھوڑ کر اپنے لیے غلط پیٹرن اختیار کر لے' وہ صحیح راستے پہ کیسے چل سکتی ہے۔ وہ جو تھے کہ خدا یہ نہیں کرے گا' اس کے بعد تو خود بتا دیا کہ کون لوگ ہیں جن کے لیے خدا کچھ نہیں کرے گا۔

## قرآنی نظام کے استحکام کی خاطر صدرِ اوّل کی مصائب و آلام سے بھرپور زندگی کا عکس

کہا ہے کہ هُمُ الَّذِيۡنَ يَقُوۡلُوۡنَ لَا تُنۡفِقُوۡا عَلٰى مَنۡ عِنۡدَ رَسُوۡلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنۡفَضُّوۡا [1] (63:7) بڑے سخت جانگداز مراحل میں سے گزرنا پڑا تھا صدرِ اوّل کی اس جماعت مومنین اور نبی اکرمؐ کو۔ میں نے عرض کیا ہے کہ سات سال کی مدت میں قریباً بیاسی بڑے بڑے جنگ اور جھڑپیں ہوئیں۔ اتنی مدت کے اندر' اتنی چھوٹی سی کمیونٹی کے اندر' ضرورت تھی کہ وہاں ان چیزوں کی تیاری کے لیے' استحکام کے لیے' خرچ بھی کیا جائے۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ خود تو سوال ہی نہیں کہ اس کے لیے یہ کچھ دیں' دینے والوں کو بھی روکتے ہیں کہ انہیں کچھ مت دینا' یہ تمہارے خلاف خرچ کریں گے۔ کہا کہ وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَلٰـكِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ لَا يَفۡقَهُوۡنَ (63:7) انہیں پتہ نہیں ہے کہ یہ جماعت مومنین اس مشکل کے زمانے میں جو کچھ لے گی وہ

---

[1] ان کی حالت یہ ہے کہ (خود نظام خداوندی کی مدد کرنا تو ایک طرف) یہ دوسرے لوگوں سے بھی کہتے رہتے ہیں کہ جو لوگ اس رسولؐ کے ساتھ ہیں تم انہیں کوئی مالی مدد نہ دو۔ اس طرح (جب یہ بھوکے مریں گے تو) خود ہی اس کا ساتھ چھوڑ کر تتر بتر ہو جائیں گے اور اس طرح اس کا مشن ناکام رہ جائے گا۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 19-1318)

درحقیقت جسے آج کہتے ہیں کہ انوسٹ کرے گی' وہ ایک مدت کے بعد انہیں کیا معلوم ہے کتنے گنا ہو کر وہ ملے گا۔ جس نظام کے Establish (قائم) کرنے کے لیے اور استحکام کے لیے یہ اتنا خرچ کریں گے' جب وہ قائم ہوگا تو پھر آپ دیکھیے گا کہ ان کو کتنے گنا زیادہ ملتا ہے لیکن منافق اس بات کو سمجھ نہیں سکتا۔ وہ تو فریب کاری سے ہی کوئی سودا کرتا ہے' دیانتداری سے سودا کرنے میں' آخرت میں' آخرالامر کیا ملتا ہے' وہ یہ بات سمجھ نہیں سکتا' جو بے ایمان ہے جو بددیانت ہے۔

## آپؐ کے خلاف منافقین کی ریشہ دوانیاں

کہا ہے کہ یَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ [1] (63:8) یہ کہتے ہیں کہ کوئی بات نہیں اب یہاں سے یہ بات قریباً میدانِ جنگ کی ہو رہی ہے۔ یہ باہر سے' وہاں ہو رہی ہے کہ یہ مدینے میں واپس جائیں تو دیکھیے گا کہ ہم وہاں کے بڑے بڑے سرداروں کو کس طرح ان کے خلاف بھڑکاتے ہیں اور وہ کس طرح انہیں مدینے سے نکال باہر کرتے ہیں۔ سوچیے' عزیزانِ من! کن مشکلات کا سامنا تھا' انہیں معلوم تھا کہ مدینے میں ان کے ہمنوا' اتنے بڑے بڑے موجود لوگ ہیں کہ جا کر ان سے کہیں گے کہ ہم تو کچھ نہیں کر سکے' وہ انہیں مدینے سے نکال دیں گے اس لیے کہ یہ اذل ہے۔ انہوں نے کہا کہ بڑے کمزور واقع ہوئے ہیں' ذلیل واقع ہوئے ہیں۔ وہ یہ کہتے تھے کہ جو بظاہر مسلمان ہوئے تھے' اپنے آپ کو اس جماعت میں شمار کراتے تھے۔ یہ ان کی طرف سے ہو رہا ہے۔ کھلے ہوئے دشمن تو ایک طرف رہے' وہ جو قریش تھے یہ ان کی طرف سے ہو رہا تھا۔

## اگر الفاظ کی اس کی اپنی حرمت کو پیش نظر نہ رکھا جائے تو زندگی کا تصور ہی بدل جاتا ہے

کہا ہے کہ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ [2] (63:8) انہیں کیا معلوم ہے کہ جسے قوت کہتے ہیں' وہ کیا ہے۔ یاد رکھیے' عربی زبان میں عزت کے معنی ''قوت'' کے ہوتے ہیں' عزیز کے معنی ''صاحب قوت'' ہوتا ہے۔ میں نے ایک دن پہلے بھی لفظ غنیمت کا بتایا تھا کہ اس لفظ کے معنی بدلتے بدلتے پھر یہ کہاں تک چلے جاتے ہیں' عزت کے معنی ''قوت'' کے اور ہمارے ہاں پھر وہ جو عزت ہے اس کے معنی کیا ہو گئے اور پھر عزیز کے معنی ''صاحب قوت'' اور ہمارے ہاں یہ ہے کہ ''عزیز'' ہماری ان کے ساتھ عزیز داری ہے' وہ اپنے عزیزوں میں سے ہے یعنی معنی بدلتے گئے' پھر انہیں کچھ معلوم نہیں کہ قوتِ

---

[1] یہ کہتے ہیں کہ ہمیں مدینہ واپس پہنچ لینے دو' پھر دیکھنا کہ وہاں کے زور آور لوگ' ان کمزور اور ذلیل انسانوں کو کس طرح وہاں سے نکال باہر کرتے ہیں؟ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1319)۔

[2] ان سے کہو کہ خدا کے ہاں' کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں' رزق کے خزانے بھرے پڑے ہیں۔ اسے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ منافق اس بات کو کیا جانیں! (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1319)۔

بالآخر رسول اور اس کے ساتھیوں کی جماعت مومنین کے قدم قدم پہ ہے کہیں یہ ہے کہ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ (63:7) اور کہیں ہے کہ مُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (63:8) تو بات ساری تفقہ کی تدبر کی ہے علم و بصیرت سے معاملے کو سمجھنے کی ہے۔ یہ نہ کیا جائے تو وہ بات بھی منافقت کے اندر آ جاتی ہے یعنی بغیر علم و بصیرت اور تدبر اور شعور کے کوئی بات مانی ہوئی بھی ہو تو وہ آپ زبان سے مان لیتے ہیں دل کی گہرائیوں میں نہیں اتری ہوئی ہوتی کسی بات کے ماننے کے لیے یہ غور و تدبر کشت اوّل ہے ضروری ہے۔

## مذہب میں غور و تدبر سے کام لینا حرام ہونے کی وجہ سے اس کے پاس کیوں کا جواب نہیں ہوتا

یہی غور و تدبر ہے جو مذہب میں آپ کے اوپر حرام قرار دے دیا جاتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ان کے ہاں مذہب کے عقائد پہ بڑے سے بڑا اشدت کے ساتھ بھی عقیدے رکھنے والے کو کہیے کہ آپ کیوں یہ مانتے ہیں ان کے پاس کیوں کا جواب نہیں ہوتا اور جو ایمان عقل و فکر کی بنیادوں پہ لایا جاتا ہے اس کا ٹیسٹ ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ کیوں کا جواب دیتا ہے اور خدا جو چیز منواتا ہے کیوں کا جواب دے کر منواتا ہے۔ **لعلکم** تا کہ یہ بحث ہو تو تفقہ اور تدبر اور تعلم سے جو کام نہ لینا ہے قرآن منافقین کی روش بتاتا ہے۔

## مال و دولت کی ہوس یا بچوں کا غلط پیار انسان کی گمراہی کا سبب بن سکتا ہے

کہا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (63:9) یہ تو باہر کے دشمن ہیں۔ ان کے متعلق تو تم سے کہا کہ وہ کھلے ہوئے دشمن ہیں یہ قریش ڈھال کے سپر کے پیچھے چھپے دشمن منافقین ہوئے۔ کہا کہ یاد رکھو! مال و دولت کی ہوس اور بال بچوں کا غلط پیار تمہیں کہیں قوانین خداوندی سے غافل نہ کر دے۔ مال و دولت کی temptation بڑی دکھتی ہوئی رگیں ہیں کتنے ہی جرائم ہیں جو اس کی وجہ سے ہوتے ہیں اور اگلی بات یہ ہے کہ وہ جو بال بچوں کے متعلق کچھ کرنے کی فکر ہے اپنے لیے تو وہ دو وقت کی روٹی ہے اس کے لیے کسی کو بچوں کی پرورش کے لیے ہی چلیے کتنا کچھ چاہیے اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ پھر اس مرنے کے بعد ان کے لیے کچھ چھوڑ کے بھی تو مرنا ہے ان کے لیے صاحب! اب یہ جتنی پراپرٹی وہ کہتا ہے کہ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (102:2) لگے ہوئے ہیں اس ریس کے اندر چلے جا رہے ہیں ضرورت تو پوری ہونے کی ایک حد ہوتی ہے اور وہ پوری ہو جاتی ہے اور یہ جو تکاثر ہوتا ہے اولاد کے لیے پھر آگے بنانے کا قصہ چل پڑتا ہے یہ جائیدادیں پہ جائیدادیں گھڑی کرتے چلے جا رہے ہیں صاحب! کہا کہ یاد رکھو! یہ ہوس یہ روش تمہیں کہیں تباہ نہ کر دے۔ لَا تُلْهِكُمْ (63:3) تمہیں خدا کی روش سے غافل نہ کر دے۔ یہ بات یہ جذبات غالب نہ آ جائیں۔ ٹھیک ہے پرورش ضروری ہے حفاظت اسی حد تک ضروری ہے جس حد تک قوانین خداوندی حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے آپ کرو جائز طریقے سے آپ کرو جائز و ناجائز ہر طریقے سے یہ چیز کہ صاحب! اولاد کے لیے بھی تو کچھ رکھنا ہے یہ نہ کرو۔

## پروگرام کو نتیجہ خیز ہونے کے لیے ایک وقت درکار ہوتا ہے

کہا ہے کہ وَمَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ[1] (63:9) یہ کچھ یہ سمجھ کر کرو گے کہ یہ بڑی منفعت بخش چیز ہے' اس لیے کر رہے ہو ہر شخص جو ناجائز طریقے اختیار کرتا ہے' وہ اسے اپنے لیے منفعت بخش سمجھتا ہے تو کرتا ہے' فائدے مند سمجھتا ہے' تو کرتا ہے۔ کہا ہے کہ ذہن میں تمہارے یہ ہے کہ یہ بڑی منفعت بخش چیز ہے لیکن درحقیقت اُولٰٓئِکَ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ (63:9) انجامِ کار دیکھو گے کہ یہی دنیا میں نقصان میں رہیں گے۔ مشکل یہ ہے کہ یہ جو قرآن حمید انجام بتاتا ہے اس کے لیے کافی وقت لگتا ہے اور اسے وہ مہلت کا وقفہ کہتا ہے۔ جہاں جہاں اس نے اپنے قانونِ مکافات کا ذکر کیا ہے کہ ہر غلط کام تباہ کن نتیجہ پیدا کرتا ہے' اس کے ساتھ ہی یہ کہا ہے کہ ہم فوراً پکڑ نہیں کرتے' فوراً گرفت نہیں ہوتی' اس کے لیے بیج بونے میں اور اس کے پک کر فصل بننے کے اندر ایک مہلت کا وقفہ ہوتا ہے' وقفہ کا وقت ہوتا ہے' اس سے پیشتر وہ بیج پک کر اپنا نتیجہ پیدا ہی نہیں کر سکتا اور اس کے لیے تو قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر خود نبی اکرمؐ سے بھی یہ کہا ہے کہ اس میں جلدی مت کرو' یہ لوگ جلدی مچا رہے ہیں کہ لاؤ تو وہ تمہارا خدا کہاں اور اس کا قانون کہاں ہے۔ روز لوگ یہاں بھی کہتے ہیں کہ صاحب! یہ دیکھ لیجیے کہ یہ جو ظالم' بے ایمان' بد دیانت ہیں' وہ پنپتے چلے جاتے ہیں' روز بنتے چلے جاتے ہیں' انہیں کچھ بھی نہیں ہوتا خواہ مخواہ کے لیے کہے چلے جا رہے ہیں' تباہی آتی ہے' نقصان ہوتا ہے یہی چیز ہے' وہ لوگ بھی کہتے ہیں' ہر دور میں یہ کہیں گے' خود حضورؐ سے بھی اللہ تعالیٰ کو یہ کہنا پڑا کہ ذرا استقامت سے کام لو۔ اس پہ یقین رکھو کہ ہوگا' یہ ضرور ہوگا۔ یہ تم نہیں بتا سکتے' ہمارا قانونِ مکافات یہ بتائے گا کہ یہ کب ہوگا۔ وہ قانون کہ جو سنکھیا کھانے والا ہے وہ تو شاید پانچ منٹ کے اندر ہی مر جائے' وہ جو آج کل کے سنکھیا کھانے والے چلے ہوئے ہیں وہ آپ نے ٹی وی پہ دیکھا ہوگا' ایک ہی چیز' میں سمجھتا ہوں کام کی۔ وہ جو سگریٹ کے خلاف کہتے ہیں کہ او بھولے! یہ ہے خودکشی کا صحیح طریقہ۔ وہ بڑا Efective (موثر) ہے۔ ایک خودکشی تو وہ بتاتا ہے کہ ریل کے نیچے آ گیا' گلے میں پھندا ڈال لے' سنکھیا چاٹ لے' وہ موت اسی وقت ہوتی ہے۔ یہ جو سگریٹ ہے اور پھر سگریٹ کی منافقت' یعنی بظاہر سگریٹ' بباطن اس میں افیون چرس ہیروئن' ایسا کچھ پلاتی ہے' اس کے لیے ایک وقت لگتا ہے' موت اس کا بھی انجام ہوتا ہے اور خودکشی کا بھی۔ یہ طبعی موت نہیں' لیکن وقت لگتا ہے' اس لیے ہر غلط کام کا نتیجہ برآمد ہونے میں جو وقفہ ہوتا ہے' اس کے لیے الگ الگ قانون ہوتا ہے کہ کس قسم کا وہ غلط کام ہے' کتنے وقت کے بعد نتیجہ نکلے گا' سنکھیا ہے فوراً نکل آئے گا' اس قسم کا سگریٹ ہے تو بھولے کے مرنے میں تھوڑا سا وقت لگتا ہے' معاشرے بھی اسی طرح تباہ ہوتے ہیں۔

---

[1] جو لوگ ایسا کریں گے وہ یاد رکھیں کہ اس سے انہیں سخت نقصان پہنچے گا۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1319)۔

## کوئی نظام غلط ہو یا صحیح اس کے اثرات بڑے دیرپا ہوتے ہیں

قرآن کریم میں افراد کی ہلاکت کے متعلق بہت کم کہا گیا ہے۔ اصل میں تو قومیں تباہ ہوتی ہیں' معاشرہ تباہ ہوتا ہے' نظام تباہ ہوتا ہے' سسٹم تباہ ہوتا ہے' یہ سلطنتیں تباہ ہوتی ہیں اور قرآن کریم بار بار انہی کا ذکر کرتا ہے اور اس میں تو پھر وہ یہ کہتا ہے کہ جب غلط معاشرہ یا غلط نظامِ حکومت کے نتیجے میں تباہی آتی ہے تو وہ پھر انہی تک محدود نہیں رہا کرتی کہ جو اس ظلم کے ذمہ دار ہوتے ہیں بلکہ وہ سب کو بہا کر لے جایا کرتی ہے۔ آتی کب ہے؟ یہ ہے وہ قانون۔ اس میں دو باتیں ہیں جن میں الجھن پیدا ہوتی ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ ایک طرف تو خدا کہتا ہے کہ وَ اللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (2:202) ہم فوراً ساتھ کے ساتھ حساب کرتے چلے جاتے ہیں اور دوسری طرف یہ کہتا ہے کہ اس کے لیے اس کا نتیجہ برآمد ہونے میں وقت لگے گا' تو اگر وہ ساتھ ہی ساتھ بہت جلد حساب کر دیتے ہیں تو پھر یہ فوراً کیوں نہیں ہوتا؟ وہ حساب کر دینا یہی ہے وہ جو بینک والے ہر شام کو آپ کے ہاں کا وہ جو کریڈٹ اکاؤنٹ ہوتا ہے' وہ روز کرتے چلے جاتے ہیں تو آہستہ آہستہ جب آپ کے ہاں Debit بڑھتا چلا جاتا ہے تو ایک دن آتا ہے جب آپ کے کریڈٹ سے وہ زیادہ ہو جاتا ہے' حساب روز کرتے چلے جاتے ہیں۔ خدا کا قانونِ مکافات روز آپ کا یہ حساب کر دیتا ہے اس حساب کے محسوس طور پر نتیجہ مرتب ہونے کے اندر یا ظاہر ہونے کا اندر نتیجے کے ایک وقت لگتا ہے لیکن یہ حساب آ کر ضرور رہتا ہے۔

## ہر وہ شخص جو اسلام قبول کرتا ہے اسے انفاق کے معاہدے پر دستخط کرنے ہوتے ہیں

ایمان اس کا ہی نام ہے کہ یہ یقین ہو کہ معاشرے کی یہ جو غلط روش ہے' یہ تباہی کی طرف لیے جا رہی ہے اور یہ تباہ کرے گی اس لیے کہا کہ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ[1] (63:10) آپ کو معلوم ہے' قرآن حمید نے کہا ہوا ہے کہ جب کوئی شخص اسلام لاتا ہے تو وہ ایک معاہدے پہ دستخط کرتا ہے' جس میں لکھا ہوتا ہے کہ میں اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھوں بیچتا ہوں اور خدا خریدنے والا کہتا ہے کہ میں اس کے بدلے میں تمہیں جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ اس کے معنی ہوتے ہیں ''اسلام لانا' مسلمان ہو جانا۔'' یہی نہیں ہوتا کہ رام داس آیا اور مسجد میں مولوی صاحب نے چار کلمے پڑھائے اور عبدالرحمٰن نام رکھا اور پھر الحمدللہ اور اس کے بعد پھر وہ جو کہہ گئے تھے کہ 'ہند میں چھوڑ دیا کر کے مسلماں تُو نے''۔ یہ معاہدہ ہوتا ہے تو کہا کہ اس معاہدے کے لیے جس وقت بھی مانگا جائے' جب بھی ضرورت پڑے' جب بھی وقت آ جائے' قرآن کریم کے یہ لفظ خرچ کرو' لکھا ہی نہیں ہے' یہ انفاق ہے۔

---

[1] جب تمہیں اللہ نے دیا ہے' اُسے اس کے نظام کے قیام کے لیے کھلا رکھو' قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کے سامنے موت آ کھڑی ہو۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1319)۔

## موت سے پہلے اپنی اصلاح کرنا ضروری ہے ورنہ کلمہ کچھ کام نہ آئے گا

اس لفظ انفاق کے معنی ہیں کہ ''کھلا رکھو' تجوریوں میں بند کر کے نہ رکھو' اس کے اوپر ڈھکنے نہ دو' ایسے اکاؤنٹ نہ کھولو جو تمہی ان میں سے Draw کر سکو' کوئی اور نہ کر سکے''۔ عربی زبان میں اوپن رکھنا اس کا ترجمہ ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ اسے اوپن رکھو' جب ضرورت پڑے اور یہ یہ چیز جو ہے' یہ دے دو جب ضرورت پڑے' تا آنکہ قبل اس کے کہ موت تمہارے سامنے آ کھڑی ہو۔ توبہ کے متعلق اس نے یہ بات کہی ہے کہ جب موت سامنے آ کھڑی ہو تو پھر توبہ کچھ فائدہ نہیں دیتی' یہ بات بڑی صاف ہے۔ توبہ کے معنی' ابھی ہم نے دیکھا کہ غلط راستے پہ چلنے کا احساس کہ یہ غلط ہے اور اس کے بعد صحیح راستے کے اوپر چل پڑنا اور اگر ایسے وقت میں یہ احساس ہوا ہے جب صحیح راستے پہ چلنے کا وقت ہی باقی نہیں رہا' تو پھر تو اصلاح کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی' یہ تو توبہ ہی نہیں رہی۔ قرآن کریم نے کہا کہ صرف توبہ نہیں ہے' یہ جو مرتے وقت کہتے ہیں کہ یا اللہ! مرتے وقت میری زبان پہ کلمہ ہونا چاہیے' مرنے سے بہت پہلے کلمہ زبان پہ ہونا چاہیے' زبان پہ ہی نہیں ہونا چاہیے' یہ دل کی گہرائیوں سے ابھرنا چاہیے' عزیزانِ من! اگر یہ بات نہیں ہے تو زبان کے اوپر جو آپ کا کلمہ ہے وہ تو آپ کو کچھ کام نہیں دے سکتا۔

## صدیوں سے دنیا بھر کی ہر مسجد میں بار بار ایاک نعبد وا کا اعلان کرنے کے باوجود فرقوں سے بالاتر ہو کر اُمت واحدہ کے نام کی کیا کوئی مسجد تعمیر ہے؟

کہا ہے کہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ (1:4) یہ کتنی بار آپ زبان سے کہتے ہیں' نہایت مقدس Atmosphere (فضا) کے اندر' مسجد میں کھڑے ہو کر' قبلہ رو ہو کر آپ کہتے ہیں۔ دن میں کم از کم پوری نمازیں پڑھتے ہیں تو قریباً چالیس مرتبہ یہ بات کہتے ہیں' ایسے مقدس ماحول میں' خدا کی طرف رجوع کرتے ہوئے' جسے ہم قبلہ ہو کر کہتے ہیں۔ اس میں آپ کیا کہتے ہیں؟ یہ کہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ (1:4) ہم تیرے سوا کسی کی اطاعت نہیں کرتے۔ یہ آپ چالیس مرتبہ مسجد میں کھڑے ہو کے کہہ رہے ہوتے ہیں۔ کیا آپ کا دل اور دماغ ہم آہنگ ہوتا ہے؟ دل اور زبان نہیں' کیا اس میں روزمرہ آپ کا عمل اور آپ کی زبان ہم آہنگ ہوتی ہے؟ اگر یہ بات نہیں تو مرتے وقت اگر کلمہ زبان پہ آ گیا تو وہ کون سی بات ہوگئی۔ کہا ہے کہ قبل اس کے کہ موت تمہارے سامنے کھڑی ہو۔ فَیَقُوۡلَ رَبِّ لَوۡلَاۤ اَخَّرۡتَنِیۡۤ اِلٰۤی اَجَلٍ قَرِیۡبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَ اَکُنۡ مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ (63:10) اس وقت پھر تم یہ کہو گے کہ یا اللہ! مجھے اگر کچھ مہلت دے دی جائے تو میں پھر دیکھیے کتنا نیک بن جاتا ہوں۔ وَ لَنۡ یُّؤَخِّرَ اللّٰہُ نَفۡسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُہَا (63:11) جب کسی عمل کے نتیجے کے ظاہر ہونے کا وقت آ جاتا ہے تو پھر اسے Postone (ملتوی) نہیں کیا جاتا' پھر موخر نہیں کیا جاتا' پھر اس کے لیے معیاد' مہلت نہیں دی جاتی۔ تو قبل اس کے کہ وہ موت سامنے کھڑی ہو جائے' یہ کر وا اور بڑی چیز یہی ہے۔ دیکھیے! کس انداز میں وہ بات کر گیا۔ موت

کے متعلق بتایا نہیں کہ وہ کب آئے گی، وہ تو کسی آن آسکتی ہے تو جب یہ کہا کہ قبل اس کے کہ موت آ کھڑی ہو، اس وقت یہ کرو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ فوراً کرو، کیا پتہ ہے کہ تمہارے تو اگلا سانس بھی نہ آئے، موت تو پتہ نہیں کب آئے، اور موت آنے سے پہلے یہ کچھ کرو۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جب غلط روش پہ چلنے کا احساس ہو گیا ہے تو فوراً صحیح روش کے اوپر آ جاؤ۔

## جب موت کا فرشتہ سر پہ کھڑا ہو تو حسن عمل کے لیے تو کوئی وقت باقی ہی نہیں رہتا

کہا کہ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ(63:11) خدا اسے نہیں دیکھتا کہ تم کہتے کیا ہو، خدا دیکھتا یہ ہے کہ تم کرتے کیا ہو۔ تو موت آنے سے پہلے یہ ہزار بار کہنے سے، بات یہ نہیں، ہزار بار میں نے تو صرف نمازی کے لیے ہی کہا ہے۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ(1:4) وہ کہتا ہے یہ آپ کا موذن کھڑا ہو کر مینارہ کے اوپر ساری دنیا کے سامنے۔ اشھدوا ان لا اله الا الله. شہادت دیتا ہوں، میں گواہی دیتا ہوں، میں اعلان کرتا ہوں، کہ خدا کے سوا کوئی صاحب اقتدار نہیں، دنیا کے اندر کوئی حاکم نہیں بن سکتا وہ اعلان کر رہا ہوتا ہے۔ سوچو تو سہی عزیزانِ من! وہ کہہ رہا ہوتا ہے، کیا وہ سچی بات کہہ رہا ہوتا ہے؟ بات سچی کہہ رہا ہوتا ہے لیکن وہ جھوٹا ہوتا ہے۔ یہ ہے جو آج سورۃ المنٰفقون میں ہم نے بتایا۔ ہم تو قدم قدم کے اوپر، ہم تو قرآن کریم کے معیار کے مطابق بات سچی کہتے ہیں مگر یہ بات کہنے والا بھی ہم میں سے جھوٹا ہے کیونکہ قلب اور زبان کی ہم آہنگی نہیں۔

سورۃ المنٰفقون آج ختم ہو گئی۔ آئندہ درس میں ہم سورۃ التغابن لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ(2:127)

❀......❀......❀

# سورة التغابن

# پہلا باب: **سورۃ التغابن** ( آیات 1 تا 6)

عزیزانِ من! اگست 1984ء کی 19 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ التغابن سے ہو رہا ہے۔ یہ 64 سورۃ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم { خدائے رحمٰن ورحیم نے اس کتاب عظیم کو اس لیے نازل کیا ہے کہ اُس نے اشیائے کائنات اور نوعِ انسانی کی جو ذمہ داری لے رکھی ہے، وہ پوری ہو جائے (6:12;6:54)۔ یہ نشوونما، وحی کی راہ نمائی کے بغیر ممکن نہیں (10:57-81;17:82)۔ چونکہ انسانی دنیا میں خدا کی ذمہ داریاں انسانوں کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں' اُس لیے خدا کے بندوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ جس کام کا بھی ارادہ کریں اُس سے مقصد' خدا کے اس پروگرام کی تکمیل ہو (6:163)}۔

## صفاتِ خداوندی کی ایک ایک صفت غور وفکر کی حامل ہیں

کہا ہے کہ **يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ** (64:1)۔ یہ وہی عظیم حقیقت ہے جس کا بار بار اعادہ کیا جاتا ہے کہ "اس خارجی کائنات میں ہر شے خدا کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرمِ عمل ہے"۔ کہا کہ **لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ** (64:1)۔ آپ کو یاد ہوگا میں نے کئی بار یہ عرض کیا کہ جہاں قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا کوئی ذکر آئے' وہ مقام بڑا غور طلب ہوتا ہے۔ وہ ایسا ہی نہیں ہوتا کہ اس نے کہہ دیا کہ وہ عظیم ہے اور کہیں کہہ دیا کہ خبیر ہے اور کہیں کہہ دیا کہ رزاق ہے' وہ معاذ اللہ جیسے وہ شاعری کے لیے آخر میں ہوتا ہے کہ برائے غزلِ بیت' کبھی کوئی لفظ لکھ دیا' کبھی کوئی لفظ لکھ دیا۔ یہ صفاتِ خداوندی بڑے ہی گہرے مطالب کی حامل ہوتی ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ **لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ** (64:1)۔ ملک "اقتدار" کو کہتے ہیں' قوت کو کہتے

ہیں اور حمد کے عام معنی تعریف اور ستائش کے ہوتے ہیں۔ ''قوت اور تعریف'' دو چیزیں اکٹھی کی گئی ہیں اور یہی عظیم حقیقت ہے۔ قوت کا جب بھی تصور آئے گا تو چنگیز خاں' ہلاکو خاں' نادر شاہ ذہن میں آئے گا۔ قوت کے ہاتھوں ہر شخص بلبلا اٹھتا ہے' ہر شخص تنگ پڑتا ہے اقبالؒ نے کہا ہے کہ

تاریخِ امم کا یہ پیامِ ازلی ہے
صاحب نظراں! نشہ قوت ہے خطرناک
اِس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و عِلم و ہُنر خس و خاشاک

## قوت کا غلط استعمال

انسانیت کی ساری تاریخ یہ بتاتی ہے۔ یہ ہے الملک' یہ ہے اقتدار' یہ ہے نشہ قوت۔ قوت یا اقتدار کے اس طرح استعمال سے تو کبھی بھی معاشرہ کے افراد کے ذہن سے ستائش اور تعریف کے جذبات بلند نہیں ہوتے' اس سے نفرت بڑھتی ہے۔ قوت کے ہاتھوں ہر شخص تنگ آیا ہوا ہوتا ہے لیکن قوت کا ایک استعمال یہ ہے کہ جتنے بھی معاشرہ کے اندر امن پسند ہوں ان کی زبان پہ ستائش کے نغمے بلند ہو جائیں۔ کیا بات ہے اس قوت کے استعمال کی! یہ قوت کا استعمال ہے جس کے متعلق اقبالؒ نے اسی نظم کے آخری شعر میں کہا کہ

لادِیں ہو تو ہے زہرِ ہلال سے بھی بڑھ کر
ہو دِیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق

(اقبالؒ: ضرب کلیم' قوت اور دین)

## الملک کے ساتھ الحمد کا ذکر قابل فکر و ستائش ہے

یہ ہے وہ قوت کا استعمال جو ہر زہر کا تریاق ہو جاتا ہے' یہ ہے وہ الملک کہ جس کے ساتھ والحمد آتا ہے۔ یہ ہے اقتدار کا اس طرح سے استعمال کہ ہر شخص کی زبان پر حمد و ستائش کے نغمے بلند ہوں کہ کیا بات ہے اس اقتدار کی' کیا بات ہے اس قوت کی! یہ کیسے ہوگا؟ وہ اسی طرح سے ہوگا کہ قوت کا استعمال ظالم کی کلائی مروڑنے کے لیے ہوگا' مظلوم کی حفاظت کے لیے ہوگا' شرافت اور عصمت کے تحفظ کے لیے ہو' انہیں تنگ کرنے کے لیے نہ ہو۔

## عزیز کے ساتھ حکیم ایک عظیم حقیقت کا مظہر ہے

قرآن حکیم میں آپ دیکھیں گے کہ ایک تو عام طور پہ وہ عزیز الحکیم دو صفتیں اکٹھی لاتا ہے۔ عزیز کے معنی بھی ہوتا ہے صاحبِ

قوت اور حکمت ساتھ قوت دھاندلی کی نہیں بلکہ Reason پر مبنی' جسے Rational Power کہیں گے۔ دو متضاد چیزیں ہیں: پاور اور پھر ریزن اِس کے ساتھ ہو۔ یہ ہے خدا کی دی ہوئی طاقت اور پھر سارے قرآن حکیم میں آپ دیکھیے جہاں جہاں بھی وہ طاقت/قوت کا استعمال کرتا ہے' وہ ہوتا ہے ظالمین کے خلاف' مجرمین کے خلاف' مطففین کے خلاف' سرمایہ داروں کے خلاف' مفسدین کے خلاف اور وہ اس قدر خلاف کی صورت ہے کہ اِنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِيْدٌ (85:12) اس کی بڑی سخت گرفت ہوتی ہے اور جب یہ جو امن کو Disturb کرنے والے عناصر ہیں' اُن کے خلاف بڑی سخت گرفت ہوتی ہے۔

## مومن کو کسی قسم کا نہ خوف ستاتا ہے اور نہ ہی حزن

اب آئے وہ جنہیں مومن کہا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مومن کے معنی تو ہمارے ہاں ہوتے ہیں ''ایمان لانے والا'' اصل یہ ہے کہ مومن کے معنی ہوتے ہیں ''امن قائم رکھنے والا''۔ خدا کی خود ایک صفت المومن ہے۔ یہ جو باقی امن والا طبقہ ہے' ان کے متعلق کہا کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:62) ان کو کسی قسم کا باہر سے نہ کوئی خطرہ ہوگا' نہ ہی ان کے ہاں دل کی غمگینی اور افسردگی ہوگی۔ جس معاشرے میں قوت یہ انتظام کردے کہ جتنے بھی امن پسند ہیں' ان کو کوئی خطرہ نہ ہو' کوئی حزن نہ ہو' تو ان کی زبان پہ تو تعریف کے نغمے بلند ہونگے ہی۔ یہ ہے جو کہا ہے کہ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ (64:1) جلال اور جمال' قوت اور حمد' دونوں کا سرچشمہ اُسی کی ذات ہے' یہ جلال اور جمال' قوت اور ستائش اسی کے لیے ہے۔

## نظامِ خداوندی کے خدوخال کی وضاحت

یہ ہے عزیزانِ من! جہاں قرآن حکیم صفاتِ خداوندی کا ذکر کرتا ہے' یہ ہے اس سے مفہوم۔ معنی یہ ہیں کہ تمہارا معاشرہ جسے آپ نظامِ خداوندی کہیں گے' اس کے معنی یہ ہیں کہ وہاں قوت کا استعمال اس طریق سے کیا جائے گا' جس طرح خدا قوت کا استعمال کرتا ہے' اس طرح سے استعمال کیا جائے کہ وہ معاشرے میں یہ کیفیت پیدا کردے کہ سارا معاشرہ حمد و ستائش کے نغمات سے گونج اٹھے کہ کیا بات ہے اس صلٰوۃ کی صاحب! ہر امن پسند ہر ظالم کی کلائی مروڑ دے یعنی یہی نہیں کہ وہ خطرات سے محفوظ ہوا۔ قرآن حکیم کے جو دو الفاظ ہیں ان کے لیے کہا ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:62) خوف تو یہ ہوا کہ یہ اس قسم کے جو ظالم' مفسد' بدمعاش' غنڈے تھے ان کی گرفت کردی' ان سے حفاظت کردی۔ یہ ایک چیز ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ دل میں بھی کسی قسم کی افسردگی اور کسی قسم کی غمگینی نہ آنے پائے۔

## حدِ بشریت قوت کے استعمال کی نوعیت

یہ ہے قوت کے استعمال کے معنی یا اس کا نتیجہ' جو قوت خدا کے طریق پہ استعمال کی جائے۔ یعنی قوت استعمال کرنے والوں کے

اندر خدا کی صفات علیٰ حدِ بشریت منقسم ہیں۔ وہ خود خدا کی صفات کے اس حد تک حامل ہوں جس حد تک ایک انسان ہوسکتا ہے۔ اب یہ دیکھنے کے لیے کہ اسلامی یا قرآنی معاشرہ کیا ہے' پہلی چیز یہ دیکھنی ہوگی کہ اقتدار کا استعمال کس طرح سے ہوتا ہے' دوسری چیز یہ کہ استعمال کرنے والوں کی اپنی جو ذات ہے' اپنا جو کردار ہے' جو سیرت ہے' وہ خدا کی صفات کے اندر رنگی ہوئی ہے یا نہیں۔ کہا ہے کہ **صِبۡغَةَ اللّٰهِ وَ مَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبۡغَةً** (2:138) یہ خدا کے رنگ میں رنگے ہوئے ہونے چاہئیں۔ جب ان کے ہاتھ میں اقتدار آئے گا تو پھر کیفیت یہ پیدا ہوگی کہ وہ قوت استعمال کی جائے گی خطرات پیدا کرنے والوں کے لیے اور باقی جو لوگ ہیں' انکی کیفیت یہ ہوگی کہ ان کو امن بھی نصیب ہوگا اور حزن سے بھی ان کی حفاظت ہوگی' نہ خوف ہوگا نہ حزن ہوگا۔ کہا کہ **وَلَـهُ الۡـحَمۡدُ** (64:1) اور حمد و ستائش اسی کے لیے ہوگا۔ یہ ہوگا کیسے؟ کہا کہ **وَهُـوَ عَـلٰـى كُـلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ** (64:1) اس نے ہر بات کے لیے قانون مقرر کر دیا ہے' ہر فیصلہ قانون کے مطابق ہوگا اور ان قوانین کے اوپر اس کا پورے کا پورا کنٹرول ہے۔ یہ نہیں ہے کہ وہ قانون نافذ کر دے۔ اب اس کے بعد قانون نافذ کرنے والے خود کہہ رہے ہیں کہ اس پہ عمل نہیں ہو رہا۔

## خدا کے قدیر ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے پاس قوت نافذہ بھی ہے

یہ جو خدا کا قدیر ہونا ہے' یہ عجیب چیز ہے۔ قوانین عام طور پہ اچھے ہی ہوتے ہیں بجز اس کے کہ کسی خاص منصب کی خاطر ان کو نہ مدون کیا جائے لیکن اگلی بات یہ ہوتی ہے کہ ان کے اوپر عمل نہیں ہو رہا۔ وہ قدیر نہیں ہوتا جو نافذ کرنے والا ہوتا ہے' خود کہہ رہا ہوتا ہے کہ عمل نہیں ہو رہا صاحب! یہ بھی جو خدا کی صفت ہے' وہ ان کے اندر مناسب سمجھتا ہے' جو صاحبِ اقتدار ہو معاشرے کے اندر۔ یاد رکھیے! یہ جتنی چیزیں قرآن حکیم میں خدا کے متعلق ہیں' یہ درحقیقت ان کا عملی انعکاس اس معاشرے کے اندر ہوگا جو خدا کے نام پر متشکل کیا جائے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ جو خدا نے اپنی صفتیں بیان کر دی ہیں کہ صاحب! ہم ایسے ہیں' ہم ایسے ہیں اور تم بھی اٹھتے بیٹھتے کہا کرو کہ ہمارا خدا ایسا ہے' وہ بہت بڑا ہے' اس کے باپ دادا بڑے ہیں' یہ مطلب نہیں ہے' قصیدہ خوانیاں نہیں ہیں۔

## قدرت نے اگر انسان کو پیدا کیا ہے تو قرآن حکیم نے اس کے پیدا کرنے کے مقصد کو بھی واضح کیا ہے

عزیزانِ من! قرآن حکیم کے متعلق اس نے کہہ دیا کہ اس میں تو خود تمہارا ہی ذکر ہے جو ہم نے قرآن حکیم نازل کیا ہے۔ یعنی ہم تو سمجھتے ہیں کہ اس میں خدا ہی کا ذکر ہے' اس نے اپنا ہی ذکر کیا ہے۔ اس کو اپنے ذکر کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ کائنات کا پتہ پتہ گھاس کی ایک ٹہنی اس کا ذکر کر رہی ہے۔ اس کو اپنا ذکر کرانے کے معنی کیا ہیں؟ وہ کہتا ہے اس کے اندر تمہارا ذکر ہے تو قرآن حکیم جب آپ پڑھیں سمجھیں تو اس میں یہ دیکھیے کہ اس میں ہمارے متعلق کیا کہا گیا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ خدا نے اپنے متعلق کیا کہا ہے۔

وہ جو اپنے متعلق بھی بظاہر کہا ہے وہ آپ غور سے دیکھیں گے اس میں کوئی نہ کوئی اصول ہماری زندگی کے متعلق ہوگا۔ اسی لیے کہا ہے کہ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ (64:1)

## حمد وستائش کا مقصد انسان کو یہ باور کرانا ہے کہ کائنات کی ہر شے خدا کے قانون کے اندر جکڑی ہوئی ہے

کہا کہ معاشرے کا اقتدار اس طرح سے قائم ہونا چاہیے کہ ہر ایک کی زبان پر حمد اور ستائش ہو اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (64:1) قانون بنائے جائیں اور قانون کے اوپر کنٹرول ہو کہ وہ نافذ ہو رہے ہیں۔ لیجیے آپ کا نظامِ مملکت سارا آ گیا تین لفظوں کے اندر اور نظر بظاہر ان کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اپنے متعلق کچھ کہا ہے۔ ٹھیک ہے، ہمیں کیا' ہمارا کوئی واسطہ نہیں' چلو آگے بھئی! وہ کہتا ہے کہ اب دو قسم کے اس کے بعد گروہ نظر آئیں گے۔ ایک تو وہ ہونگے جو اقتدار کو اس طرح استعمال کریں گے' دوسرے وہ ہونگے جو اس بات سے انکار کریں گے۔ اقتدار ہی ہونا چاہیے' اس لیے انسانوں کو دو Catogeries میں' دو اقسام میں تقسیم کر دیا۔ کہا ہے کہ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (64:2)۔ تمام انسانوں کو اس نے پیدا کیا' اشیائے کائنات کو پیدا کیا' تو مجبور پیدا کیا۔ یہ نہیں ہے کہ ان میں سے کسی کا جی چاہے تو ایسا ہو جائے اور کسی کا جی چاہے تو وہ ایسا ہو جائے' کبھی جی چاہے سورج کا کہ وہ صبح طلوع ہو جائے' کبھی جی چاہے وہ کہے کہ نہیں آج رات کو دیر سے سوئے تھے' محفل میں گئے ہوئے تھے' اس لیے ذرا آرام کرنے دیجیے۔ یہ سوال نہیں ہے۔

## اس کائنات انسان ہی وہ واحد مخلوق ہے کہ جسے قدرت نے اختیار وارادہ کی نعمت سے نوازا ہے

انسانوں کے متعلق یہ ہے کہ انہیں صاحبِ اختیار وارادہ بنایا ہوا ہے کہ جی چاہے تو وہ اقتدار کو ظلم کے لیے استعمال کریں' جی چاہے تو امن کے لیے استعمال کریں۔ جو خدا کے بتائے ہوئے پروگرام کے مطابق اقتدار کو استعمال کرتے ہیں' انہیں مومن کہا گیا ہے' یعنی امن قائم رکھنے والے اور جو اس طرح استعمال نہ کریں' ان کو کافر کہا گیا' نہ ماننے والے' اس طرح نہ کرنے والے۔ یاد رکھیے کافر کا لفظ گالی نہیں ہے۔ کوئی یہاں تو پھر خیر ہم اب ہندوؤں میں بستے نہیں' مخلوط آبادی نہیں' وہاں انڈیا میں یہ صورت تھی ہم تو وہاں سے آئے ہوئے ہیں۔ وہ ہندوؤں کو اس سے بہت ناگوار گزرتا تھا۔ کافر کا جو لفظ تھا' وہ سمجھتے تھے یہ گالی دے رہے ہیں۔ یہ گالی نہیں ہے۔ یہ ایک معاشرہ ہے' ایک مجلس ہے' ایک کمیٹی ہے' جو بنائی گئی ہے اس کے ممبر بنتے ہیں' ان کو مسلم یا مومن کہتے ہیں۔ Non-members کو کافر کہا جاتا۔ یہ Membership قبول نہ کرنے والے ہیں۔ بس اتنی بات ہے۔ تو اقتدار کے استعمال کی دو چیزیں آ گئیں: جو خداوندی طریق کے مطابق ان کو استعمال کرتا ہے کہ اس کا ملک حمد کا پیدا کرنے والا ہو جائے' وہ مومن ہو جائیں گے۔ جو اس طرح سے نہیں استعمال کرتے وہ اس کے Non-members ہونگے' وہ یہ نہ ماننے والے کافر کہلائیں گے' قرآن

کریم نے کفر اور اسلام کا معیار ہی یہ قرار دیا ہے۔

## اسلامی اور غیر اسلامی کی نہ ختم ہونے والی طویل بحثیں

ہمارے ہاں آپ دیکھیے گا کہ جھگڑا ہی اس بات پر ہوتا ہے کہ اگر کوئی بات' کوئی شے' کوئی نظریہ' کوئی قانون' کوئی بھی کسی طرح سے Issue ہو جائے یا اس کے متعلق بحث ہو جائے تو یہ ہوتا ہے کہ کیا یہ اسلامی ہے یا غیر اسلامی۔ اب بحث چل رہی ہے' ڈور کو سلجھا رہے ہیں اور سرا ملتا نہیں۔ یہ سارے غیر مسلم نہیں' یہ مسلمانوں میں سے ہی ایک گروہ ہے' وہ کہے گا کہ یہ بالکل اسلام کے مطابق ہے' دوسرا کہے گا کہ بالکل نہیں' یہ اسلامی نہیں ہے۔ چلو پھر' پہلے یہ بحث و نظر ہے پھر نظریاتی کونسل ہے پھر مشاورتی کونسل ہے پھر اس کے بعد وفاقی شریعت ہے پھر اس کے بعد اس کے اوپر سپریم کورٹ ہے۔ یہ کیا طے کرنے کے لیے ہے؟ کہ یہ اسلامی ہے یا نہیں۔ کیا بات ہے اس اسلام اور نہ اسلام کی! کہ اس کے متعلق طے کرنے کے لیے آپ کو یہ سارا کچھ کرنا پڑے اور آخر میں بھی فیصلہ دیا جائے تو وہ کہے کہ صاحب! کافرنا توانی شدنا چار مسلمان شو۔ کیا کیا جائے؟ اس عدالت سے آگے تو کوئی اور عدالت ہے نہیں' ماننا ہی پڑے گا یعنی یہ اس قسم کا قرآن حکیم کا یہ کوڈ کیا ہے؟

## کیا قرآن حکیم حق و باطل کا فیصلہ کرنے کے لیے کافی نہیں؟

یہ کیوں ہے؟ اس لیے ہے کہ کفر اور اسلام کا جو معیار اس نے تجویز کیا تھا اس کے مطابق کوئی بھی Judge نہیں کرتا اور وہ معیار یہ تھا کہ وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ (5:44) کا فروہ ہیں جو خدا کی کتاب کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے۔ بات ختم ہوگئی۔ کفر یہ ہے۔ اس کے مطابق نہ ہو تو کفر ہے' اس کے مطابق ہو تو اسلام ہے۔ کتنا آسان ہے اور پھر بظاہر کتنا متفق علیہ ہے یعنی یہ جتنے بھی زبانی نیچے سے اوپر تک گنائے ہیں تو بہر حال ان میں سے ہر شخص یہ کہتا ہے کہ ہمارا تو کتاب اللہ' یہ قرآن حکیم پر ایمان ہے۔ ہر ایک متفق علیہ کتاب کہتا ہے' اس کے ایک لفظ کے اندر بھی کسی کو اختلاف نہیں ہے' اس کو چھوڑ دیا' اس کو کہیں بھی استعمال نہیں کرتے اور معاذ اللہ اگر صورت یہ ہے کہ قرآن حمید کے مطابق وہ فیصلہ تو کرنا چاہتے ہیں مگر قرآن حمید ہی واضح فیصلہ نہیں دیتا' کسی کو کچھ فیصلہ دیتا ہے اور کسی کو کچھ۔

## یہ تیرا ایمان کدھر جائے

تو معاذ اللہ پھر یہ کتاب اس قابل ہی نہیں ہے کہ اس پہ ایمان لایا جائے۔ یہ آخری کتاب ہے اس کے بعد کوئی نبی آنا نہیں۔ کتاب کی یہ کیفیت کہ کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں بھی آپ کو یہ واضح دوٹوک فیصلہ نہیں دے سکتی کہ یہ کیا اسلامی ہے' کیا غیر اسلامی ہے تو کہیے ''اب تُو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے''۔ نہیں' عزیزانِ من! اس کی کتاب ایسی نہیں اس کتاب کا پہلا فقرہ یہ

ہے کہ لَا رَیْبَ فِیْهِ (2:2) یقینی یہ کتاب' واضح کتاب ہے' ایٰت کے ساتھ ہے' بیّنٰت ہر جگہ کہا ہے کتاب کے ساتھ مبین کہا' نہایت واضح لیکن تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں۔ مصیبت یہ ہوتی ہے کہ وہ جس چیز کو اسلامی کہنا' منوانا ماننا چاہتے ہیں' یہ اس کو اسلامی قرار نہیں دیتا۔ بچنے کا طریقہ کیا ہے؟ اس کو لاؤ ہی نہ درمیان میں۔ لیے چلے آؤ ہر غیر اسلامی چیز کو' اور اسے معیار بنا دو اور اس کے اوپر جب پھر پرکھو' کسی کے نزدیک وہ معیار ہوگی' کسی کے نزدیک معیار نہیں ہوگی۔

## دراصل قرآن حکیم کو معیار بنایا ہی نہیں جاتا

یہ سارے جتنے الجھاؤ پیدا ہو رہے ہیں' یہ سب اس لیے ہو رہے ہیں' عزیزانِ من! کہ اسے معیار نہیں بنایا جاتا۔ قرآن حکیم نے کہا تھا کہ اس کے ساتھ کسی اور چیز کو نہ ملانا کیونکہ لَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِهٖۤ اَحَدًا (18:26) وہ اپنے اس فیصلے والی جو چیز ہے' اس میں کسی اور چیز کو شریک نہیں کرتا' کسی اور چیز کو آپ نے شریک کیا قرآن حکیم کے ساتھ تو وہ شرک ہو گیا' پھر یہ فیصلے نہیں دے سکتا۔ وہ متضاد چیزیں اکٹھی کیجیے تو ایک فیصلہ نہیں دے سکتیں۔ یہ تھی وہ چیز' جو وہ کہہ رہا تھا تو یہی ہے معیار قرآن کریم کا جس کے مطابق انسانوں میں سے کچھ لوگ وہ کہتا ہے کہ کافر ہوں' کچھ لوگ مومن ہوں' جو اس کے مطابق قوت اقتدار کا استعمال کرتے ہیں یہ جو صلاحیتیں بھی خدا نے دی ہیں' ان کے مطابق استعمال کیا جائے گا مومن کہلانے کا نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:62) نہ ہوگا خوف اور حزن نہیں ہوگا اس معاشرے کے اندر' اس کی خلاف ورزی کی جائے گی تو پھر معاشرے کے اندر ہر قسم کا فساد ہوگا۔ یہ دو ہی گروہ ہیں جو قرآن حمید نے کہے۔

## قائداعظم جیسی شخصیت پر بہتان

ضمناً یہ جو ہمارے ہاں دو قومی نظریہ (Two Nation Theory) کی بحث چلی آ رہی ہے وہ ایسے سمجھا جا رہا ہے جیسے کوئی ایک سیاسی چیز تھی اور پھر اب تو منہ پھٹ کہنے لگ جاتے ہیں کہ صاحب! قائداعظم نے ہندو کے خلاف وہ ایک وکیلانہ حربہ استعمال کیا تھا کہ اپنا مقدمہ جیت لے۔ تو مقدمہ جیت لیا' معاملہ ختم ہو گیا۔ اب وہ دلیل کاہے کے لیے دی جاتی ہے اور یہاں پھر وہ دو کی بجائے چار چار قومیں' چھ چھ قومیں آ ئیں۔ پہلی تو چیز یہ ہے کہ یہ اصول ہی غلط ہے۔ یہ نہ تو قائداعظم کی سیاست تھی' نہ وکیلانہ حربہ تھا' یہ تو قرآن حکیم کا فیصلہ ہے۔ وہ انسانوں کے دو ہی گروہ کہتا ہے۔ کہا ہے کہ هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (64:2) اس نے تمہیں انسانی پیکر عطا کیا جس کی خصوصیت کبریٰ یہ ہے کہ تمہیں اختیار و ارادہ کی استعداد حاصل ہے۔ انسان کی اس استعداد کا نتیجہ یہ ہے کہ تم میں سے بعض کافر یعنی قوانینِ خداوندی کو تسلیم نہ کرنے والے اور بعض مومن یعنی ان قوانین کو ماننے والے ہو جاتے ہیں۔

## نیشنلسٹ علماء کی طرف سے وطن کے اشتراک بنا پر قومیت کی تشکیل کا معاملہ

عزیزانِ من! اب پھر کبھی کبھی درمیان میں ''میں'' آجاتی ہے۔ اس تحریف کے درمیان نیشنلسٹ علما کے ساتھ جھگڑا ہی اس بات پر تھا۔ وہ کہتے تھے ہندو اور مسلمان دونوں مل کر وطن کے اشتراک کی بنا پر ایک قوم بنتے ہیں۔ یہ متحدہ قومیت ہے۔ ہم یہ کہہ رہے تھے کہ یہ مسلمان ان سے الگ ایک فی ذاتہ جداگانہ قوم ہیں' یہ دونوں مل کر ایک قوم نہیں بن سکتے۔ یہ تھی وہ چیز۔ تو اب اس دور کا آپ کو سب کچھ بتایا جائے گا۔ آپ دیکھیں گے کہ طلوعِ اسلام کا ذکر کہیں نہیں کیا جائے گا۔ یہ اکیلا پرچہ تھا اور میں درمیان میں آ ہی جاتا ہوں' جب یہ دعوت دیتا ہوں۔ اکیلا پرچہ تھا جو ان تمام نیشنلسٹ مسلمانوں کے اعتراضات کا دین کی اسٹیج سے کھڑا ہو کر جواب دیتا تھا اور اس میں یہ ساری بحث جو تھی' وہ دو ہی نکات تھے جن پہ بحث ہوتی تھی۔ ایک تو یہ کہ معیارِ قومیت کیا ہے' دوسری چیز یہ لوگ کہتے تھے کہ اسلام ایک مذہب ہے' اور مذہب پر پابندی نہیں یا مذہب پر کار بند کسی مملکت میں کسی حکومت میں بھی ہوا جا سکتا ہے اس کے لیے ضروری نہیں کہ اپنی مملکت ہو اور ہم یہ کہتے تھے کہ مذہب میں تو یہ ہو سکتا ہے اور اسلام تو مذہب ہے ہی نہیں' یہ دین ہے اور دین کے لیے اپنی مملکت کی ضرورت ہے' کسی دوسری حکومت میں دین پر آپ عمل پیرا ہو ہی نہیں سکتے۔

## تحریک پاکستان کی صحیح تاریخ طلوعِ اسلام کے فائلوں سے ہی مل سکے گی

وہاں یہ دو نکات تھے اور جب بھی کبھی کسی کو ضرورت پڑ جائے' کوئی صاحبِ ہوش آئے' اس دور کی تاریخ مرتب کرنا چاہے' میری زندگی کا تو پتہ نہیں' عزیزانِ من! آخری لمحات ہیں' میں آنے والے مؤرخ کے لیے بھی یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اگر اس دور کی آپ نے صحیح تاریخ مرتب کرنی ہو تو وہ مواد طلوعِ اسلام کے فائل سے آپ کو ملے گا' ان سب کے اعتراضات ملیں گے' ان کے جوابات قرآن حمید کی رو سے رو ملیں گے اور اسی بناء پر وہاں ہم نے مقدمہ جیتا تھا۔ یہ وکیلانہ حربے کی بناء پر نہیں تھا۔ یہ سب مخالفین خاموش ہو گئے تھے' ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

## قائداعظم نے ہمیشہ قرآن حکیم کو پیش کیا تھا

اور آپ حیران ہونگے کہ قائداعظم نے بھی' جو اپنے دعوے کی تائید میں دلائل دیئے تھے' اس میں وہ بھی قرآن حکیم ہی کو پیش کرتا ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ[1] (64:2)۔ مجھے یاد آ گیا کہ خاص طور

---

[1] اس نے تمہیں انسانی پیکر عطا کیا (جس کی خصوصیت کبریٰ یہ ہے کہ تمہیں اختیار و ارادہ کی استعداد حاصل ہے۔ انسان کی اس استعداد کا نتیجہ یہ ہے کہ) تم میں سے بعض کافر (قوانینِ خداوندی کو تسلیم نہ کرنے والے) اور بعض مومن (ان قوانین کو ماننے والے) ہو جاتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1320)۔

پہ یہ دلیل تھی جو ہم طلوعِ اسلام میں دیا کرتے تھے' اس کا کوئی جواب ان کے پاس نہیں ہوتا تھا۔ آگے بات چلتی ہے کہ جب اس نے مومن کہہ دیا' ایک کیٹیگری تو اس کے اندر پھر مومنین کی ہوئی اور مومنین کے اندر اور پارٹیاں بن ہی نہیں سکتیں۔ یہ تو امتِ واحدہ تھی۔ خدا نے اس کو امتِ واحدہ بنایا تھا تو فَمِنۡكُمۡ كَافِرٌ وَّمِنۡكُمۡ مُّؤۡمِنٌ وَّاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ (64:2) تم میں سے بعض کافر اور بعض مومن بن گئے اور اس کے بعد یہ ہے کہ تم کرتے کیا ہو۔ ہم دیکھتے ہیں جو تم کرتے ہو۔ سوچیے کہ کس سے کہا جا رہا ہے۔ اے دل! یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے۔ اب انسان کی طرف آ گئے۔

## تنہا عقلِ انسانی کے مقام کو جاننا مقصود ہو تو پرویز صاحبؒ کی طرف سے پیش کردہ کتاب ''انسان نے کیا سوچا؟'' کا مطالعہ ہی کافی ہے

کہا کہ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ (64:3)۔ بڑی اہم چیزیں ہیں صاحب! اس کائنات کو ہم نے حقیقت کے طور پر پیدا کیا ہے۔ اب یہ جو بالحق ہے وہ ہے حقیقت کے طور پر۔ حقیقت میں قرآن مجید سمجھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے انسانوں کی فکر نے جو کچھ آج تک کہا ہے' وہ اگر بیک گراؤنڈ میں پس منظر میں پہلے سامنے ہو تو پھر قرآن مجید کے جو حقائق ہیں' وہ بڑی آسانی سے سمجھ میں آ جاتے ہیں۔ پھر اگر میں' اس ''میں'' کو معاف کر دیں تو عرض کروں کہ میں نے قرآن مجید کی تفہیم کے لیے سب سے پہلے ''انسان نے کیا سوچا؟'' کتاب لکھی۔ اس میں حکمائے یونان سے لے کر' اڑھائی ہزار سال پیشتر سے لے کر آج تک' زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق یہ جتنے سربرآوردہ فلاسفر' سائنسدان' حکماء' مؤرخین' سیاستدان ہیں۔ زندگی کے اہم حقائق کے متعلق ان کی انسانی فکر کی کاوشیں ہیں' ان کے ہاں کی جو اوریجنل کتابیں تھیں' ان کے اقتباسات دے کر اس کے اندر یہ بتایا گیا کہ تنہا عقلِ انسانی زندگی کے معاملات کا حل پیش نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے وحی کی ضرورت ہے۔ تنہا انسان کی فکر نے جو کچھ کہا ہے' وہ سب کچھ آیا ہے۔ اگر وہ سامنے ہو تو پھر پتہ چلتا ہے کہ قرآن حمید کیا کہہ گیا ہے۔ یہی جو بات ہے' اس نے کہا ہے کہ یہ Universe' اسے میں کائنات کہوں گا' معاف رکھیے گا اسے میں Universe کہوں کہ یہ ایک Reality (حقیقت) ہے اسے ''It Really exist'' کہا کہ یہ تو ہمارے سامنے ہے۔ یہ کائنات موجود ہے۔ اس کے متعلق کہا کہ صاحب! یہ موجود ہے جسے میں نے Exist کہا ہے اس چیز کو Reality کہتے ہیں۔ ایک تو Illusion ہوتا ہے کہ وہ کچھ ایسے نظر آتا ہے لیکن درحقیقت ویسے نہیں ہوتا' جیسے سراب (Mirage)' وہ ریگستان دور سے پانی نظر آتا ہے' وہ پانی ہوتا نہیں ہے' قریب جاؤ تو ریت ہوتی ہے' وہی Illusion ہوتا ہے۔ بات میں سے بات نکل آئی۔ ایرک فرام اس دور کا بڑا نفسیات کا ماہر ہے۔ Illusion کے لیے اس نے مثال دی ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی مثالوں سے بات ثابت کرتا تھا کہ حقیقت میں وہ بات نہ ہو' صرف محسوس ایسا ہو۔ اس نے کہا تھا Illusion منافق کی ہنسی

ہے۔کیا بات ہے! ان لوگوں کے کیا کہنے ہیں! کہاں چلے جاتے ہیں تو یہ چیز فکرِ انسانی کی رو سے آپ دیکھیں گے تو دو مفکرین کا بہت بڑا' ایشو ہے بلکہ یہ ہندوؤں کے تو مذہب کی بنیاد اس پہ ہے کہ یہ کائنات فی الحقیقت Exist نہیں کرتی' ان سے متاثر ہونے والے ہمارے ہاں کے بھی مفکرین کہیۓ انہیں شعرا کہیے موجود ہیں۔انہوں نے کہا ہے کہ

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

## کائنات کے فریب ہونے کا تصور ہندو مذہب کا پیدا کردہ ہے

یہ کائنات فریب ہے' مایا ہے۔یہ ہندو مذہب ہے یا اسے ہندو فلسفہ کہیے کہ یہ فریب ہے' مایا کا جال ہے' یہ آپ کو Illusion ہے جو نظر آرہا ہے' یہ حقیقت میں موجود نہیں ہے۔یہ بہت پرانی چیز ہے۔حکمائے یونان میں سے بھی ایسے تھے جنہوں نے یہ بات کہی اور یہ آگے چلی۔آدھی دنیا یہ کہتی چلی آرہی ہے۔قرآن حکیم نے آکر تیرہ سو سال پیشتر کی دنیا کے اس خطے میں' جہاں علم نے قدم بھی نہیں رکھا ہوا تھا' اس قسم کے تاریک دور کے تاریک تر خطے میں' ایک ان پڑھ اٹھ کر یہ کہتا ہے کہ **خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ** (64:3)۔اللہ اکبر! کیا فکرِ انسانی اس دور میں یہ بات کہہ سکتی تھی؟

## وحی نبی اکرمؐ کے ذہن کی پیدا کردہ نہیں

فکرِ انسانی سے ماوراء سرچشمہ علم ہے' جسے وحی کہا جاتا ہے۔یہ وہی کہہ سکتا ہے کہ **خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ** (64:3) اس نے کائنات کے اس عظیم کارگہہ کو حقیقت کے طور پر پیدا کیا ہے۔یہ حلقۂ دام خیال یا سراب یا مایا' یا خواب نہیں ہے۔ اوراس چیز کو سمجھ سکتا ہے جسے یہ معلوم ہو کہ انسانی فکر کائنات کے متعلق کیا کہتی ہے اور جب اس دور کے اندر جو فکرِ انسانی کی وہ کاوشیں منعکس ہو کر سامنے آجائیں تو پھر پتہ چلتا ہے کہ واقعی یہ حضور نبی اکرم ﷺ کے اپنے ذہن کی پیداوار نہیں تھا۔یہ وحی کے منجانب اللہ ہونے کے دلائل ہیں اور یہ ثبوت ہیں' عزیزانِ من! یہ **بالحق** ہیں' حقیقت میں ہیں' خیال یا مایا یا خواب یا حلقۂ دام خیال نہیں۔اس لیے حق انسان ہوا۔

## لفظ صور کا لغوی مفہوم

کہا ہے کہ **وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ** (64:3) یہ صور جسے تصویر کہتے ہیں درحقیقت اس کے معنی Form کے ہوتے ہیں۔ارسطو نے سب سے پہلے فلسفے میں یہ بات کہی تھی کہ کوئی شے جب فارم اختیار کرتی ہے تو اسے شے کہا جاتا ہے وہ ایک پیکر جیسا ہوتا ہے۔اس سے پہلے وہ تصور میں ہوتی ہے' وہ ذہن میں ہوتی ہے' خیال میں ہوتی ہے۔شے اسے اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ

ایک فارم اختیار کرتی ہے۔ یہ فلسفے میں بڑی اہم چیز ہے' یہ جو فارم ہے اسے قرآن حمید نے صور کہا ہے۔

## انسانی تخلیق کے ابتدائی مراحل کا ذکر

یہ جو انسان کا پیکر جب فارم میں آیا ہے اس کی تخلیق کا سلسلہ اس سے بہت پہلے شروع ہو گیا تھا۔ کیا بات ہے قرآن حمید کی! وہ Evolution کے اندر لاتا ہے کہ اولیں جرثومہ جو زندگی کا ہے' وہاں سے انسان کی تخلیق' پیدائش کا ذکر شروع کرتا ہے اور ان کو ارتقاء کے مختلف منازل جو ہیں ان میں سے گزارتا پھر یہاں تک لاتا ہے جہاں وہ جو لائف ہے' جو زندگی ہے' وہ انسانی پیکر اختیار کر لیتی ہے۔ یوں کہیے گا کہ اس فارم کے اندر لائف آ گئی ہے' تو یہ قرآن حمید نے کہا ہے "صورکم" (64:3) یہ وہ اسٹیج ہے لائف کی' انسان کی' جو پہلا جو جتنی وہ منازل تھے' اس کے اندر' انسانی شکل کے اندر' یہ نہیں آیا ہوا تھا۔ ویسے یہ زندگی اس کی چلی آ رہی تھی' اسی طرح سے Mould ہوتی ہوئی' پہلو بدلتی ہوئی۔ قرآن حمید یہ چیز کہتا ہے کہ مختلف (Aspects) گوشوں میں سے' پہلو بدلتے بدلتے یہاں تک پہنچی اور یہ وہاں آ گیا' جہاں اس کو انسانی پیکر عطا کر دیا۔ یہ ہے صُوَرَكُمْ (64:3) اور وہاں ایک خصوصیت اس کی بتائی گئی۔ یہ ہے فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ (64:3)۔

## حسن کا صحیح مفہوم

احسن تو یہ کہیں گے کہ وہ بڑا ہی خوبصورت بنا دیا ہے۔ صرف خوبصورتی کی تو بات نہیں ہے ہم میں خوبصورت بھی ہوتے ہیں' بدصورت بھی ہوتے ہیں۔ عربی زبان میں بھی اور قرآن حمید میں بھی لفظ حسن صحیح توازن کے لیے استعمال کیا گیا ہے اور حسن کہتے ہی صحیح توازن کو ہیں' صحیح Proportion کو ہیں جیسا کہ میں کہا کرتا ہوں حسین ترین چہرہ بھی ہو' اس کی آنکھ جو سیاہی ہے وہ ذرا سی ہٹی ہوئی ہو اپنے مقام سے' اُسے وہ بھینگا پن کہتے ہیں۔ سارا حسن تو نام ہی Proportion اور Balance کا ہے۔ یہ جو ہے کہ اَحْسَنَ صُوَرَكُمْ (64:3) پیکر تو عطا کیے تھے اور بھی' انسان سے ذرا پیچھے ہٹ کے جیسا کہ یہ سائنسدانوں کا یہ ہے کہ چمپانیز اور گوریلے اور یہ بن مانس وغیرہ۔ یہ انسانی زندگی کی پچھلی کڑیاں ہیں ان میں آپ دیکھیے کہ کیا کمی ہے۔

## انسان کے پاؤں کو خم دینے کی وجہ جواز یہ ہے کہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے

آپ نے دیکھا ہو گا کہ یہ گوریلا وغیرہ اٹھ کر کھڑا نہیں ہو سکتا' بیلنس قائم نہیں رکھ سکتا۔ وہ دو قدم چلتا ہے تو گر جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو ہاتھوں کے بل چلنا پڑتا ہے اور یہاں یہ بڑی چیز ہے۔ اس کے Hands Free نہیں ہوتے' ہاتھ آزاد نہیں ہوتے۔ یہ کیوں نہیں چل سکتا؟ اس کے پاؤں کے اندر Curve نہیں۔ اس کے پاؤں Flat ہوتے ہیں۔ وہ ذرا سا جو Curve دیا ہے انسان کے پاؤں میں' اس نے اس کا بیلنس پورا کر دیا ہے۔ یہ جو Human Anatomy والے ہیں' وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ کس

کس جگہ اس میں اس کا توازن برقرار رکھا ہے جس سے یہ اس طرح سے ایک انسان چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ میں نے تو ایک مثال دی ہے یعنی اتنا سا جو اس میں بیلنس قائم رکھنے کے لیے پاؤں میں تھوڑی سی خمیدگی دے دی یا خم دیدیا' اسے عام طور پر Bridge کہتے ہیں۔ اس سے یہ گوریلوں کے مقابلے میں اپنے پاؤں پہ کھڑے ہونے کے قابل ہوگیا۔ جب یہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوگیا اس کے دونوں ہاتھ آزاد ہوگئے اور آپ یہ دیکھیے! کتنی خصوصیت اس کو حیوانات کے اوپر حاصل ہوگئی ایک پاؤں میں Curve دینے سے اور اس قسم کی اگر Study کی جائے انسان کے جسم کی' تو وہ آپ دیکھیں گے کہ اس میں ہر جگہ Balance ہی Balance نظر آئے گا اور صحت نام ہی خلیات کے Balance کا ہے۔ جو انسان کے اندر اخلاص ہیں ان میں جب توازن قائم ہوتا ہے تو صحت کہلاتی ہے۔ ان میں سے کوئی ایک بڑھ جائے یا کم ہوجائے' اسے بیماری کہا جاتا ہے' مرض کہا جاتا ہے۔ علاج ہوتا ہی یہ ہے کہ اس میں پھر توازن پیدا کر دیا جائے یہ احسن' صورکم ہے' یہ حسنِ صور ہے۔ ابھی یہ جو اس کا فزیکل پیکر ہے اس میں یہ جو Biological Balance رکھا گیا ہے' حیاتیاتی طبیعاتی توازن ہے ابھی انسانیت کا ذکر نہیں آرہا' ابھی صرف اس کی جو طبعی زندگی ہے جو فزیکل لائف ہے اس کے اندر بیلنس کا ذکر آرہا ہے۔ کہا ہے کہ اس کے اندر احسن' بہترین توازن قائم کردیا۔ یہ صورکم ہے۔ اب آئی بات اس کے انسانیت کی۔

## اللہ تعالیٰ کی صفات پر ہر آن غور وفکر کی ضرورت ہے

قرآنِ کریم نے اللہ تعالیٰ کی مختلف صفات بیان کی ہیں۔ میں نے ابھی تو آپ سے عرض کیا ہے کہ قرآن حکیم کے یہ مقامات بڑے ہی غور اور تدبر کے متقاضی ہیں۔ یہ صفاتِ خداوندی ہیں۔ ان صفات کو جامع طور پہ جو بیان کیا ہے تو کہا ہے **اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی** (17:110) وہ صفات ہیں جن کے اندر صحیح صحیح نہیں' بلکہ بہترین توازن ہے' ان کے اندر مکمل توازن ہے ابھی ابھی تو ہم نے دیکھا کہ ملک' اقتدار' قوت' اتھارٹی' یہ بھی ایک صفتِ خداوندی ہے۔ اب اگر وہ صرف اقتدار ہی اقتدار ہو' ڈنڈے کے زور پہ ہو' وہ خدائی صفت نہیں۔ اس کے ساتھ حمد کہا۔ یہیں جو حمد اسی آیت پہ ہم آجاتے ہیں۔ یہ جو دو چیزیں ہیں' ان کو اکٹھا کریں گے تو توازن قائم ہوجائے گا۔

## خدا تعالیٰ کی صفت 'عزیز الحکیم' کا مفہوم

یہاں اس نے اپنے آپ کو عزیز الحکیم کہا۔ عزیز تو وہ ہے جس کے پاس اتھارٹی ہوئی' اقتدار ہو' اقتدار۔ اگر وہ جبر کا اقتدار ہے' ڈکٹیٹر شپ کا اقتدار ہے' ملوکیت کا اقتدار ہے' وہ Rationally نہیں ہوتا' Reason پہ مبنی نہیں ہوتا' وہ کیوں کا جواب نہیں دیتا' نہ دے سکتا ہے۔ بس وہ ہے حکمِ حاکم مرگِ مفاجات۔ پوچھا بھی نہیں جا سکتا لیکن خدا نے جہاں بھی اپنے آپ کو عزیز کہا ہے' اس کے

ساتھ حکیم کہا ہے۔ حکمت کے معنی Reason ہوتے ہیں' دلائل ہوتے ہیں تو اب جو اسماء الحسنہ ہیں' یہ گو بظاہر متضاد ہوئیں' قوت اور دلیل متضاد نظر آتی ہیں۔ ایک طرف کہا کہ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِیْدٌ (85:12) ہے۔ ایک طرف وہ غفور و رحیم ہے۔ یہ صفات متضاد نظر آتی ہیں' یہ متضاد ہیں اگر ان کو الگ الگ رکھا جائے۔ اسے قرآن حکیم نے یُلْحِدُوْنَ فِیٓ اَسْمَآئِہٖ (7:180) فی اَسْمَاء کہا ہے کہ ''خدا کے قانونِ مکافات کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے۔'' ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اُن میں سے کسی ایک صفت کو لے کر افراط کی طرف نکل جاتے ہیں ❶ اور یوں زندگی کا توازن کھو دیتے ہیں۔ اس الحاد کی ہمارے ہاں تو پھر بات سے بات نکل آتی ہے۔

## لفظ الحاد کا قرآنی مفہوم

ہمارے ہاں الحاد کے معنی بے دینی اور کفر ہوتا ہے یعنی مفہوم کچھ نہیں ہوتا خود ذہنی عقیدہ ہوتا ہے۔ الحاد کے معنی ہوتا ہے ''خدا کی کسی ایک اکیلی صفت کو لے کر Extreme (انتہا) تک لے جانا یہودیوں کی شریعت میں انہوں نے خدا کی جو Base دے گی۔ انسان کی کیفیت یہ ہے کہ اس کے اندر یہ چیز ہم نے دی تھی۔ میں نے عرض کیا کہ یہ اب انسانیت کا ذکر آ رہا ہے' طبعی زندگی کی بات نہیں ہو رہی۔ انسانیت کے اندر جو اس کی مختلف صلاحیتیں ہیں۔ ان کے استعمال کے مطابق بات ہو رہی ہے۔ انہیں اگر خدا کی اقدار یا Values یا اصولوں کیمطابق استعمال کرے گا تو وہ حسن قائم رہے گا' اگر یہ نہیں کرے گا تو یہ گرے گا اور گرتے ہوئے جو اپنے Momentum سے نیچے جائے گا جب نیچے گرتا ہوا چلا جائے گا تو پست سے پست تریں' اسفل السافلین' اور واقعی انسانوں کے بعض جرائم جو سامنے آتے ہیں' جرائم ہی نہیں' بعض ان کی کرتوتیں جو سامنے آتی ہیں' انسان ورطہ حیرت میں گم ہو جاتا ہے۔ یہ تو کمبخت حیوانوں سے بھی بدتر گرا ہوا ہے یہ ہے اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ (95:5)۔

## اس بدکیفیت سے کون بچتا ہے

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس سے بچتا کون ہے؟ کہا ہے کہ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (26:227) یہ وہ ہیں جو اقدار وصفاتِ خداوندی کی صداقت پر یقینِ محکم رکھے اور پھر عمل سے صلاحیت بخش کام کرے کہ جس سے ان کی اپنی ذات کی بھی نشوونما ہوا اور دنیا کے بگڑے ہوئے کام بھی سنوارے۔ یہاں صٰلِحٰت کہا ہے۔ یہ خود صلح ہے جو فساد کی ضد ہوتی ہے۔ فساد Disorder کو کہتے ہیں۔ یہ ہے ہمواریاں پیدا کرنا' انتشار پیدا کرنا' کسی شے کو اس کی حالت پہ نہ رہنے دینا۔ یہ اس کی ضد ہوتا ہے جسے صلح یا

---

❶ جیسے عیسائیوں نے خدا کی صفت ''رحم'' میں اس قدر غلو کیا کہ اس کے قانونِ مکافاتِ عمل کو یکسر نظرانداز کر دیا اور نجات وسعادت کو اعمال پر نہیں' بلکہ اس کے رحم پر موقوف کر دیا۔ اس کا جو نتیجہ برآمد ہوا' اس پر عیسائیت کی تاریخ شاہد ہے۔ قرآن کریم صفاتِ خداوندی میں اعتدال اور صحیح تناسب کی تعلیم دیتا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 386' فٹ نوٹ 1)۔

صالحین کہا ہے۔ قرآن حکیم نے جہاں کہا ہے اعمال کے لیے کہا ہے' وہ صالحین کہا ہے۔ وہ اعمال جو اس Proportion کو قائم رکھنے والے ہیں ہمواریاں پیدا کرنے والے ہوں' یہ پیدا کر دی جائیں گی۔ وہ جو مقصد تھا احسنِ تقویم کا وہ پورا ہو جائے گا اور اگر یہ چیز پیدا نہیں ہوگی' تو پھر فساد اور بگاڑ ہی ہوگا۔ وہ جو ملائکہ نے آدم کو دیکھ کر کہا تھا کہ کس قسم کی ایک مخلوق پیدا کر دی' تو فساد پیدا کرے گا' خوں ریزیاں پیدا کرے گا۔ اس نے جواب میں اتنا ہی کہا تھا کہ اِنِّیٓ اَعۡلَمُ مَالَا تَعۡلَمُوۡنَ (2:30) ہم جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے۔ ہم جانتے ہیں کہ جب یہ اپنے اندر Balance (توازن) قائم کرے گا' صالحیت قائم کرے گا' تو پھر تو فرشتوں کو کہنا پڑا کہ ہمیں تو اتنا ہی علم ہے جتنا تم نے دیا ہے' اس سے زیادہ نہیں ہے تو خدا نے کہا کہ دیکھا! ہم نے کہا تھا کہ تمہیں معلوم نہیں کہ یہ کیا بن جائے گا۔ یہ جنہیں ہم کہتے ہیں کہ جی! وہ تو فرشتہ ہے تو یہ تشبیہ مناسب نہیں ہے۔

## یہ تشبیہ مناسب نہیں

فرشتوں کو تو اختیار و ارادہ ہی نہیں ہوتا تو پھر یہ اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمۡ اَجۡرٌ غَيۡرُ مَمۡنُوۡنٍ (41:8) ان کے اعمالِ صالحہ کا نتیجہ یہ غیر ممنون ہے۔ ایک تو یہ چیز ہے۔ اس کے معنی غیر منقطع کہہ لیجیے کہ جب تک یہ ایمان اور اعمال صالحہ رہیں گے یہ اجر ملتا ہوا چلا جائے گا' افراد میں بھی' معاشرے میں بھی' مملکت کے اندر بھی۔ جونہی وہ اس پٹڑی سے اترا پھر وہ اَسۡفَلَ سٰفِلِيۡنَ (95:5) ہوا فَاَحۡسَنَ صُوَرَكُمۡ (64:3) اس کائنات میں اُس نے تمہیں ایک ایسا پیکر (Form) عطا کیا جس میں حسنِ ذات کے امکانات' سمٹا کر رکھ دیئے ہیں۔ ان امکانات کو مشہود کرنے اور یہ دیکھنے کے لیے کہ ایسا ہو رہا ہے' ایک خارجی معیار کی ضرورت ہے۔ یہ معیار ذات خداوندی ہے جو حسین ترین دور مکمل ترین صفات کی حامل ہے۔ تم اس معیار کو اپنے سامنے رکھو اور صفاتِ خداوندی کو بحد بشریت اپنی ذات میں منعکس کرتے جاؤ۔

اب ہم پھر آ گئے درس کی آیت پر۔ سوال یہ ہے کہ کس طرح قائم ہوگا؟ کہا ہے کہ وَاِلَيۡهِ الۡمَصِيۡرُ (64:3) عام طور پہ اس کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ صاحب! پھر جانا تو خدا کے ہی ہاں ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس طرح سے ربط نہیں قائم رہتا۔ یہ جو احسنِ صور ہے' یہ خدا کی طرف رجوع کرنے سے ہوگا۔ یہ وہی ہے جسے کہتے ہیں کہ اس کے آغوش میں پناہ لینے سے یہ بات ہوگی تو وہ کیا چیز ہے؟ یہ ہے صفاتِ خداوندی کو اپنی ذات میں منعکس کرنا اور پھر اس میں حسن پیدا کرنا' ان صفات کے استعمال میں حسن اور توازن کو برقرار رکھنا۔ یہ ہے اِلَيۡهِ الۡمَصِيۡرُ (64:3)۔

## خدا تعالیٰ کی ذات تو انسان کے دل میں گزرنے والے خیالات سے بھی واقف ہے

آگے کہا ہے یَعۡلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَيَعۡلَمُ مَا تُسِرُّوۡنَ وَمَا تُعۡلِنُوۡنَ ۚ (64:3-4)۔ یہ چیز یہی نہیں ہے کہ

تم نے جسے یہ محسوس ارکان' دیکھے جانے والے' کہتے ہیں' وہ ادا کر لیے کہ مثلاً کہ اس طرح سے نماز پڑھ لی' رکوع کر لیا' سجدہ کر لیا' روزہ رکھ لیا' وہاں اس طرح کے حج کر آئے' یہ اتنی بات نہیں ہے۔ ہم تو اس کو بھی جانتے ہیں کہ **وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ** (64:4) تمہارے دل میں کیا خیالات گزرتے ہیں۔ کائنات کے اندر جو کچھ ہے' اس کا تو ہمیں علم ہی ہے۔ خارجی کائنات کو اختیار و ارادہ نہیں دیا گیا' وہ خدا کے قوانین کے مطابق کرتے چلے جا رہے ہیں۔ انسانوں کے اندر یہ ہے کہ **مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ** (64:4) جو کچھ تمہاری داخلی دنیا میں ہوتا ہے اور جو تم سے ظہور میں آ چکا ہے وہ اس سے بھی واقف ہے۔

عزیزانِ من! کوئی حیوان منافقت ہی نہیں کر سکتا' چڑیا وہاں جھوٹ نہیں بول سکتی' آپ نے کسی حیوان کو کبھی دیکھا ہے جھوٹ بولتے ہوئے۔ اس کی منافقت ہی نہیں ہوتی۔ یہ ہوتا ہی نہیں ہے کہ وہ اندر سے کچھ ہو' باہر سے کچھ ہو۔ شیر سامنے آئے گا شیر ہو گا۔ یہ تو انسان بھیڑیا ہے' جب سامنے آتا ہے تو بکری کی کھال اوڑھ کر آتا ہے اس لیے دوسرا مارا جاتا ہے' بھیڑیے کی شکل میں آئے تو پھر یہ فریب میں نہیں آ سکتا۔ کہا کہ تم یہ کچھ کرتے ہو۔ ٹھیک ہے تم انہیں فریب دے سکتے ہو' ہمیں فریب نہیں دے سکتے۔ ہم جانتے ہیں کہ تم نے یہ بکری کی کھال اوڑھی ہوئی ہے' ماسک پہنا ہوا ہے ہم تمہارے دل میں گزرنے والے خیالات تک سے بھی واقف ہیں اور دل میں گزرنے والے خیالات پہ تمہاری زیست کی' سیرت کی بنیاد تو استوار ہوتی ہے' پہلے دل میں خیال آتا ہے' ارادہ پیدا ہوتا ہے اور ارادہ عمل میں آتا ہے تو پھر اس کو کام کہتے ہیں۔ یہ بنیادی خیالات پہ ہے اور کہتا ہے کہ **وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ** (64:4) ہم دلوں میں گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہیں۔ کہا ہے کہ یہاں کھڑے ہو کر پھر تم پوچھو گے کہ صاحب! اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ تو قرآن حکیم کا انداز آپ کو معلوم ہے کہ تاریخ کو کتنی اہمیت دیتا ہے۔ ہم سے کہتا ہے' اب وہ معاشرے کی اور قوموں کی بات کرتا ہے۔

## قرآن حکیم کی پوری تعلیم کا ماحصل انسانیت کی حد تک ایک امت کی تشکیل ہے

میں نے کئی دفعہ کہا ہے کہ افراد کی بات قرآنِ حکیم بہت کم کرتا ہے۔ وہ اس لیے کرتا ہے کہ افراد کے مجموعے سے ہی قوم یا معاشرہ بنتا ہے۔ اصل چیز وہ قوم ہے' وہ امت ہے' وہ ملت ہے' وہ معاشرہ ہے' جس کے بگڑنے سے افراد بھی بیچارے نہیں سنور سکتے۔ ان کی وجہ سے جو تباہی آتی ہے' پھر اس میں افراد بھی بہے چلے جاتے ہیں۔ جب سیلاب آتا ہے' جیسا میں کہا کرتا ہوں' تو پھر وہ

---

❶ جو کچھ خارجی کائناتِ میں ہے' خدا اس سے بھی واقف ہے' اور جو کچھ تمہاری داخلی دنیا میں ہوتا ہے اور جو کچھ تم سے ظہور میں آ چکا ہے' وہ اس سے بھی واقف ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1321)۔

مسجد اور مندر میں امتیاز نہیں کرتا وہ نیک اور بد دونوں کو بہا کے لے جاتا ہے ❶ اسی لیے قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس تباہی کی پہلے سے احتیاط برتو' جب وہ آتی ہے تو پھر وہ انہی تک نہیں رہا کرتی جو ظالم ہوتے ہیں' تم کو بھی ساتھ لے جایا کرتی ہے۔ سیلاب آنے سے پہلے بند بنالو ورنہ یہ نہیں ہوگا کہ صاحب! اس میں وہ Overseer ہی مارا جائے گا جس نے سمینٹ کی جگہ ریت ڈال دی تھی۔ تم بھی اس کے اندر آجاؤ گے۔ تم پہلے سے اس کی احتیاط برت لو۔ کیا بات ہے! واتقوا' تقویٰ کے معنی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ آنے والے خطرے سے' تباہی سے' پہلے انتظام کرلینا۔ اسے کہتے ہیں متقی۔ یعنی ایسا کرنے والا' اے ساڈے والا متقی پرہیزگار نہیں' وہ آپ کو ذہن میں ہے کہ کیا تصور آجاتا ہے۔

## کرہ ارض پر بکھری ہوئی تاریخی شہادتیں قرآنی حقائق کا زندہ ثبوت ہیں

وہ یہ کہتا ہے کہ قوم کا جو نظام ہوتا ہے' اس کا نتیجہ تباہی بھی' خوشگواری بھی نکلتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ ہم سے کیا پوچھتے ہو' وہ جو اپنا انداز ہے' کہا کہ سابقہ اقوام جو گزر چکی ہیں' ان کے نوشتوں کو پڑھو' تاریخی شہادتوں کو سامنے لاؤ' کاغذوں پہ لکھی ہوئی نہیں ملتیں' تو جاؤ ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات کی اینٹوں پہ لکھی ہوئی ان کی داستان پڑھو۔ قرآن حمید کہتا ہے' عزیزانِ من! کہ اَلَمۡ یَاۡتِکُمۡ نَبَؤُا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ قَبۡلُ فَذَاقُوۡا وَبَالَ اَمۡرِہِمۡ وَلَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ (64:5) جو قومیں پہلے گزر چکی ہیں' جنہوں نے ان صداقتوں سے انکار کیا' سیکولر نظام قائم کیا' منافقت برتی' ان قوموں کے حالات کو دیکھو۔ اس نے دو لفظوں میں ان کی تباہی کی بات کہہ دی کہ وَبَالَ اَمۡرِہِمۡ (64:5)۔ ان کے اپنے کاموں کا بُرا نتیجہ سامنے آگیا۔

## قرآن حکیم کا لفظ 'امرھم' دراصل اپنے ہاں قرآنی نظام مملکت قائم کرنے کی ترغیب دیتا ہے

یہ دیکھیے صاحب! نظام مملکت' نظام حکومت' نظام معاشرہ' میں اَمۡرِہِمۡ (64:5) اس کے لیے آتا ہے۔ یہ قرآن حمید نے مومنین کے لیے کہا ہے کہ وَاَمۡرُہُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَہُمۡ (42:38)۔ یہاں کہا کہ اَمۡرِہِمۡ (64:5) ہے تو وہ سب اس کے معنی یہی کرتے ہیں کہ ''ان کا نظامِ حکومت باہمی مشاورت سے قائم ہوگا''۔ امر جب قوم کا کہا جاتا ہے' قرآن حمید کی رو سے تو نظام کے متعلق یہ بات ہوتی ہے۔ کہا کہ ان کے غلط نظام کا جو انجام تھا' پھر دیکھو جا کر کہ وہ کیا تھا۔ کہا کہ وَلَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ (64:5) تباہی آئی' وہ بڑی دردانگیز تباہی تھی۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ ذٰلِکَ بِاَنَّہٗ کَانَتۡ تَّاۡتِیۡہِمۡ رُسُلُہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ (64:6) قوموں کی تباہی کے سلسلے میں دو باتیں قرآن حکیم نے کہیں۔ کہا ہے کہ ہم دو شرطیں پوری کرتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ قوم کو پہلے متنبہ کر دیا جاتا تھا کہ یہ تمہاری روش غلط ہے' تباہی کے جہنم کی طرف لیے جا رہی ہے اس سے باز آجاؤ۔ اس کے لیے وہ کہتے ہیں۔ پھر رسول آتے تھے یا وحی آتی تھی۔ پہلی شرط یہ

---

❶ سیلاب نہ پُرسد درِ میخانہ کجاست

ہےاور دوسری شرط یہ ہے کہ اس قوم میں اس بات کے سمجھنے کی صلاحیت ہو کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ دو شرطیں پوری کردے۔ یہاں ایک شرط کا ذکر ہے کہ ان کی طرف خدا کے پیغامبر آئے انہوں نے کہا کہ تباہ ہو جاؤ گے یہ غلط روش جو تم اختیار کیے ہوئے ہو اس کا نتیجہ عذاب ہے تباہی ہے۔

## یہ بات جہانِ فردا کی، جہنم کی نہیں بلکہ اس جہنمی زندگی کی ہے، ہمارے اس خود ساختہ نظام کی ہے

جب ہم عذاب وغیرہ کا لفظ بولتے ہیں تو ہمارا ذہن فوراً قیامت پہ جا پڑتا ہے کہ وہ جہنم کی بات ہے۔ یہ یہاں کی تباہی کا ذکر ہو رہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ اقوامِ سابقہ کی تباہیوں کی طرف تم غور کرو۔ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ یَّهْدُوْنَنَا (64:6) انہوں نے کہا ایک ہی بات ہے کہ یہ ہمارے جیسا ایک انسان ہے اور ہمیں کہتا ہے کہ یہ راستہ غلط ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟

## خدا کے نبی کی دعوت فوق الفطرت کی بجائے ہمیشہ دلائل و براہین پر مبنی ہوتی ہے

شروع جاہلیت کے دور سے انسان تو ہم پرست واقع ہوا ہے۔ یہ اس بات کو بڑی آسانی سے مانتا ہی نہیں۔ اس پہ ایمان لے آتا ہے جو فوق الفطرت ہو خارق عادت ہو۔ آپ کرامت کہتے ہیں۔ یہ کرامات کا خوگر ہے۔ انبیاء کے سلسلے میں ان کو معجزات کہا جاتا تھا کہ ہمارے جیسا ایک انسان ہے۔ یہ بڑی عظیم حقیقت ہے ہمارے جیسا ایک انسان عقل وفکر کی رو سے آپ کو کچھ سمجھائے گا، علم وبصیرت کی رو سے سمجھائے گا، دلائل و براہین کی رو سے سمجھائے گا، وہ اپنے بالوں میں سے دودھ کر نچوڑ بات نہیں منوائے گا اور انسان اگر چہ یوں تو اتنا بڑا ہو گیا ہے ذہنی اعتبار سے ابھی یہ بچہ ہی ہے۔ اب بھی یہ کیفیت ہے کہ عقل وفکر اور دلائل و براہین کی رو سے آپ قرآن حمید سن رہے ہیں، قرآن حمید پہ غور کر رہے ہیں۔ ابھی کوئی باہر آ کر یہ کہے کہ صاحب! وہاں ایک بابا سا آدمی بیٹھا ہوا ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ منہ سے فوہ فوہ کرتا ہے تو آگ نکلتی ہے ہم لوگ اس کی طرف بھاگ کے چلے جائیں گے سبحان اللہ بہت بڑے بزرگ تھے صاحب! اللہ والے تھے صاحب! خدا کے بڑے مقرب تھے، کیسے بھئی؟ کہا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ وہ پھونک مارتے تھے تو آگ نکلتی تھی۔ اللہ والوں کی نشانی ہوگئی خواہ او نے زبان دے تھلے فاسفورس ای رکھی ہوئی ہووے (خواہ اس نے زبان کے نیچے فاسفورس ہی رکھی ہو)۔ انسان کے ذہن کے بچپن کی کیفیت اب بھی یہ ہے کہ وہ اعتراض ہی یہ تھا کہ ہمارے جیسا ایک انسان ہے اور ہمیں کہہ رہا ہے کہ تم غلط راستے پہ جا رہے ہو۔ اس کے ماتھے پر سینگ تو ہونے چاہئیں۔ بار بار نبی اکرمؐ کے متعلق، جب بھی وہ بیِّنت پیش کرتے، دلائل و براہین پیش کرتے، وہ کہتے کہ معجزہ دکھاؤ۔ حضورؐ ان کو کہتے کہ بابا! میں تمہاری عقل وفکر کو اپیل کر رہا ہوں، تم توہم پرستی کی طرف لیے جا رہے ہو۔ رسول کسی عجوبہ دکھانے کو نہیں آتا، انسانی فکر کو جلا دینے

کے لیے آتا ہے۔قرآن حکیم کے ان الفاظ پہ کبھی آپ نے غور کیا کہ **لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ** (24:61) یہ ہم باتیں بیان کرتے ہیں تا کہ تم عقل سے کام لینا سیکھو۔ وہ تو عقل سے کام لینا سکھاتا ہے اور یہ کہتے ہیں کہ خلافِ عقل کچھ ہونا چاہیے۔ کہتا ہے کہ یہ تھی کیفیت' جو انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا **فَكَفَرُوْا** (64:6) انکار کر دیا۔ **وَتَوَلَّوْا** (64:6) اور منہ پھیر کر چل دیئے۔ کہا کہ کیا یہ سمجھتے تھے کہ اللہ کچھ اپنا کام سنوارنے کے لیے ہمیں یہ کچھ کہہ رہا ہے۔ کوئی مکان وکان بنوانا ہے اس کے لیے اسے مزدوروں کی ضرورت ہوگی۔ وہ چل دیئے تو سمجھا کہ وہ اللہ کا کام رہ جائے گا۔

## انسانی زندگی کے لیے وحی کی راہنمائی خدا کی رحمانیت ہے' وہ خدا جو ہر چیز سے مستغنی ہے وہ تو غنی ہے

کہا ہے کہ **وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ** (64:6) یہ اللہ کا اپنا کام نہیں تھا' وہ تو مکان بھی تمہارا ہے' کمبختو! اس سے تمہارا ہی بیڑہ غرق ہو گیا۔ وہ تو مستغنی ہے تمہاری مدد کے لیے وہ تو اس وقت بھی صاحبِ اقتدار خدا تھا جب تم پیدا بھی نہیں ہوئے تھے' کائنات ہی جب وجود میں نہیں آئی تھی اور جب یہ وجود میں نہیں رہے گی' اس وقت بھی وہ خدا رہے گا' وہ تو اس بات کا محتاج نہیں تھا۔ کہا کہ **وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ** (64:6) دیکھیے! پھر دو صفتیں آ گئیں: غنی کے معنی یہ ہوتے ہیں جو انسانوں کے اندر دوسرے کا محتاج نہ ہو۔ جس کی یہ کیفیت ہو جائے کہ وہ کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو' اس کے تکبر اور غرور کا پوچھنا کیا: اوئے اسی کسے دا دتا کھانے آں! (اچھے! کیا ہم کسی کا دیا کھاتے ہیں!) یہ باتیں اب جو میں کہتا ہوں آپ کے ذہن میں نہیں آتیں' گاؤں کی زندگی ہے یہ۔ اس میں پہلی چیز یہ ہے کہ ہم کسی کے محتاج نہیں ہیں۔

## قرآنی حکومت کا پہلا ثمر نہ کوئی کسی کا محکوم ہوگا اور نہ ہی کسی کا کوئی محتاج

پہلی چیز اسلام کی یہ ہے' نظامِ قرآن کی یہ ہے کہ کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس۔ کوئی اتنا مستغنی نہ ہو جائے کہ دوسرے اس کے محتاج ہو جائیں۔ اب خدا تو یہ کہتا ہے' خدا خود اپنے متعلق کہتا ہے کہ ہم تو غنی ہیں۔ تو اس کے بعد پھر وہ بات آ گئی' وہ یہاں کا غنی آگے حمید کہتا ہے۔ ہمارا استغنیٰ تمہارے لیے تعریف کرنے کا موجب بن جائے گا کہ تم کسی اور کے محتاج رہو گے ہی نہیں۔ کیا بات ہے اس استغنیٰ کی!

یہ ایک سجدہ جسے تُو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

عزیزانِ من! یہ جو استغنیٰ ہے' وجہ حمد و ستائش ہے یا نہیں کہ وہ انسان کو کسی کا محتاج نہ ہونے دے۔ یہ ہے **غَنِيٌّ حَمِيْدٌ** (64:6) اللہ اس کا محتاج نہیں کہ لوگ اس کی اطاعت کریں تو اس کے کام سنوریں۔ اس کے سب کام' دوسروں کی مدد کے بغیر

سنورے ہوئے ہیں۔ یہ وہی بات صفاتِ خداوندی ہے۔عزیزانِ من! وقت ہوگیا درس دیر سے شروع کیا تھا لیکن اس کے لیے ہم نے وہ پورا ایک گھنٹہ کر دیا ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ التغابن 64 ویں سورۃ کی چھٹی آیت تک ہم آ گئے: (64:7) سے آئندہ شروع کریں گے۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ**(2:127)

❀......❀......❀

# دوسرا باب: **سورة التغابن** (آیات 7 تا اختتام)

عزیزانِ من! آج اگست 1983ء کی چھبیس تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ التغابن کی آیت 7 سے ہو رہا ہے: (64:7)۔

## قرآن حکیم کی تعلیم کا مرکزی نکتہ شرارِ بولہبی کے بالمقابل چراغ مصطفوی ﷺ کو روشن کرنا ہے

قرآنِ کریم کے ان درسوں سے یا ویسے ہی قرآن حکیم کو سمجھنے کے بعد یہ حقیقت تو آپ کے سامنے آ گئی ہو گی کہ ساری قرآن کریم کی تعلیم، اس کے نکات، اس کا ماحصل، حق اور باطل کی کشمکش ہے، تعمیری اور تخریبی قوتوں کا ٹکراؤ ہے۔ یہ وہی ہے جسے اقبالؒ شرارِ بولہبی سے، چراغِ مصطفویؐ سے، ستیزہ کاری، [1] سے تعبیر کرتا ہے۔ قرآن حکیم کی تعلیم کا ملخص ہی یہ ہے۔ اس کا انداز، اس کے

---

[1] یہ ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ کے اس شعر کی طرف اشارہ ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی (بانگِ درا)

اسالیب' اس کے تمثیلات' اس کے استعارات مختلف ہوتے چلے جائیں گے لیکن اصل نکتہ کا یہی ٹکراؤ ہے یہی تصادم ہے' یہی تزاحم ہے۔ مذہب کی دنیا میں تو چونکہ اس تصادم یا ٹکراؤ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہاں تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے یا ہوتا تھا کہ مناظرے ہوتے تھے۔ قرآن کریم میں جہاں تصادمات یا اس کے بعد ان کے نتائج آئے ہیں تو ان کے لیے آسان تھا کہ اسے وہ آخرت پر اٹھا رکھیں۔ تو جہاں جہاں بھی یہ چیز آئی' انہوں نے اس کے معنی' اس کا مفہوم ہی آخرت لے لیا' تو اس دنیا کے اندر' کچھ اس قسم کا تصادم نہیں' ٹکراؤ نہیں' حق کے علمبرداروں کے لیے کچھ نہیں کرنا۔ اپنے طور پہ نماز روزہ حج زکوٰۃ ادا کیا اور سمجھ لیا کہ دین کا مقصد پورا ہو گیا ہے۔ اس لیے قرآن حکیم کے جہاں ایسے مقامات آتے ہیں وہ بڑے غور طلب ہوتے ہیں مگر ہمارے ہاں کے عام تراجم تفاسیر ان کو قیامت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ اس سے بات صاف نہیں ہوتی تو پھر یہ ہے کہ قیامت اور اس کے متعلقات ذہنِ انسانی سے ماوراء کی باتیں ہیں' بس ان کو پڑھ کر آگے بڑھ جانا چاہیے گویا نہ تو ہم وہ سمجھ سکتے ہیں' نہ ہمارے لیے ان کے اندر کسی قسم کی کوئی آیہ عبرت ہے' سبق ہے' تعلیم ہے' ہمارے لیے یہ چیز کچھ نہیں ہے۔

میں نے جیسا کہ عرض کیا ہے' آخرت کے وہ نتائج' آخرت کی وہ زندگی تو ہمارا ایمان ہے' اس کے بغیر ایک شخص مسلمان ہی نہیں ہو سکتا لیکن یہ نہیں ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ چیزیں آئی ہیں' ان کا تعلق صرف آخرت سے ہے' سب سے پہلے تو اس دنیا میں' یہ جو حق اور باطل کا ٹکراؤ ہے' وہ سب سے پہلے اس کو لیتا ہے۔ یہی ہمیں تعلیم دیتا ہے۔ اس کے لیے وہ جماعتِ مومنین کو تیار کرتا ہے۔ یہی ہے دین' یہی ہیں اس کے فرائض۔ اس کی روشنی میں یہ مقامات سمجھنے چاہئیں۔ یہاں چھٹی آیت تک قرآن کریم ان کو بیان کرتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ جو زیرِ نظر آیت ہے وہ یہی چیز تھی کہ رسول اللہ یہ دعوت پیش کرتے تھے اور وہ اس سے انکار کرتے تھے' کبھی ایک حجت سے' کبھی کسی دلیل سے۔ قرآن حکیم اس کی بھی تردید کرتا چلا جاتا ہے کیونکہ وہ تو خود دلائل و براہین کی بناء پہ ایک چیز پیش کرتا ہے جو اس کی آخری منزل ہوتی ہے' جہاں پھر وہ ٹکراؤ ہوتا ہے۔ وہ خود یہ ٹکراؤ بھی نہیں کرتا۔ جب وہ ان چیزوں کی مخالفت سے باز نہیں آتے' وہ ٹکراؤ کے لیے تیار ہو جاتے ہیں' میدان میں اتر آتے ہیں تو وہاں یہ صورت نہیں ہے کہ یہ کہیں کہ ہمارا فریضہ تو وعظ و نصیحت تھا' وہ ہو گیا' ٹھیک ہے بھئی! اب تم یہ کرتے ہو' کرتے رہو۔ وہ وہاں تو اس کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔

## نبوت کی زندگی کے پہلا دور کی مصروفیات اور اس کے نتائج

اب یہ جو صدرِ اول کی' نبی اکرمؐ کے ہجرت سے پہلے دور کی ہماری تاریخ ہے' اس میں زندگی کا ایک لمبا عرصہ ہے جس میں ان لوگوں سے دلائل و براہین کی بناء پر یہ چیز بتائی گئی کہ جو روش تم اختیار کیے ہوئے ہو وہ تمہارے لیے بھی تباہی کا موجب ہے' انسانیت کے لیے بھی یہ سوزناک ہے۔ ہجرت کے بعد اب یہ جماعت تعداد میں بھی مختصر تھی' ویسے ساز و سامان کے اعتبار سے بھی' بے کسی کا سا

عالم تھا، دولت نہیں تھی، حشمت نہیں تھی، ابتداء میں تو مملکت بھی نہیں تھی۔ اس لیے جب یہ کہتے تھے کہ اس روش کا نتیجہ تمہاری تباہی ہوگا تو وہ اس کو مذاق سمجھتے تھے۔ عام معیار کے مطابق تو ان کی سمجھ میں یہ بات ہی نہیں آتی تھی کہ کبھی ہماری تباہی، ان لوگوں کے ہاتھوں بھی ہو سکتی ہے، قرآن حکیم میں یہ عام مقامات میں آتے ہیں۔ یہ ساتویں آیت ہے جہاں سے ہم شروع ہوتے ہیں۔ کہا ہے کہ زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا (64:7)۔ یہ خیال کیے بیٹھے ہیں۔ زعم کا کیا عجیب لفظ یہاں آیا ہے۔ یہ ہے جسے ہم خیالِ خام کہتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کا خیالِ خام ہے، یہ اپنی اس چیز میں مگن ہیں کہ لَّنْ يُّبْعَثُوْا [1] (64:7)۔ یہاں یہ بعث کا لفظ ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں تو ''بعث بعد الموت'' ہی کہا جاتا ہے۔ یہ ہے وہ جو ایمان کا جزو ہے۔ ہمارے ہاں کے وہ الفاظ ہیں۔ ان میں بھی یہ آخرت کی زندگی کے متعلق بعث بعد الموت کی بات صحیح ہے لیکن یہ بعث کو دیکھیے قرآن حکیم اس میں کہتا کیا ہے۔

## قرآن حکیم کو سمجھنے کا طریق اور لفظ بعث کا مفہوم

عزیزانِ من! زبان کے اعتبار سے، میں پھر یہ عرض کرونگا، پتہ نہیں زندگی کتنی ہے، بعد میں بھی آپ احباب نے قرآن حکیم سمجھنا ہو، تو پہلی چیز یہ ہے کہ قرآن حکیم کے الفاظ کے وہ معنی سمجھیے جو زمانہ نزولِ قرآن میں عربوں کے ہاں مستعمل تھے۔ یہ بات میری ''لغات القرآن'' میں آپ کو ملے گی۔ میں نے اس چیز کو سمجھنے میں ایک عمر صرف کی اور اس کو میں نے اس کے اندر محفوظ کر دیا۔ یہ جو بعث ہے، آپ نے سنا ہوگا کہ یہ بعث پارٹی عراق میں ہوتی تھی۔ یہ بعث کیا چیز ہے؟ بعث کے معنی ہوتا ہے ''کسی چیز کو راستے سے ہٹا دینا، کسی کی آزادی کے راستے میں جو رکاوٹیں ہوں ان رکاوٹوں کو دور کر دینا'' چنانچہ وہ جو وہاں کی تاریخ تھی وہ جیسی بھی تھی، میرا اس سے مطلب نہیں یعنی وہ لفظ آج بھی دیکھیے کہ وہ جو اہلِ زبان اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں، تو کن معنوں میں استعمال کرتے ہیں: ان کی آزادی کے راستے میں جو رکاوٹیں تھیں، جو روڑے اٹکائے جاتے تھے، ان کو دور کر دینا، ان کو ہٹا دینا یہ بعث تھی۔ اب بھی اس کا نام بعث پارٹی ہے۔ بعث کا لفظ عربی زبان میں ان معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔

## نبی اکرمؐ کی بعثت کا عظیم مقصد انسانیت کے مابین تمام رکاوٹوں کو پُرعزم ارادوں کے ساتھ دور کرنا تھا

کہتے ہیں کہ یہ مخالفین اس زعمِ باطل میں مبتلا ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ کیا ہم راستے سے ہٹا دیئے جائیں گے؟ کتنی بات صاف ہو رہی ہے اور اس سے وہ بات سمجھ میں آ گئی۔ آپ کے ہاں کے جہاد جنگ کا مقصد یہ ہے کہ جو رکاوٹیں انسانیت کے راستے میں حائل ہوتی ہیں، انہیں راستے سے ہٹا دینا۔ یہ تھا ان لڑائیوں کا مقصد جو صدرِ اوّل میں لڑی گئیں یا جنگ کا یا اسلام کا مقصد جسے جہاد کہتا ہے

---

[1] یہ لوگ جو اس ضابطہ ہدایت سے انکار اور سرکشی اختیار کر رہے ہیں، (اپنے پیشرووں کی طرح اس زعم باطل میں مبتلا ہیں کہ یہ بڑی قوتوں کے مالک ہیں، اس لیے انہیں راستے سے ہٹایا ہی نہیں جا سکتا (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔1322)۔

کہ انسانیت کی نشو ونما کے راستے میں جو رکاوٹیں حائل ہوں' ان رکاوٹوں کو دور کرنے کے معنی یہ ہیں۔ یہ تھا ما حصل' یہ تھا وجہ جواز' یہی تھا مقصد ان لڑائیوں کا جو آخر میں لڑنی پڑیں۔ کہا کہ کیا کہہ رہے ہیں یہ لوگ؟ کہ یہ ہمیں راستے سے ہٹا دیں گے۔ دیکھیے تو سہی۔ **قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ** (64:7)۔:اف! کتنا عزم ویقین ہے! ذرہ و نا چیز و تعمیرے بیابانِ نگر! مٹھی بھر سی جماعت ہے لیکن کہنے والا تو خدا ہے۔ زبان کے اعتبار سے بھی آپ اس مقام پہ الفاظ دیکھیے۔ قرآن حکیم سمجھنے کے لیے کچھ زیادہ عربی جاننے کی ضرورت نہیں ہوتی یہ بڑی آسان زبان میں ہے۔ کہا کہ **قُلْ** (64:7) اے رسول! اعلان کر دو ان کو **بَلٰی** (64:7) ایسا ہو کر رہے گا **وَرَبِّیْ** (64:7) میرا خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا: **بَلٰی وَرَبِّیْ** (64:7)۔ یہ کیا ہو کر رہے گا؟ کہا کہ **لَتُبْعَثُنَّ** (64:7) تم یقیناً اس راستے سے ہٹا دیئے جاؤ گے۔ تم انسانیت کے راستے میں روک بن کر ہمیشہ کے لیے کھڑے نہیں رہ سکتے' تم راستے سے ہٹا دیئے جاؤ گے۔ کیا بات ہے صاحب! کن حالات میں یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے! آج کی اصطلاح میں پناہ گزیں سمجھ لیجیے۔ یہ مدینے میں پناہ گزینوں کی ایک مٹھی بھر سی جماعت ہے' اس زمانے میں رہنے کو ٹھکانہ تک بھی نہیں ہے۔ یہ دنیا بھر کی مخالفتوں کا ہجوم سامنے ہے اور ان سے کہا کہ **اَنْ لَّنْ یُّبْعَثُوْا** (64:7) کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہیں راستے سے نہیں ہٹایا جائے گا؟ یقیناً ہٹایا جائے گا اور **قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ** (64:7) میرا خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا اور پھر وہاں تمہیں بتایا جائے گا کہ **ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ** (64:7) تمہاری تخریبی کاروائیاں کیا کر رہی ہیں۔

اب عزیزانِ من! یہ دیکھیے! یہ راستے سے ہٹانا اس کے بعد یہ بتانا کہ تمہارے ان تخریبی اعمال کا نتیجہ کیا ہے یہ تو اس دنیا کے اندر ہی سارا کچھ تھا اور یہ ہو کر رہا' یہ ساری قوتیں راستے سے ہٹائی گئیں' انسانیت کی راہیں ہموار کر دی گئیں' خدا کی طرف جانے والے راستے میں جو بھی' یہ جتنے جتنے جس جس قسم کی رکاوٹیں تھیں' ان کو ہٹا دیا گیا اور پھر انہیں بتا دیا جائے گا یعنی نتائج بتا دیں گے اور آگے یہ ہے کہ تم اس جماعت کو اپنے سامنے رکھ کر یہ کہتے ہو کہ یہ تو بڑا دشوار گزار مرحلہ ہے' ناممکن العمل ہے۔ کہا کہ **ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ** (64:7) خدا کے نظام' اس کے قانون کے نزدیک یہ بڑی آسان بات ہے' کچھ مشکل نہیں ہے اس لیے کہ حق تو خود اپنے اندر اتنی قوت رکھتا ہے بس اسے کوئی لے کر اٹھے تو سہی پھر آپ دیکھیے کہ جس طرح سے وہ کہتے ہیں کہ اسے جھاڑ و پھیر کر رکھ دیتا ہے اور **ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ**(64:7) اللہ کے نزدیک ایسا کچھ کرنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ لہٰذا جماعتِ مومنین سے ہی کہا کہ اگر اس تباہی سے بچنا چاہتے ہو تو **فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا** (64:8) تو پہلی چیز یہ ہے کہ ایمان لاؤ اللہ کے اوپر اور اس کے رسول کے اوپر اور اس نور کے اوپر جو اس نے نازل کیا ہے۔ قرآنِ مجید میں خود قرآن کے لیے نور کا لفظ آیا ہے اور اس سے جامع لفظ کیا ہو سکتا ہے کہ یہ خود **مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ**(2:257) ہے۔ ایسے بھی کہا گیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ نوعِ انسانی کو تاریکیوں

سے نکال کر روشنی میں لے آیا۔ یہ بڑی جامع چیز ہے۔ خود قرآن مجید روشنی ہے' نور ہے اور نور کے ساتھ تشبیہہ دینے میں تو بڑی بڑی چیزیں اس کے اندر آجاتی ہیں۔ نور جو خود روشن ہوتا ہے' وہ اس کا محتاج نہیں ہوتا کہ اس کو دکھانے کے لیے کوئی خارج سے یہ بتانے کے لیے روشنی آنی چاہیے کہ یہ سورج ہے' اسے کسی چراغ کی ضرورت نہیں ہوتی: آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔ ہر روشن چیز اپنے وجود کے لیے خود ایک ثبوت اور دلیل ہوتی ہے اور پھر وہ دوسروں کو روشنی عطا کرتا ہے' راہنمائی دیتا ہے' وہ تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتا ہے۔

## وحی کی ایک روشنی سے ہر شے روشن ہو جاتی ہے جب کہ جہالت کے اندھیرے میں کسی کو اپنا ہاتھ بھی نظر نہیں آتا

جیسا آپ کو یاد ہوگا میں نے کہا ہے کہ قرآن کریم نے تاریکی کے لیے تو جمع کے صیغے استعمال کیے ہیں' ظلمت کہا ہے کہ مختلف نوعیّتوں کی وہ تاریکیاں ہوسکتی ہیں مگر روشنی کے لیے واحد کا لفظ ہی استعمال کیا ہے کہ یہ خدا کی طرف سے دی ہوئی روشنی ہے' جس سے نبی اکرمؐ نے انسانیت کے راستے روشن کیے تھے اس کے لیے جمع کے صیغے استعمال کرنے کا سوال ہی نہیں ہے۔ یہ ایک روشنی ہے۔ ایک سورج نکل آتا ہے تو سو بتیوں کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ کہا کہ وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ (64:8) ❶ اور یہ چیز خدا کے قانونِ مکافات کی نگاہوں میں ہے کہ تم کیا کرتے ہو' تمہارے مخالفین کیا کرتے ہیں اور دیکھیے کہ یَوْمَ یَجْمَعُکُمْ لِیَوْمِ الْجَمْعِ (64:9) ❷ جس دن تمہیں اکٹھا کیا جائے گا' تم ایک میدان کے اندر آمنے سامنے آؤ گے۔ اب یہاں بھی میں نے کہا ہے کہ ہمارے ہاں مذہب کی پرستش ہے' اس میں اس کو بھی قیامت کا اجتماع کہا جاتا ہے کہ وہاں جب تم آؤ گے تو دیکھیے تو سہی کہ کاہے کے لیے وہ کہتا ہے کہ آؤ گے۔

## لفظ تغابن کا مفہوم کسی چیز میں کمی ہو جانے کے ہوتے ہیں

کہا ہے کہ ذٰلِکَ یَوْمُ التَّغَابُنِ (64:9) ❸۔ یہ لفظ تغابن ہے جس سے اس سورۃ کا نام بھی سورۃ التغابن رکھا گیا ہے۔ اس نے بات صاف کر دی ہے تغابن مادہ کے لحاظ سے غبن (غ ب ن) کا لفظ ہے۔ یہ لفظ آپ نے بھی سنا ہوگا' ہماری زبان میں بھی یہ

---

❶ یعنی اس ضابطۂ قوانینِ (قرآن) پر ایمان لاؤ جسے اللہ نے تمہاری عقل کی راہ نمائی کے لیے اسی طرح روشنی بنا کر بھیجا ہے (جس طرح تمہاری آنکھ کے لیے سورج کی روشنی پیدا کی ہے)۔ تمہارے تمام کام' خدا کے قانونِ مکافات کی نگاہ میں رہتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1322)۔

❷ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو پھر اس کشمکش کا آخری فیصلہ میدانِ جنگ میں ہوگا جس میں تم جمع ہو جاؤ گے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1322)۔

❸ وہ ہار جیت کا دن ہوگا۔ اس تصادم سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ کس میں کس قدر کمی رہ گئی تھی جس کی وجہ سے وہ ہار گیا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1322)

لفظ استعمال ہوتا ہے لیکن وہ ذرا سے الگ مفہوم میں ہوتا ہے یا اس کا ایک گوشہ ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں تو ''غبن'' کرتے ہیں کہ وہ ''غبن'' کر گیا' اس کا سارے کا سارا مال ہی غبن کر گیا' ختم ہی کر دیا۔ لغت میں اس کے معنی ہوتا ہے'' کم کر دینا''۔ کمی یہ لفظ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جو تغابن ہے' وہ یہ ہے کہ اس میں کتنی کمی رہ گئی ہے۔ یہ جو تصادم ہوگا' جب یوم الجمع یہ لشکر آمنے سامنے آئیں گے' اکٹھے ہونگے' تو اس وقت یہ ٹیسٹ ہو جائے گا۔ ابھی تو اپنے زعم میں وہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم اتنے بڑے طاقتور ہیں۔ بہر حال تم بھی میدان میں جاتے ہو تو یہی سمجھ کر جاتے ہو کہ مقابلہ کر لیں گے تو یہ میدانِ جنگ ہے' ایسا مقام ہے جہاں پتہ چل سکتا ہے کہ کس میں کتنی کمی رہ گئی ہے۔ انسانی دنیا کے معاملات میں رہو تو پھر معاملے کے اندر ایک دوسرے کی کمی کر دینا ہوتا ہے لیکن یہاں جو آیا ہے کہ جب یہ جو یوم الجمع ہے' جب یہ لشکر آمنے سامنے ہونگے' اکٹھے ہونگے' تو وہاں ٹیسٹ یہ ہوگا کہ کس میں کتنی کمی رہ گئی تھی۔

کیا بات ہے صاحب قرآن مجید کی! اگر اس قسم کا ٹیسٹ نہ ہو تو انسان کو پتہ ہی نہیں چل سکتا کہ میرے اندر کمی کتنی ہے' قوت کتنی ہے اور مقابلے کے وقت یہ کمی ہوگی یا زیادہ ہوگی۔ یہ جو کمی یا زیادتی ہے' آپ جانتے ہیں۔ اس کو Relative Term کہتے ہیں یعنی کوئی ایک پیمانہ ہونا چاہیے' Source ہونا چاہیے۔ اگر آپ پیمانہ رکھیں گے کہ دس کم ہیں' ایک سو دس کہیں گے تو دس زیادہ ہیں۔ کس سے دس کم ہیں؟ سو سے دس کم' سو سے دس زیادہ' اس کو اضافی یا Relative Term کہتے ہیں۔ یہ جو قرآن تغابن کا لفظ لایا ہے' وہ یہ چیز ہے کہ یہ Relative Term ہے۔ جب تمہیں فریقِ مقابل سے تقابل ہوگا' تصادم ہوگا' تو معلوم ہو جائے گا کہ تم میں اس کے مقابلے میں کچھ کمی ہے یا ان میں تمہارے مقابلے میں کچھ کمی رہ گئی اور آپ جانتے ہیں کہ قرآن حمید کا تو یہ جو قانونِ مکافات ہے' جو نتائج مرتب کرنے کا وہ میزان کا اصول ہے وہ ہے ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُهٗ (101:8) خَفَّتۡ مَوَازِيۡنُهٗ (101:6) ترازو کے دو پلڑے ہیں' ان میں سے کونسا پلڑا جھکتا ہے' کونسا پلڑا ہے جس میں وزن کی کمی رہ گئی ہے۔ وہ دیکھیے! وہی تغابن کا ''لفظ کمی'' کے معنوں کے اندر یہاں بھی آ جاتا ہے' یہ یوم التغابن ہے۔

## قانون مکافات عمل کا ترازو وہمواریوں اور ناہمواریوں کے مطابق فیصلہ کرے گا

کہا ہے کہ وَمَنۡ يُّؤۡمِنۡۢ بِاللّٰهِ وَيَعۡمَلۡ صَالِحًا يُّكَفِّرۡ عَنۡهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدۡخِلۡهُ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ (64:9) ❶۔ وہ لوگ جو اُس پروگرام پر یقین رکھتے ہیں جو خدا نے عطا کیا ہوا ہے' جو خدا کی عطا

---

❶ وہ جماعت جو قوانینِ خداوندی کی صداقت پر ایمان رکھتی ہے اور اس کے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہے' ان میں جو تھوڑی بہت کمیاں رہ گئی ہوں گی' ان کے حسنِ عمل کی قوتوں سے ان کی مدافعت ہو جائے گی۔ اور اس طرح (وہ اپنے مخالفین پر کامیابی حاصل کر کے) ایسا جنتی معاشرہ قائم کر لیں گے (یعنی جب تک وہ معاشرہ قائم رہے گا انہیں جنت کی سی زندگی میسر رہے گی) اور یہ بہت بڑی کامیابی ہوگی (یہی کیفیت اُخروی زندگی میں بھی ہوگی)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 23-1322)۔

کردہ صلاحیتوں پر یقین رکھتے ہیں اور پھران سے ایسے اعمال سرزد ہوتے ہیں۔ یہ صالحاً بڑا جامع لفظ ہے جوقرآن کریم میں آتا ہے۔ایک تو یہ جواس کا مادہ ہے‘ جس سے صلح کا بھی لفظ نکلتا ہے‘اس کے معنی ہمواریاں ہوتا ہے یعنی ناہمواریوں کودور کردینے والے اور صلاحیت جو ہمارے ہاں لفظ آیا ہے‘ صالح‘ وہ عمل ہوگا جوانسانیت کی صلاحیتوں کو بروئے کارلائیں‘ان میں نشوونما پیدا کریں۔ سوال تو سارا ان صلاحیتوں کے ٹکراؤ کا تھا جواس میدان میں آیا ہے۔ وہاں دیکھا جائے گا تو جماعت خدا کےقوانین کی صداقتوں پر یقین رکھے گی اورانہوں نے وہ کام کیے ہونگے جن سے ان کی صلاحیتیں برومند ہوگئی ہونگی‘ تو اگران میں کوئی کمی رہ گئی ہوگی‘ وہی پلڑا جو جھکتا اوراٹھتا ہوا ہے‘ تو یہ جوان کی صلاحیتوں کی زیادتی ہے‘ یہ جوادھر سے انہوں نے اپنے ہاں یہ وزن یا قوتیں اکٹھی کی ہیں‘ ان کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ جو کہیں کوئی لغزشِ پا تھی‘ تھوڑی بہت کمی رہ گئی ہے‘ تو وہ جو کمی ہے‘اس کا نقصان مٹ جائے گا۔

## خدا تعالیٰ کی رحمانیت انسانوں کی لغزشوں سے ہونے والی کمیوں کا علاج بھی تجویز کرتی ہے

یادرکھیے! قرآن حمید انسانوں کو معصوم نہیں گردانتا کہ کسی سے کوئی لغزش ہونے ہی نہ پائے۔ لغزش تو ہو جاتی ہے لیکن اس کے بعد اس لغزش کی وجہ سے جو کمی آجاتی ہے‘ جو نقصان ہو جاتا ہے‘ اس کی تلافی کا راستہ بھی اس نے بتا دیا ہے اور تلافی کا راستہ یہ ہے کہ اگر جو حسنات ہیں‘ وہ سیات کے نقصان کا ازالہ کر دیتے ہیں۔ طریقہ یہ ہے کہ کہیں کوئی کام ایسا ہوا ہے جس سے تمہاری صلاحیتوں میں کمی واقع ہوگئی ہے تو اس قسم کے کام کرو کہ جن سے وہ کمی بھی پوری ہو جائے اور پھر آگے بھی تم بڑھ جاؤ۔ وہ بیماری کے بعد Convalescence کی جو اسٹیج ہوتی ہے‘ بیماری کی وجہ سے جو کمزوری آجاتی ہے‘ تو اس میں آپ دیکھیے کہ پھر وہ طاقتور غذائیں بھی‘ طاقتور دوائیاں بھی‘ پہلے تو یہ ہوتا ہے کہ بیماری کی وجہ سے جو کمی آگئی ہے وہ پوری ہو جائے اور پھر یہ ہے کہ اس کے بعد اور طاقت آجائے تاکہ آئندہ جو بیماری آنے والی ہے‘ اس کی Resistence (مزاحمت) کی پاور اس کے اندر زیادہ ہو جائے قرآن کریم یہی سارے پروگرام دیتا ہے۔ وہ اتنا ہی فرق ہے کہ وہ صرف طبعی زندگی کے ہی نہیں دیتا‘ اس کے بھی دیتا ہے کہ طبعی زندگی کا‘ اس دنیا کی سطح کے اوپر انسان کی طبعی حالت کا بھی Perfection میں رہنا نہایت ضروری ہے اوراس کے ساتھ انسانی ذات کی نشوونما کے لیے بھی وہ اس قسم کا پروگرام دیتا ہے۔ کہا ہے کہ ان کی ان کمیوں کا جب ازالہ ہو جائے گا تو پھران کے لیے وہی جو قرآن کریم تشبیہاً ان کا انجام بتایا کرتا ہے‘ نہایت خوشگوار زندگی‘ سیرابیوں کی‘ خوشحالیوں کی‘ اوراس میں دوام ہوتا ہے کہ جن کے سیرابی میں فرق نہیں آئے گا۔

## قرآن حکیم نجات کے غیر قرآنی تصور کی بجائے فرد کا رفعت کا تصور پیش کرتا ہے

اس کے لیے کہا ہے کہ ذٰلِکَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ (64:9)۔ میں نے پہلے بھی بتایا تھا کہ قرآن حکیم اس تمام پروگرام کا یا مومن کی یا مومنین کی زندگی کا ماحصل نجات نہیں قرار دیتا۔ میں نے بتایا تھا کہ نجات کے معنی ہوتے ہیں ”کسی عذاب میں مبتلا یا کسی مصیبت

میں مبتلا ہونے والے کو اس مصیبت سے چھڑا دینا''۔ تو یہ تو ایک Negative Virtue ہے' بیماری کا علاج ہو جانا' وہ تو صرف بیماری گئی ہے' اس میں وہ طاقت اور توانائی نہیں آئی ہے اگر سارا زندگی کا ماحصل یہ ہو تو میں نے عرض کیا تھا کہ یہ باقی جو مذاہب ہیں' عیسائیت وغیرہ' ان کے ہاں اتنا ہی ہے کہ انسان ایک مصیبت میں پھنسا ہوا ہے' اس مصیبت میں سے اس کو نجات دلا دینا' یہ سارا ماحصل ہے۔ یہ کیا پروگرام ہوا؟ می نا سزد خدائے را۔ انسانوں کو پہلے مصیبت میں پھنسا دینا اور پھر ان سے کہنا کہ یہ کرو' یہ کرو۔ کا ہے کے لیے کرو؟ تا کہ اس مصیبت سے سے تمہیں نجات حاصل ہو جائے۔ قرآن حکیم نجات نہیں کہتا۔ وہ کہتا ہے کہ **فَوْزُ الْعَظِيْمُ** (64:9)۔ یہ وہی ہے جسے Achievement کہتے ہیں' کچھ حاصل ہونا' یہ حاصل ہوگا۔ تمہیں اس سے جو حاصل ہوتا ہے اس سے انسان آگے بڑھتا ہے' ارتقائی منازل طے کرتا ہے۔ یہ ہے فوز العظیم۔

## دین کی تکذیب کرنے والوں کا انجام

اور اس کے برعکس کہا ہے کہ **وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ** (64:10) جو لوگ ان صداقتوں سے انکار کرتے ہیں' اس کی مخالفت کرتے ہیں' یہ دو چیزیں ہیں: کفر اور تکذیب۔ یہ باتیں تو قریباً قریباً ہر درس میں ہی آتی ہیں لیکن درس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ان کو دہرایا جائے تو اس کی تکرار ہوتی ہے' وہ تکرار کی خاطر نہیں ہوتی' بلکہ معنی کا اور مفہوم کا اور اسے اجاگر کرنا ہوتا ہے۔ کفر اور تکذیب' آپ کو یاد ہے' میں نے بتایا تھا' کفر تو یہ ہے کہ سرے سے انکار کر دیا کہ میں نہیں مانتا' تکذیب ہوتا ہے زبان سے تو اقرار کرنا اس چیز کا' لیکن عملاً اس سے انکار کر دینا۔ یہ تکذیب کہلاتا ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ **اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ** (107:1) تم نے اس کو بھی دیکھا جو دین کی تکذیب کرتا ہے؟ کون ہے یہ؟ یہ ہے کہ جو اقرار تو اس چیز کا کرتا ہے' اعتراف کرتا ہے' کہ وہ مسلمان ہے' قرآن مجید کو مانتا ہے' خدا کو مانتا ہے' لیکن **فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ** (107:2:3) وہ جو معاشرے کا تنہا رہ جاتا ہے اس کو دھکے دیتا ہے اور جو بھوکا ہوتا ہے اس کی روٹی کا انتظام نہیں کرتا۔ یہ دین کی تکذیب کرتا ہے اور اسی لیے تو آگے کہا کہ **فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ** (107:4-5) ان مصلیوں کے لیے' ان نمازوں کے لیے' تباہی ہے تو اب جن کو مصلی یا نمازی کہا ہے' وہ تو بہر حال مسلمان ہی ہونگے' تو یہ مسلمان ہونے کے باوجود دین کی تکذیب کرتا ہے۔ یہ کفر نہیں ہے' یہ تکذیب ہے کہ جو کچھ اس سے کہا گیا تھا اور جس کا یہ زبانی اقرار کرتا ہے کہ یہ ہاں صاحب! یہ سب چیزوں پہ میرا ایمان ہے' عملاً وہ کر کے نہیں دکھاتا' ان کے خلاف جاتا ہے تو تکذیب کے یہ معنی ہیں۔ تو یہ لوگ جو سرے سے انکار کرتے ہیں ان صداقتوں سے یا زبان سے اقرار کرتے ہیں عملاً اس کی تکذیب کرتے ہیں' ان کو جھٹلاتے ہیں' کہا ہے کہ **اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا** (64:10) ان کا انجام تباہی

ہے'اس دنیا میں بھی تباہی ہے' آخرت میں بھی تباہی ہےاور وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (64:10) وہ آخری مقام جسے آپ کا پناہ کہتے ہیں' ان کے لیےنہایت برا مقام ہے۔

## مصیبت کے غلط تصور کے علاوہ باذن اللہ کا قرآنی مفہوم

کہا ہے کہ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (64:11)۔اب یہاں پھرایک لفظ آیا۔عام ترجمہ' آپ کہیں گے کہ یہ ہے کہ''کوئی مصیبت نہیں آتی انسان کے اوپر سوائے اللہ کی اجازت کے' اللہ مصیبت کو اجازت دیتا ہے تو وہ آتی ہے' تو وہ تو اللہ کی اجازت سے جو آگئی ہے پھر یہ اس کے لیے کیا کرسکتا ہے۔اگر یہ اس کا کچھ مدافعت کرتا ہے' علاج کرتا ہے' یہ تو خدا کے ساتھ جنگ ہوگئی۔اس نے جو کہا ہے کہ''مصیبت میں تو اس کی طرف جاؤ'' اور یہ اس کو روک رہا ہے' یہ دھکا دے رہا ہے' آ بھی گئی ہے تو اس کا پھر کوئی علاج کرر ہا ہے اور سارے قرآن کریم میں ان کا علاج بتایا ہوا ہے۔آپ نے دیکھا یہ بات کہاں چلی جاتی ہے ایک لفظ کے غلط تصور سے۔''اذن'' کے معنی اجازت یا حکم دینا نہیں۔پہلی چیز تو یہ دیکھ لیجیے کہ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ (64:11)۔ہمارے ہاں تو مصیبت کا لفظ مصیبت کے ہی لیے آتا ہے۔اس کا اور ترجمہ کیا کروں!!! بنیادی عربی زبان میں یہ''مصیبت'' کا لفظ ہر واقعہ کے لیے آتا ہے۔ یہ دیکھیے! ما اصاب یہاں سے ہے۔ یہ روٹ' اس کا واقعہ ہونا' کوئی واقعہ نہیں ہوتا الا باذن اللہ اور اذن کے معنی ہوتا ہے ''قانونِ خداوندی''۔کائنات میں جو واقعہ بھی عمل میں آتا ہے' اس کے لیے قانون مقرر ہے' قانونِ خداوندی کی رو سے ایسا ہوتا ہے۔

## عالم خلق کی خاطر عالم امر میں کائنات کی ہر شے کے لیے Cause & Effect کی تدوین کا مسئلہ

ہر واقعہ کے لیے ایک قانون بتایا ہے' اگر وہ بنیادی قانون آپ طور سے دیکھیں۔اس کو غور سے سنیے گا' یہ مسئلہ تقدیر کو حل کرے گا۔ بنیادی طور پہ تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ خدا نے ایسا کیا مثلاً آگ میں انگلی ڈالو تو وہ جلا دے گی یا آگ کا یہ فریضہ ہے کہ پانی رکھو تو وہ Boil (ابلنا) ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ ہمارے سامنے تو یہ Cause & Effect کا مسئلہ ہوگیا۔آگ Cause (سبب) ہے اور پانی کا کھول جانا اس کا Effect (اثر) ہے۔ یہ قانونِ خداوندی ہے لیکن یہ چیز کہ خدا نے آگ کو بنایا' اس طرح سے اگر وہ ہمیشہ حرارت دے اس اور یجن کے اوپر جائیں گے تو پھر تو خدا نے آگ کو یہ حکم دیا تھا کہ تم نے حرارت بہم پہنچانی ہے۔وہاں یہ چیز ہے اسی لیے یہ جو عالمِ امر ہے' جہاں یہ چیزیں خدا طے کرتا ہے کہ آگ سے کہتا ہے کہ تُو نے حرارت بہم پہنچانی ہے' پانی سے کہتا ہے' تو نے پیاس بجھانی ہے' یہ جو چیزیں ہیں وہ اس کے لیے ہے کہ یحکم ما یرید (5:6) وہاں صرف خدا کی مرضی کا اختیار چلتا ہے۔یہ بات نہیں ہے کہ پہلے کوئی Cause (سبب) موجود تھا تو پھر آگ نے حرارت بہم پہنچائی۔وہاں یہ بات نہیں ہے لیکن جب وہ چیز عالمِ خلق میں آجاتی ہے' ہماری دنیا میں آتی ہے' تو پھر وہ قانون کو اپنے ساتھ لیے ہوئے آتی ہے' پھر یہ ہر شے یہاں علت اور معلول'

جسے آپ سبب اور مسبب کہتے ہیں' آپ Cause & Effect کہتے ہیں۔ اب وہ ہر شے Cause & Effect کے دائرے کے اندر آجاتی ہے۔ یہاں کوئی واقعہ بھی ایسا نہیں ہوتا جس کے لیے Cause نہ ہو۔ اتنی بڑی چیز ہے اور قرآن حمید نے تو متعدد مقامات پہ یہ بتایا ہے کہ ہر واقعہ کا ایک Cause (سبب) ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے یہ ایسا ہوتا ہے۔

## عقل انسانی کو جلا بخشنے کے لیے قندیل قرآنی ایک لازوال ذریعہ ہے

اگلی بات ہے جس سے واقعی ایسے مقام نگاہوں میں نورانیت پیدا کر دیتے ہیں' کہا ہے کہ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهُ (64:11) جو اس چیز پہ یقین رکھتا ہے' یہ علم حاصل کرتا ہے تو اس سے اس کی فراست کو ایک روشنی مل جاتی ہے جو Cause سے معلوم کر لیتا ہے کہ اس کا Effect کیا ہوگا۔ قرآن حمید کی گہرائیوں میں جانے سے مومن کو ایک بصیرت حاصل ہو جاتی ہے جس سے اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ بڑے جامع ہیں۔ کیفیت یہ ہوتی ہے کہ' خارِ دید واحوال چمن گفت۔ وہ کانٹا دیکھتا ہے تو سارے باغ کی کیفیت بیان کر دیتا ہے۔ یہ اس قسم کی فراستِ مومنانہ کیسے حاصل ہوتی ہے؟ یہ علم ہونے کے بعد کہ آگ کا Function (فریضہ) یہ ہے کہ یہ حرارت پہنچائے' اس درجے تک یہ پانی کو بوائل کرے' اس سے آگے اگر ہم ہاتھ ڈالیں گے تو یہ جلا دے' جلا دینے سے یہ تکلیف پہنچے' یہ سارا کچھ' یہ علم حاصل ہونا یہ فراست کا حاصل ہونا ہے۔

## زاویہ نگاہ کی تبدیلی کے سلسلہ میں قرآن حکیم نے قلب کا لفظ استعمال کیا ہے

قرآن حکیم کہتا ہے کہ جامع لفظ ہے کہ یہ جو واقعہ بھی کائنات کے اندر ہوتا ہے اس کا ایک Cause (سبب) ہوتا ہے' پھر وہ واقعہ ہوتا ہے۔ وہ Cause (سبب) یقیناً خدا کا ہی مقرر کیا گیا ہے لیکن یہاں وہ غیر متبدل ہیں اور جو ان صداقتوں پر' ان قوانین پر' ایمان رکھتا ہے کہ واقعی ایسا ہوتا ہے' تو اس کے بعد اس کے قلب کو' اس کے ذہن کو' یہ صلاحیت حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ دور سے دیکھ لے کہ ایسا کچھ ہے۔ ہاں تو یہ قرآن حمید کا بڑا جامع لفظ ہے لیکن قرآن حکیم نے قلب کا لفظ بھی تفکر کے لیے استعمال کیا ہے' یہ سمجھنے کے لیے ہے تو اسے یہ صلاحیت ہو جاتی ہے کہ وہ دور سے دیکھ لیتا ہے' بہت پہلے بھانپ لیتا ہے کہ ایسا کچھ وجود میں آنے والا ہے کیونکہ وہ اس Cause (سبب) کا نتیجہ جانتا ہے۔ یہ آ گیا قلب کا۔ کیا بات ہے! قرآن حکیم ایسے شخص کو راہنمائی کی روشنی دیدیتا ہے جو خدا کے ان قوانین کی صداقتوں پر یقین رکھے اور پھر ایسی فراست حاصل کرلے کہ وہ دور سے آنے والا جو Cause (سبب) فوراً سامنے نہیں آتا' بہت سے ایسے اسباب ہوتے ہیں کہ جو بڑی گہری نظر سے' تفکر سے' تدبر سے' علم سے' ہی معلوم ہو سکتے ہیں۔ وہ سامنے آتے ہیں تو پتہ چلتا ہے اور ہمارے جیسے کو تو اس وقت بھی پتہ نہیں چلتا' اس وقت بھی ہم کہہ دیتے ہیں کہ اللہ کی مرضی ایسی تھی صاحب! کیا کیا جائے۔ اللہ کا قانون ایسا تھا' ہم نہیں کہتے۔ اس کے لیے تو علم حاصل کرنا پڑتا ہے لیکن وہ جنہیں فراست حاصل

ہوتی ہے وہ بہت پہلے سے یہ بتا دیتے ہیں۔ یہ کوئی پیشین گوئی نہیں ہوتی۔

## Cause & Effect کا یہ قانون خارجی کائنات کے علاوہ انسانی دنیا کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔قرآن حکیم انہیں کلمات اللہ بھی کہتا ہے

عزیزانِ من! بات میں سے بات آئی۔ اذن کا لفظ قرآن حکیم نے بارش کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ بارش خدا کے علم سے ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں والے محکمہ موسمیات میں سے میں کسی پہ تنقید نہیں کر رہا' جن لوگوں کے ہاں یہ علم پرفیکشن (Perfection) پہ پہنچا ہوا ہے' وہ بہت پہلے بتا دیتے ہیں کہ فلاں وقت میں' فلاں جگہ' اتنی بارش ہوگی۔ یہ کیسے بتا دیتے ہیں؟ خدا نے یہ قانون مقرر کیا ہوا ہے' وہ قانون کے جو Causes ہوتے ہیں' جن سے بارش برستی ہے' وہ اپنی فراست سے اپنے' آلات سے' ان ذرائع سے' پہلے معلوم کر لیتے ہیں کہ ایسا ہوگا۔ اس کے بعد یَهْدِ قَلْبَهُ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (64:11) یہ اس خدا کے بنائے ہوئے قوانین ہیں کہ جس کو ہر شے کا علم ہوتا ہے۔ دیکھیے! کہاں علیم کا لفظ آیا ہے اور پھر یہ کہا کہ جس طرح سے یہ Cause & Effect کے قانون خارجی کائنات کے اندر عمل پیرا ہوتے ہیں' انسانی زندگی' انسانی دنیا' میں بھی یہی ہوتا ہے۔ وہاں بھی قانون مقرر ہے' دھاندلی نہیں ہے' ڈنڈا نہیں ہے' قانون ہے۔ جو نظام بھی انسانیت کے لیے ظلم اور جبر اور استیلاء کا موجب ہوگا' یہ Cause (سبب) ہوگیا' اس سے تباہی آئے گی۔ یہ اس کا Effect ہوگیا۔ یہ قانون مقرر ہے۔ قرآنِ کریم جو بار بار کہتا ہے کہ **لا یفلح الظّٰلمون** (12:23) ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی' جبر کامیاب نہیں ہوسکتا' ظلم پنپ نہیں سکتا' یہ چیزیں وہ بار بار کہتا چلا جا رہا ہے' وہ یہ نہیں ہے کہ وہ وہاں سے کوئی Announcement (اعلان) کر دیتا ہے کہ یہ ایسا نہیں ہوسکتا۔

## کلمات اللہ اور سنت اللہ کا بنیادی مفہوم ایک فرق کے ساتھ

عزیزانِ من! وہ بتاتا یہ ہے کہ ہمارا قانون یہ ہے کہ جہاں بھی جبر اور استحصال سے کام لیا جائے گا' اس کا نتیجہ تباہی ہوگا۔ یہ اٹل قانون ہے اسی طرح جس طرح سے پانی آگ پہ رکھو گے تو وہ کھولے گا' جہاں کہا ہے **لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ** (10:64) وہ کلمات صرف وہی نہیں ہیں جو انسانوں کی دنیا کے اندر کارفرما ہیں' وہ کائنات کے اندر جو کلمات اللہ کارفرما ہیں' قرآن کریم میں قوانین کے لیے یہ لفظ آیا ہے۔ یہ دو الفاظ ہیں' کلمات اللہ بھی ہے اور سنت اللہ بھی ہے۔ کلمات اللہ وہ کہے جب وہ Theoretical ہوتے ہیں' یہ قوانین نظری طور پہ ہوتے ہیں وہ قوانین الفاظ میں ہوتے ہیں' تو کلمات اللہ ہوتے ہیں۔ جب وہ عمل میں آجاتے ہیں تو انہیں سنت اللہ کہا جاتا ہے۔ خدا کی روش ایسی ہے' وہ ان قوانین کے مطابق یہ کرتا ہے۔ پہلے بتایا ہے کہ یہ نظری طور پہ قانون ہے کہ ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی اور جب ظالم کا انجام تباہی ہوتا ہے تو اسے کہیں گے کہ یہ سنت اللہ کے مطابق ہو رہا ہے۔ کیا الفاظ ہیں

قرآن حکیم کے صاحب! کہا ہے کہ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (64:11)اس واسطے اے جماعتِ مومنین! ان تباہیوں سے بچنا ہے اور وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ(64:12)اطاعت کرو تم اللہ کی اور اس کے رسول کی اور اگر تم اس سے اعراض برتو گے تو نہ خدا کا کچھ بگاڑو گے نہ اس رسول کو ہی تم کسی قسم کا نقصان پہنچا سکو گے۔ یہ انکا کاروبار نہیں ہے کہ اس سے انکا نفع بڑھ جائے گا' نقصان ہو جائے گا۔ یہ رسول کے ذمہ بالکل نہیں ہے۔ یہ ہر جگہ کہا ہے۔

## کسی قسم کی گرفت سے پہلے قانون کا پہنچانا ازبس ضروری ہے

ارشاد خداوندی ہے کہ ہم نے دونوں راستے غلط بھی اور صحیح بھی انسانوں کے سامنے واضح کر دیئے' انسان کو اختیار دیا کہ ان میں جو راستہ جی چاہے اختیار کرلے۔ رسول کے ذریعے سے یہ چیز واضح کی کہ یہ جو راستے وحی کے ذریعے طے کرنے ہیں' رسول کا فریضہ یہی ہے کہ وہ چوراہے پہ کھڑا ہو کر یہ سائن پوسٹ نصب کر دیتا ہے کہ یہ راستہ ادھر جاتا ہے اور یہ ادھر جاتا ہے۔ اسے اس بات کا' اس قانون کا پہنچا دینا کہتے ہیں۔ یاد رکھیے! خدا نے ہر جگہ یہ کہا ہے کہ کسی قانون کی خلاف ورزی سے گرفت نہیں کی جا سکتی تاوقتیکہ اس تک قانون کو پہلے پہنچا نہ دیا جائے۔ تو وہ کہتا یہ ہے کہ رسول کا فریضہ یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو زبردستی پکڑ کر سیدھے راستے پر چلاتا چلا جائے۔ یہاں زبردستی کا کام نہیں ہے۔ یہ وہاں آیا ہے کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (2:256) دین میں اکراہ (جبر) نہیں ہے۔ ہم نے راستے تو واضح کر دیئے۔ اب یہ دیکھیے کہ یہ راستوں کا واضح کرنا ہے۔ جبر سے' ظلم سے' ڈنڈے سے' جو چیز کی جائے گی' وہ راستے واضح نہیں کیے جاتے۔ وہاں تو اپنا حکم ہوتا ہے' اس کے مطابق دوسروں کو چلایا جاتا ہے۔ خدا یہ نہیں کرتا۔ وہ خود کہتا ہے کہ میں بھی زبردستی کسی کو راستے پہ نہیں چلاتا۔ رسول سے کہتا ہے کہ تیرا کام بھی یہ نہیں ہے کہ تُو لوگوں کو راستے کے اوپر زبردستی چلائے' میرا کام تھا کہ میں واضح طور پہ قوانین دیدوں کہ یہ راستہ تباہی کی طرف جائے گا' یہ راستہ سلامتی کی طرف جائے گا' تیرا کام یہ ہے کہ تُو وہاں ان کو بتادے کہ یہ دو راستے ہیں۔ تیرا کام یہ نہیں ہے کہ تُو زبردستی ان کو راستے کے اوپر چلائے اور یہ کہا کہ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (64:12) وہ ان قوانین کو واضح طور پر تم تک پہنچا دے اور یہ پھر ہم بار بار کہہ رہے ہیں کہ ایسا ہو کر رہے گا۔

## ہمارے ہاں کے قرآنی تراجم سے قرآنی حقائق اور اس کی واضح تعلیم کو الجھے رکھنے کا نتیجہ

کہا ہے کہ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (64:13) کائنات میں اقتدار خدا کے قوانین کے سوا کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ یہ صاحبِ مقتدر ہے کہ کوئی اور کی اتھارٹی نہیں ہے' کسی کی Authority اور Soveriegnty نہیں ہے اس لیے ہم جو اپنے قوانین کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ ہو کر رہے گا' کائنات میں کوئی طاقت ایسی نہیں جو ان کو الٹا سکے: اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (64:13) اور ہمارے ہاں پھر آپ دیکھیے کہ اس کے ترجمے میں ہے کہ خدا کے سوا کوئی نہیں جس کی پرستش کی جائے۔ وہی ٹکراؤ اور تصادم کا تصور نکل جائے' تو پھر ان

الفاظ کے معنی یہ ہو جاتے ہیں۔ اور آگے یہی ہے کہ اِلَّا هُوَ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (64:13) پھر مومن اللہ پر توکل کرتے ہیں اور توکل کے معنی آپ کو پتہ ہی ہے: توکل بر خدا۔ میں نے کہا ہے کہ ہمارے بزرگوں کے بڑے بڑے قصے آرہے ہیں' صاحب! وہ وقت یاد آجاتا ہے جہاں یہ قصے پڑھتے تھے جناب! کہ وہ چلے گئے' مولانا صاحب' (میں نام نہیں لیتا' تنقید ہو جائے گی) نے گھر میں کچھ نہ چھوڑا' چھ مہینے باہر رہے' بال بچے گھر میں تھے' گھر میں واپس آئے' بیوی سے پوچھا کہ کیسے گزارا کیا چھ مہینے؟ کہنے لگی کہ یہ بھینس تھی تو ہم اس کا دودھ دوہتے تھے' بچے چارہ وارا لے آتے تھے۔ دودھ بیچ کر میں گذارا کرتی رہی' بچوں کو پالتی رہی۔ کہنے لگے: اچھا! یہ ہوا تو میں بھی نہیں سمجھا کہ میری اس بزرگی میں کمی کیوں رہ گئی' پھر جب دوبارہ حکم ہوا جانے کا' تو سب سے پہلے اس بھینس کو ذبح کر دیا کہ یہ میرے توکل کے راستے میں حائل ہو رہی ہے۔ یہ ہوتا ہے توکل۔ اور وہاں یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جو فرمایا کہ اونٹ کہاں ہے؟ کہتے کہ باہر چھوڑ آیا ہوں۔ کہنے لگے: کیسے چھوڑا؟ کہنے لگے: وہاں چھوڑ دیا توکل بخدا۔ کہنے لگے: پہلے اس کو رسی سے باندھ کر آ' تو پھر توکل کر۔ یہ ہوتا ہے یہ یقین کہ رسی سے باندھا ہوا اونٹ نہیں بھاگے گا۔ یہ توکل ہے کہ خدا کا قانون اتنا محکم ہے کہ اس کے مطابق کچھ کیا جائے تو اس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ اسے توکل کہتے ہیں۔ جب حضرتِ عمرؓ نے کہا تھا کہ وہ رزق کی تلاش کرتے' انہوں نے کہا: ہاں توکل بخدا۔ کہنے لگے کہ پہلے دانہ بیج ڈالو زمین میں اور پھر توکل کرو خدا کے اوپر' اس کے قانون کی محکمیت پر۔ یہ ہے فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (64:13) اور اس کے راستے میں' حق کے راستے میں' اٹھ کے کھڑے ہونا بڑا صبر آزما راستہ ہے یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے۔ کہا کہ سب سے پہلے اس راستے میں تمہارے بیوی بچے حائل ہونگے اگر وہ تمہارے ہاں تمہارے مقصد سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس مقصد کے لیے یہ جو باطل کے خلاف نبرد آزمائی تھی اس مقصد کے لیے مالی ایثار اور قربانی کا جو پہلا قدم تھا اس میں یہ کہا تھا۔ کہ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ (2:219) پوچھتے ہیں کہ دوسروں کے لیے کتنا دیدیں قُلِ الْعَفْوَ (2:219) کہدو کہ جتنا تمہاری اپنی ضرورت سے زائد ہے' سب کا سب۔ اب اگر اس سے بیوی بچے ہم آہنگ نہیں تو وہ تو پہلے ہی دن چلا اٹھیں گے کہ کیا کر رہے ہو تم' کل کو ہمارے اوپر مصیبت پڑ گئی تو اس کے لیے کون بھگتے گا' تم تو چلے جاؤ گے یا تم تو چپکے سے بیٹھ جاؤ گے۔

## گھریلو زندگی کے لیے میاں بیوی کا باہمی طور پر ہم آہنگ ہونا ضروری ہی نہیں بلکہ لازم ہے

قرآن حکیم نے اسی لیے کہا تھا کہ بیوی کے انتخاب کے لیے پہلے یہ دیکھو کہ وہ تم سے Ideology میں متفق ہے یا نہیں۔ میں نے یہ جو ترجمہ کر دیا ہے' وہ ہے قرآن حکیم میں' مشرک وہ ہے جو تمہارے ساتھ آئیڈیالوجی میں اشتراک نہ کر رہا ہو۔ وہ ساتھ کچھ اور ملا رہا ہو تو آپ کو پتہ ہے مشرکہ سے شادی نہیں کر سکتے' نہ مشرف مرد سے' نہ مشرک عورت سے' تو وہ بنیادی نظریہ زندگی کا اختلاف

ہے میاں بیوی نظر یہ زندگی کے مطابق ہوں تو اللہ کہتا ہے کہ ہم تمہیں جنت کی طرف دعوت دیتے ہیں' وہ گھر جنت ہو جاتا ہے اور یہاں جہاں یہ اختلاف ہو' ہزار قسم کی آسائشیں بھی میسر وہاں ہوں' وہاں اس گھر میں وہ آگ ہوتی ہے' جسے خدا کہتا ہے کہ وہ آگ دلوں کو لپیٹ لیا کرتی ہے اس لیے وارن کیا کہ اگر گھر میں یہ کیفیت نہیں ہے' تو تمہارے اس راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ تمہارے بیوی بچے ہونگے۔ کہا کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَاَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ فَاحْذَرُوْھُمْ (64:14) سارے نہیں' تمام بیوی بچے نہیں' قرآن کریم نے تو دوسری جگہ کہا ہے کہ مومن کی دعا یہ ہے کہ یا اللہ! ان کو میری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا' بیوی کے لیے کہا ہے کہ تمہارے لیے وہ باعث سکون اور راحت قلب ہے مِنْ اَزْوَاجِکُمْ (64:14) ان میں سے جو ہم تمہارے ان مقاصدِ حیات کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہیں تو وہ تمہارے دشمن بن جائیں گے' تمہارے مقصد کے دشمن بن جائیں گے۔ کہا کہ اس کے لیے کرنے کی بات یہ ہے' یاد رکھو! وَاِنْ تَعْفُوْا (64:14) آگے بڑھ جاؤ ان تنگ ناؤں سے' یہ جو ان کی تنگ نظری ہے' جو کہتے ہیں کہ اپنے ہی بال بچوں کے لیے سب کچھ کرنا چاہیے' ہمیں کیا دوسروں کی پڑی ہوئی ہے' وہ اپنا آپ کریں' ہم میں سے ان کے لیے کوئی ذمہ دار ہے!

## لفظ ''تعفوا'' کا لغوی اور قرآنی مفہوم

تعفوا بڑا اہم ہے۔ یہاں ''تعفوا'' کے بنیادی معنی ہوتے ہیں: ''آگے بڑھ جاؤ' ان تنگ ناؤں سے گذر جاؤ'':

گزر جا بن کے سیلِ تُند رَو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جُوئے نغمہ خواں ہوجا

(اقبالؒ: بانگ درا: طلوع اسلام)

یہ ہے تعفوا: آگے بڑھ جاؤ ان سے' یہ بڑی تنگ نائیں ہیں تمہارے لیے یہ جو پیدا کر رہے ہیں وتصفحوا (164:14) ہمواریاں پیدا کردو۔ میں نے عرض کیا تھا کہ معاشرہ کیا ہوتا ہے؟ ہمارے ہاں ہمسائے کے گھر کے اندر جو دیوار کھڑی ہوتی ہے اس سے یہ دو گھر ہوتے ہیں۔ اگر یہ گھروں کی دیواریں درمیان میں نہ ہوں' تو معاشرہ ہوتا ہے۔ ہم صبح جو باہر نکل جاتے ہیں تو گھروں کے اندر یہی افراد ہوتے ہیں جن کا الگ الگ گھر ہوتا ہے۔ یہی ہوتے ہیں جن کو معاشرہ کہا جاتا ہے۔ کہا کہ ان تنگ ناؤں سے نکل جاؤ' آگے بڑھ جاؤ' یہ جو تمہارے راستے میں دیواریں کھڑی ہیں ان دیواروں کو ہٹا دو اور اس کے بعد تمہارا خاندان معاشرہ بن جائے گا' معاشرہ عالمگیر انسانیت بن جائے گی۔ کہا کہ وَتَغْفِرُوْا (64:14) اس طرح سے اپنوں کے لیے بھی دوسروں کے لیے بھی حفاظت کا سامان طلب کرو۔ کہا کہ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (64:14) خدا کا قانون حفاظت بھی دیتا ہے اور سامانِ نشوونما بھی دیتا ہے۔

## گھر میں بیوی بچوں کی موجودگی ایک ایسی کٹھالی ہے کہ جس میں انسان کو گزرنا ہوتا ہے

آگے کہا ہے کہ اِنَّمَآ اَمۡوَالُكُمۡ وَاَوۡلَادُكُمۡ فِتۡنَةٌ (64:15)۔ کیا لفظ ہے یہاں! کہا کہ یہ نہ سمجھ لینا کہ ہم نے جو کہا ہے کہ اولاد اور مال اور یہ بیوی بچے تمہارے لیے فتنہ ہیں' ان کو ذبح کر کے نکل جاؤ۔ کہنے لگے کہ نہیں' یہ وہ کٹھالی ہے جو سنار کے ہاں ہوتی ہے۔ وہ آگ کی کٹھالی ہوتی ہے اس میں وہ ایک چیز' جسے وہ سونا کہتے ہیں ڈالتے ہیں۔ وہ کٹھالی کیا کرتی ہے؟ وہ کٹھالی پگھلاتی ہے اور اس میں وہ الگ الگ کر دیتی ہے کہ اس میں خالص سونا اتنا ہے اور اس میں کھوٹ اتنا ہے اور یا یہ کہ پورے کا پورا خالص ہے' تو پھر یقین ہو جاتا ہے۔ کھوٹ ہی کھوٹ ہے تو وہ کٹھالی اسے بھسم کر دیتی ہے ایک آگ تو یہ ہے یہ بجائے خویش وہ بات نہیں کہ اس کو اٹھا کر باہر پھینک دے' اس سے تو ایک کام یہ دیکھنے کا لیا جائے گا کہ کھوٹ کتنا ہے اور خلوص کتنا ہے۔ پہلے یہ تمہارے خلوص ماپنے کا جو ذریعہ یا کٹھالی ہے' یہ بال بچے ہیں۔ واہ واہ واہ! اپنے آپ کو اس کٹھالی میں ڈال کر پھر دیکھ لو کہ تمہارے ہاں کتنا خلوص ہے اور کتنا کھوٹ ہے۔ یہ بتا دے گی۔

## نظامِ خداوندی کے قیام کے سلسلہ میں عملی جدوجہد کی تگ و تاز کی اہمیت

عزیزانِ من! آدمی وہیں آ کے مرتا ہے۔ باہر اگر اکیلا ہو' پھر تو وہ سب کچھ ہی جھیل لیتا ہے صاحب! جن کی خاطر بہت کچھ کرتا ہے۔ یہ بڑھاپے میں بھی سب کچھ میسر ہے اور اس کے باوجود الھکم التکاثر (102:1) لگا ہوا ہے وہ اس ریس کے اندر۔ او بابا! تمہیں اب ضرورت کیا؟ کہتا ہے کہ نہیں' یہ چھوٹے بچے ہیں' ان کے لیے بھی تو کچھ کر کے مجھے جانا چاہیے۔ اپنے لیے تو وہ دو روٹیاں ہی کافی تھیں' وہ چند سال باقی تھے' اور ان کے لیے تو پھر فتنہ لاانتہا ہوتا ہے۔ کہا کہ وَاللّٰهُ عِنۡدَهٗۤ اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ (64:15) لیکن اگر تم نظامِ خداوندی کو قائم کرو گے' تو وہاں سے بہت اجرِ عظیم ملے گا۔ کہا کہ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسۡتَطَعۡتُمۡ (64:16) قوانینِ خداوندی کی اپنی حد تک' استطاعت تک' پوری کی پوری جتنی استطاعت ہے' اس کے مطابق نگہداشت کرو۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کا طریقہ کیا ہے۔

## اجتماعی طور پر دین کے نظامِ زندگی کے برعکس مذہب کی سطح پر انفرادی تشفی کا نتیجہ

کہا کہ وَاسۡمَعُوۡا وَاَطِيۡعُوۡا (64:16) قرآنِ کریم میں جہاں بھی اس نظام کے متعلق کہا گیا ہے وہ سمعنا و اطعنا (2:285) یہ اطعنا مومنین کی صفت ہے۔ اطعنا تو یہ ہے کہ ہم اطاعت کرتے ہیں۔ اب آگے یہ سمعنا ساتھ کیوں ہے؟ سمعنا ساتھ کیوں آیا ہوا ہے کہ ہم سنتے ہیں؟ قرآن حکیم جو نظام قائم کرتا ہے اس میں صرف کتابوں کی رو سے ہی Obedience یا اطاعت نہیں ہوتی۔ اس میں ایک زندہ اتھارٹی کی ضرورت ہوتی ہے جو ہر موقعہ پر قرآن حمید سے استنباط کر کے دیکھتا ہے کہ اب کیا کرنا

چاہیے۔ وہ اناؤنس کرتا ہے‘ یہ سنتے ہیں‘ اس کے مطابق اطاعت کرتے ہیں یہ **سمعنا** (2:285) اس اطاعت کے لیے ضروری ہے جو نظام کی رو سے اطاعت کی جائے۔ مذہب میں یہ ضرورت نہیں ہوتی‘ وہاں تو کوئی بھی کتاب آپ اٹھا لیجیے ھدایہ اٹھا لیجیے‘ شامی اٹھا لیجیے اور اس کے اندر مسئلہ دیکھ لیجیے وہ مسئلے آپ نے دیکھ لیے‘ خود نہیں دیکھتے تو کسی مفتی صاحب سے پوچھ لیا‘ وہ سمجھنے کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ سمعنا کے معنی ہیں کہ کوئی ایسی اتھارٹی ہے کہ جو یہ کہے کہ یہ کرو‘ پھر تم کہو کہ ہم نے سن لیا اور ہم اطاعت کرتے ہیں۔ کہا کہ **وَاَنۡفِقُوۡا خَيۡرًا لِّاَنۡفُسِكُمۡ** (64:16) پہلی ہی شرط یہ ہے اپنے مال کو کھلا رکھو یہ بظاہر نظر آئے گا کہ دوسروں کو تم نے دیا ہے‘ یہ ان کی بہتری اور بھلائی کے لیے ہے۔ درحقیقت یہ خود تمہارے ہی بھلے کی بات ہے‘ جو تم کر رہے ہو۔ تو وہ جو اپنا نفع نقصان نہیں سوچتا‘ اسے تو پاگل کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس میں تمہارا فائدہ ہے اور فائدہ جو ہے تو وہ کیا ہے‘ کس کے لیے ہے۔

## قرآن حکیم کے اجتماعی نظام کی اہمیت اور اسے عملی طور پر اپنانے کے سلسلہ میں ترغیب کی ایک دل نشیں مثال

عزیزانِ من! یہ بات دوسری طرف چلی جائے گی۔ وہ ایک فقرہ یاد رکھیے! قرآن کریم کی رو سے‘ انسان کے جسم کی پرورش ہر اس چیز سے ہوتی ہے جو یہ لیتا ہے‘ اور اس نے کہا ہے کہ اس کی ذات کی پرورش ہر اس چیز سے ہوتی ہے جو یہ دیتا ہے۔ اس لیے قرآن کریم نے ایک دوسری جگہ کہا ہے **وَمَا تُقَدِّمُوۡا لِاَنۡفُسِكُمۡ مِّنۡ خَيۡرٍ تَجِدُوۡهُ عِنۡدَ اللّٰهِ** (2:110;73:20) اپنی ذات کے استحکام کے لیے‘ اس کے ثبات کے لیے ذریعہ یہ ہے کہ دوسروں کی مدد کرتے چلے جاؤ **خَيۡرًا لِّاَنۡفُسِكُمۡ** (64:16) آہاہاہا! اسی میں تمہاری بھلائی ہے اور آگے بتایا ہے کہ یہ کس قسم کا خیر ہے۔ کہا کہ **وَمَنۡ يُّوۡقَ شُحَّ نَفۡسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ** (64:16) اور پھر مثال بھی کیا دیتا ہے! قرآن حمید کھیتی کی مثال دیتا ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا‘ یہ **شُحَّ نَفۡسِهٖ** پہلے بھی آ چکا تھا❶۔ اس کی مثال یہ ہوتی ہے کہ پانی تھوڑا ہو‘ اور اب تو یوں سمجھ میں آ جاتا ہے کہ شہر میں جائیے‘ گرمی کا موسم ہو‘ نلکے کے نیچے آپ دیکھیے کہ لائن لگی ہوئی ہوتی ہے‘ اس میں سے قطرہ قطرہ ٹپک رہا ہوتا ہے‘ اور اس کے پیچھے جو لڑائیاں ہوتی ہیں‘ لڑائی کیا ہوتی ہیں؟ وہ جو دوسرے نمبر پہ کھڑا ہوتا ہے‘ وہ اگلے نمبر کو دھکا دے کر ہٹا دیتا ہے‘ او بس وی کر ہن ساری بھر کے لے چلیاں ہیگا۔ پیچھے دیکھ دا ایں لین کنی لگی ہوئی ہیگی؟ وہ اگلا اونہوں کیندا ہیگا: اوئے! تیرے پیو دا پانی ہیگا (ابے! بس کرو۔ اب تم سارے برتن بھر کر لے چکے ہو۔ پیچھے نہیں دیکھتے ہو کہ ایک پوری قطار لگی ہوئی ہے؟ وہ اگلا اسے کہتا ہے کہ کیا یہ تمہارے باپ کا پانی ہے جو یوں کہہ رہے ہو)۔ یہ جو چیز ہے کہ پچھلا اگلے کو دھکا دے کر اپنی بالٹی آگے کر دیتا ہے‘ اس کو **شح** کہتے ہیں۔ آہاہاہا! کہتا ہے کہ جو اس جذبے سے محفوظ رہا‘ بچ

---

❶ یہ **شُحَّ نَفۡسِهٖ** (59:9) میں آیا ہے۔ اس کے لیے دیکھیے سورۃ الحشر کا درس۔

گیا' وہ ہے شُحَّ نَفْسِہٖ (64:16) اور مثال آگے جاتی ہے اور یہ جو چیز ہے ہم شہر والے تو سمجھ نہیں سکتے' گاؤں والے سے پوچھیے یہ جو کھیتوں کو سیراب ہونے کے لیے پانی جاتا ہے نہری کھیتیاں ہوتی ہیں' یہ جو کھال ہوتی ہے' کھال سے آگے پانی جاتا ہے۔ رات کو معلوم ہے' روز ہوتا ہے کہ پانی کے جھگڑے کے اوپر فساد ہو گیا' اور کتنے قتل ہو گئے۔ تو ہوتا کیا ہے؟ پہلے جس کا جو کھیت آتا ہے وہ ذرا طاقتور ہے تو وہ ''اونوں کیندے نیں بھن لیا پانی۔ (وہ طاقتور کہتا ہے کہ کھال کو کٹ لگا کر پانی اپنی طرف کر لو)۔ وہ کھال کو کھود کے اپنے کھیت کی طرف لے جاتا ہے تو ٹھیک ہے اس کے کھیت کو پانی مل جاتا ہے' وہ جو آخر میں Tail پہ ہوتے ہیں' ان بیچاروں تک پانی نہیں پہنچتا ان کی کھیتیاں جل جاتی ہیں۔

## انسانی زندگی کی نشو ونما کے لیے جذبہ محرکہ کو ہمیشہ مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے

عزیزانِ من! سنیے' اور جھوم جائیے قرآن حمید کی مثال ہے۔ کہتا ہے کہ تمہارے قاعدے کے مطابق کھیتی اس کی پنپتی ہے جو دوسرے کا پانی کاٹ کر اپنے کھیت میں دیدیتا ہے۔ خدا کے قانون کے مطابق کھیتی اس کی پنپتی ہے جو پانی میں دوسرے کو ترجیح دیتا ہے اور آپ پیچھے رہ جاتا ہے۔ جس کا اس قانون پہ ایمان ہے' کہا کہ اس کی کھیتی کے ہم ذمہ دار ہیں' ہم اس کی کھیتی کو پروان چڑھائیں گے۔

## قرض کا لغوی مفہوم اور اس کے عوض حاصل نعمائے خداوندی کی شکل وصورت

کہا کہ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْہُ لَکُمْ وَیَغْفِرْلَکُمْ (64:16-17) یہ جو دے رہے ہو' یہ نہیں ہے کہ تم کسی کو عام خیرات دے رہے ہو' عطیے دے رہے ہو' قرض دے رہو' آپ کو یاد ہے کہ قرض کے بھی معنی عربی زبان میں کیا ہوتے ہیں؟ صاحب! کیا عجیب چیز ہے؟ یہ جگالی کرنے والے جانور کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ منہ مارتے چلے جاتے ہیں' کھاتے چلے جاتے ہیں' کھاتے چلے جاتے ہیں' سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کھاتے چلے جاتے ہیں' ایسے ہی پیٹ میں چلا جاتا ہے' کیا بنے گے؟ وہ پہلے پیٹ کو بھر لیتے ہیں اور پھر وہ جو کھایا ہوا ہوتا ہے وہ ان کے کسی کام نہیں آتا' پھر اسٹور کے اندر وہ جمع ہو جاتا ہے اور اس کے بعد وہ آرام سے بیٹھ جاتے ہیں اور غڑم سے نکالتے ہیں' پھر وہ بیٹھ کر اُسے چباتے ہیں وہ جو چبایا ہوا ہوتا ہے' وہ جزو بدن بنتا ہے۔ قرآن حکیم یہ لفظ قرض ہے جو اس کے لیے عرب استعمال کرتے تھے' کیا قوم تھی! کہا کہ یہ جو تم دیتے ہو' یہ تو بغیر چبائے ہوئے چارہ ہوتا ہے جو اس طرح جمار ہتا ہے۔ خدا جو تمہیں دیتا ہے وہ اس شکل میں دیتا ہے جو وہ جگالی کرنے کے بعد جزو بدن بن جاتا ہے۔ کہا ہے کہ وَیَغْفِرْلَکُمْ (64:17) یُضٰعِفْہُ (64:17) بہت زیادہ تعداد میں ملتا ہے' پھر تمہاری ہر قسم کی مصیبت سے حفاظت کرتا ہے اس طرح وَاللّٰہُ شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ (64:17) وہ بڑا شکور و حلیم ہے' وہ ہر ایک کی محنت کا اسے معاوضہ دیتا ہے' حلیم ہے

جلدی سے پھڑ پھڑاتا نہیں ہے۔

## خدا کی ذات تو وہ ہستی ہے کہ جو اپنے ہر حکم کے ساتھ اس کی حکمت بھی ظاہر کرتی ہے

بڑا حلم ہے' اس حفاظت میں وہ بڑا بردبار واقع ہوا ہے۔ تم ہو جو کہتے ہو کہ ''اوایہد ے اچ تے'' (اس میں تو) بڑا المبا وقت لگ جائے گا: کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک۔ اس سے کہا کہ نہیں' اتنا حوصلہ پیدا کرو' وقت تو لگے گا' یونہی نہ بھڑ بھڑا جاؤ' ہوگا ایسے ہی جیسے ہم کہتے ہیں پھر آگے ہے کہ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَةِ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (64:18) تم صرف پیش پا افتادہ چیزوں کو جانتے ہو۔ وہ ان کو بھی جانتا ہے اور انہیں بھی جانتا ہے جو اس کے بعد اس کا انجام ہونے والا ہے۔ یہ وہ کہہ رہا ہے جو العزیز اور الحکیم ہے۔ یہ وہی پھر خدا کی صفات آیت کے آخر میں آئیں۔ عزیز ہے' غلبہ ہے' قوت ہے' اقتدار ہے' لیکن دھاندلی اور ڈنڈے کا نہیں' حکمت اور Wisdom پر مبنی ہے' اس کا اعتبار ہے جو صاحبِ اقتدار ہے' وہ ''کیوں'' کا جواب دیتا ہے۔ وہ خدا کی صفات کا حامل ہوتا ہے جو عزیز اور حکیم ہوتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ یہ ہمارا حکم ہے' یہ ماننا ہے' وہ فرعونیت ہوتی ہے۔ جو خدا ہے وہ عزیز کے ساتھ حکیم بھی ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ التغابن آج اختتام پر پہنچی' آئندہ درس میں ہم سورۃ الطلاق لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀......❀......❀

# سورة الطلاق

# پہلا باب: **سورۃ الطلاق** (آیات 1 تا 2)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آج ستمبر 1983ء کی دو تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز 65 ویں سورۃ الطلاق سے ہو رہا ہے:(65:1)۔

## قرآن حکیم کے نزدیک عائلی زندگی میں طلاق کے مسئلے کی اہمیت

سورۃ کے نام سے ہی یہ ظاہر ہے کہ اس میں طلاق کے متعلق کچھ احکامات دیئے گئے ہیں۔ اس سورۃ میں دو ہی رکوع ہیں۔ پہلا پورا رکوع اسی پر مشتمل ہے جنہیں عائلی قوانین یا Family Laws کہا جاتا ہے؛ جن کا تعلق نکاح طلاق وغیرہ سے ہے۔ یہ قرآنِ کریم کی مختلف آیات میں بکھرے ہوئے ہیں؛ زیادہ سورۃ البقرۃ میں ہیں؛ پھر سورۃ النساء میں ہیں۔ انفرادی طور پہ دو ایک اور جگہ بھی ہیں اور اس سورۃ میں؛ پورے ایک رکوع میں طلاق اور عدت سے متعلق ہیں۔ یہ درس سامنے آئے گا تو یہ میرے لیے ممکن نہیں ہوگا کہ میں ان پورے قوانین کو آپ کے سامنے پیش کرسکوں۔ یہ میری کتاب ''قرآنی قوانین'' مختصر سی ہے؛ اس میں بھی سارے قوانین آئے ہوئے ہیں اور ''مطالب الفرقان'' جو میری تفسیر ہے؛ اس میں بھی یہ تمام احکام آئے ہوئے ہیں اور عائلی قوانین بھی اس کے اندر درج ہیں تو اگر انہیں قانون کی حیثیت سے آپ نے دیکھنا ہو تو وہ ان کتابوں میں آپ کو مل جائیں گے۔ یہ یک جا ہوں گے؛ مرتب شکل کے اندر ہوں گے؛ لیکن یہاں جو چیز آئے گی وہ وہی ہوگی جو مسلک کی صورت میں سامنے جو آیات آئیں گی میں وہی پیش کرسکوں گا۔ میں نے اس لیے یہ عرض کیا ہے کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ یہ قوانین کہاں سے ملیں گے۔ ان قوانین میں آج کل

سب سے زیادہ جو چیز پریشانی کا باعث' مصیبت کا باعث' مشکل کا باعث' ہورہی ہے وہ طلاق کے متعلق ہے اور میرے ہاں جو استفسارات آتے ہیں یا جو احباب خود پوچھنے کے لیے آتے ہیں' وہ بڑے پریشان' بہت زیادہ مضطرب ہوتے ہیں اور وہ مسئلہ سارا طلاق کا ہوتا ہے۔ یہ جذباتی قوم ہے ہماری' غصے میں آکر طلاق کہہ دی۔ ہر ایک کا یہی قصہ ہوتا ہے: وہ آتے ہیں کہ جی! غصے میں آکر ہم نے تین دفعہ طلاق طلاق طلاق کہہ دی' تھوڑے سے وقت کے بعد غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ اب اس کے بعد سوچ رہے ہیں کہ کیا کیا جائے۔

## رائج الوقت عائلی قوانین کا ذکر اور مذہبی پیشوائیت کے فتوے

پہلے میں یہ عرض کر دوں کہ طلاق طلاق طلاق کہہ دینے سے طلاق نہیں پڑ گئی' یہ قرآن حکیم کے مطابق نہیں ہے اور قرآن حکیم کو تو بہرحال' آج کل معاف رکھیے گا' پوچھتا کون ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ جو ملک میں رائج الوقت قانون ہے' وہ جنہیں میں نے عائلی قوانین کہا ہے جو صدر محمد ایوب مرحوم کے زمانے میں نافذ ہوئے' اور وہ آج تک نافذ العمل ہیں' ان میں بھی طلاق کا جو طریقہ بتایا گیا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ کسی نے اپنے گھر میں بیٹھ کر طلاق طلاق طلاق تین دفعہ کہہ دیا تو اب وہ بیوی اس پر حرام ہو گئی' دوبارہ نکاح آپس میں کر نہیں سکتے' اس کے لیے صورت ایک ہی ہے جو بتائی جاتی ہے کہ وہ عورت جس بیچاری نے اس غصے کا بھی مظاہرہ نہیں کیا' کچھ نہیں کیا' یہ سارا کچھ طیش میں' غصے میں' حماقت میں' میاں صاحب نے تین دفعہ فرما دیا اور سزا بھگتنی پڑ رہی ہے' اس مظلوم اور محکوم کو اور وہ سزا اتنی ہے کہ اس سے بہتر یہ ہے' کہ مر جائے۔ وہ عورتیں کہتی ہیں کہ ہمیں پھانسی دیدی جائے' ہمیں یہ سزا گوارا نہیں ہے۔ آپ کے ہاں یہ شریعت بتائی جاتی ہے کہ وہ کسی غیر مرد سے شادی کرے۔ میری بیٹیاں اور بہنیں ہیں' الفاظ مشکل ہیں' کیا استعمال کروں۔ ان کے ہاں یہ ہے کہ صرف نکاح ہی نہیں' بلکہ ایک رات کی ہم بستری بھی کریں' دوسری صبح کو یہ شخص اسے طلاق دے اور پھر اس کے بعد وہ عدت گزارے اور پھر وہ پہلے خاوند سے دوبارہ شادی کر سکتی ہے۔ ایک باعصمت خاتون کے لیے یہ کوئی کم سزا نہیں ہوتی۔ اسے یہ حلالہ کہتے ہیں۔ ایسے Cases بھی ہمارے ہاں آئے ہوئے ہیں کہ کسی نے یہ مرتے بھرتے یہ کر بھی لیا ہے اور وہ عام طور پہ یہ خود یہی مولوی صاحبان ہی اپنے آپ کو پیش کر دیتے ہیں' اور یہ نکاح ہو گیا باقاعدہ سب کچھ' اب دوسری صبح وہ طلاق نہیں دیتے۔ انہیں کوئی مجبور ہی نہیں کر سکتا۔

## مروجہ قانون کے تحت طلاق کا حل

اب میں انہیں بتاتا ہوں' وہ آتے ہیں کہ صاحب! قرآن حمید کی رو سے بتایئے کہ کیا کیا جائے۔ تو میں بتاتا ہوں کہ بھئی! قرآن حکیم کا تو قانون رائج ہے نہیں' جو مروجہ قانون ہے' وہ رائج الوقت حکومت کا قانون موجود ہے۔ اس میں یہ چیز لکھی ہوئی ہے کہ طلاق کا طریقہ کیا ہے' اور قرآن مجید کے طریقے سے ملتا جلتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر طلاق کا ارادہ کرنا ہو تو حکومت کی طرف سے

ایک مصالحتی کونسل بنی ہوتی ہے۔ وہ جو اپنے علاقے کا غالباً کونسلر ہوتا ہے وہ اس چیئرمین ہوتا ہے۔ بہرحال وہ کونسل ہے۔ اسے درخواست دینی پڑتی ہے: مرد کا ارادہ ہو تو اسے بھی' اور عورت کا ارادہ ہو تو اسے بھی درخواست دینی پڑتی ہے' پھر وہ کونسل نوے دن کے اندر اندر ان میں مصالحت کرانے کی کوشش کرتی ہے' اگر مصالحت نہ ہو سکے تو پھر وہ فیصلہ یہ دیتی ہے کہ مصالحت نہیں ہو سکی اس لیے ان میں اب علیحدگی ہو جانی چاہیے۔ یہ اسٹیج ہے جس پہ طلاق ہوتی ہے' اور یہ وہ طلاق بھی نہیں ہے کہ اس کے بعد اس مطلقہ کو کسی دوسرے مرد کے ساتھ شادی کرنا پڑے اور پھر اس کے بعد وہ طلاق دے اور یہ واپس آئے۔ اس میں یہ بھی نہیں ہوتا۔ وہ عدت کے دوران واپس آ جائیں' ایک دوسرے کے ساتھ رجوع کر لیں' عدت کے بعد وہ شادی کر لیں پھر بالکل ٹھیک ہوتا ہے۔ یہ طریقہ رائج الوقت قانون میں بھی موجود ہے۔

## موجودہ شریعت کے قانون کی بالادستی آخر کیوں؟

اب دیکھیے ہمارے ہاں کے رائج الوقت قانون کے مطابق دیکھیے' یہ طلاق کہنے والے کہتے ہیں کہ صاحب! یہ طلاق تو نہیں ہوئی۔ حکومت کا قانون بھی یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں جو شریعت کا قانون ہے وہ مسلمان کے لیے بالا ہے حکومت کے اس قانون سے۔ قانون بالا کیسے ہوتا ہے' اس کو تو چھوڑیئے کہ عدالت کیا کہے گی؟ اس کے لیے سزا دے گی۔ معاشرے کے اندر جب یہ مولوی صاحب یا مسجد کا ملاں کہہ دے کہ اب ان میں طلاق پڑ گئی' یہ بیوی اس پہ حرام ہوگئی' معاشرے میں تو ہر شخص یہ کہے گا۔ اگر وہ پھر میاں بیوی ہیں' وہ کہے گا کہ یہ حرام کاری کر رہے ہیں' اس کی اولاد کو ولدالزنا کہتے ہیں' پھر اولاد حرام کی قرار دیتے ہیں' تو معاشرے میں انہوں نے رہنا ہے' یہ کیسے برداشت کیا جائے گا' ہر شخص انگلی اٹھا کر کہے گا کہ بیوی کو طلاق پڑ گئی ہوئی ہے اور یہ پھر آپس میں اسی طرح سے زناشوئی کے تعلقات قائم کیے ہوئے ہیں۔ معاف رکھیے گا وہ تو اس کو زنا کہتے ہیں اور اگلی بات یہ ہے کہ ان کی اس اولاد کو جو اس کے بعد ہے وہ اسے جائز اولاد نہیں قرار دیتے۔

## عائلی زندگی کے سلسلہ میں دورِ ملوکیت میں بنائے ہوئے قانون کی اذیتناکی

عزیزانِ من! اس کا کیا علاج؟ قرآن کریم کے تو خلاف تھا ہی' یہ رائج الوقت قانون کے بھی خلاف ہے' لیکن معاشرہ میں جو کیفیت پیدا ہوتی ہے' اس کا کیا علاج ہے' وہ معاشرہ تو اسی پہ مصر ہوتا ہے کہ وہی صاحب! طلاق تین دفعہ کہہ دی گئی' اب اس کے بعد اس سے جھوٹ بلوایا جاتا ہے کہ کہو' تین دفعہ نہیں۔ یہ بھی مذاق ملاحظہ فرماؤ کہ وہ جو تین دفعہ آیا ہے۔ ایک دو' ایک دو' پتہ ہے یہ کہ کہاں ہوا کرتا ہے؟ وہ پھر یہ ہوتا ہے کہ تین کہا تھا۔ تو پھر اسے کہتے ہیں کہ کہہ دو' نہیں' میں نے دو دفعہ کہا تھا' جان چھوٹ گئی۔ بولو جھوٹ! وہ گواہ لے آتے ہیں کہ نہیں صاحب! تین دفعہ کہا۔ یعنی آپ سوچیے کہ کس مصیبت میں معاشرہ پھنسا ہوا ہے' یہ کیا ہے' کسی

نے اس پہ کبھی غور نہیں کیا' یہ سارے قوانین' جن کا میں اب ذکر کر رہا ہوں' ابھی طلاق کا ہی ہے' یہ حلالے کا بھی ہے' نکاح کے بھی قوانین ہیں' وہ بچوں کی شادی' چھ چھ مہینے کی بچیوں کی شادی کے یہ جو سارے قوانین تھے' یہ آپ کے ہاں کے ملوکیت کے زمانے میں بنے تھے۔ وہ مملکتیں ختم ہوئیں۔

## اگر فقہی قوانین کی عمر اسلام کے نام پر طویل ہوتی تو پھر ان کے اثرات بھی بڑے دور رس ہوتے

وہ سلاطین باقی نہ رہے جنہوں نے یہ قوانین بنائے تھے۔ وہ سب کچھ چلا گیا۔ یہ ان کے بنائے ہوئے جو قوانین انہوں نے اسلامی قرار دے دیئے' یہ قیامت تک کے لیے چل رہے ہیں یعنی وہ بلا' وہ مصیبت' وہ عذاب' ہمارے سر پر مسلط ہے۔ جب بھی کوئی ملوکیت اس قسم کے قوانین خود بنائے' وہ ملوکیت چلی جاتی ہے مگر یہ سب کچھ اس کے بعد چھوڑ جاتی ہے۔ اب ان قوانین کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ یہ جو آپ کے ہاں اب کہا جاتا ہے کہ نئے شرعی قوانین رائج ہوں گے' یہ نئے رائج ہونے والی بات نہیں ہے' یہی ان کو فقہ کے قوانین کہتے ہیں' یہی جو فقہی قوانین ہیں' ان کو اب نئے سرے سے اسلامی قوانین کا نام دیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد اب ان کو زندگی کا ایک نیا پٹہ مل گیا' جسے آپ کہیے اب اس کے بعد یہ پتہ نہیں کہ یہ کب تک چلیں گے۔ قوموں پہ جب عذاب آتا ہے تو اس کی کوئی مدت کم نہیں ہوتی' اس کے ایک ایک دن' صدیوں میں گنے جاتے ہیں۔ ہزار سال سے تو ہم یہ عذاب بھگتتے چلے آ رہے تھے' ابھی پتہ نہیں کہ ہمیں یہ کب تک بھگتنا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ وہ جو قرآن حمید کی بات ہے وہ تو یہ ہے نہیں کہ تین دفعہ طلاق طلاق طلاق کہو تو یہ ہو گیا۔ رائج الوقت قانون یہ کہہ رہا ہے کہ طلاق نہیں ہوا لیکن اس کے باوجود ہو وہ رہا ہے جو ہزار برس پہلے کی ملوکیت نے طے کیا تھا۔ ملوکیت اگر اسلام کا نام ساتھ نہ لے تو اس کے احکام وقتی ہوتے ہیں' وہ ختم ہوئی تو احکام بھی گئے لیکن جب وہ اپنے کسی فیصلے کو اسلام کہہ کر نافذ کر دے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ وہ بھی دھڑا دھڑ ایک دو تین چار تک شادیاں ہیں' ایک دو تین کہا تو طلاق ہو گئی۔ چھ چھ مہینے کی بچیوں کے بیاہ شادیاں ہو رہی ہیں اور عورت کو کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

## گھر کی ڈکٹیٹر شپ جس نے مرد کو ایک مالک کا درجہ دے رکھا ہے

عزیزانِ من! یہ سارے قوانین جو اس دور کے رائج شدہ ہیں۔ ان میں ہر قانون نظر آتا ہے کہ اس کے اندر ڈکٹیٹر شپ ہے۔ پہلی ڈکٹیٹر شپ تو گھر میں عورت کے خلاف ہوتی ہے۔ یہ ان قوانین کا اثر ہے جن کو شرعی کہا جاتا ہے کہ آج بھی گھروں کے اندر خاوند کی حیثیت بیوی اور بچوں کے مقابلے میں ڈکٹیٹر کی ہوتی ہے یعنی اس کے لیے ہمارے ہاں مالک کا لفظ ہے۔ معلوم نہیں کہ یوپی میں اردو والوں کے ہاں ہے یا نہیں' ہمارے ہاں تو خاوند کو مالک کہا جاتا ہے اور جیسا میں نے کئی دفعہ کہا ہے ''میاں'' یا اللہ میاں ہوتا ہے یا خاوند میاں ہوتا ہے اور اسے مجازی خدا کہا جاتا ہے۔ پھر یہ حدیثیں لائی جاتی ہیں کہ حضورﷺ نے فرمایا کہ خدا کے سوا کسی کو

سجدے کی اجازت ہوتی تو میں عورتوں کو حکم دیتا کہ اپنے خاوندوں کو سجدہ کیا کریں۔ یہ ہے ملوکیت! خدا کو تو ان سجدوں میں ٹرخا ہی دیتے تھے یا سجدہ حاکم وقت کو دیا جاتا تھا' وہاں سلاطین کو کیا جاتا تھا یا گھر میں یہ جو عورت ہے' وہ خاوند کو کرتی ہے۔ دیکھا! ہر حکم میں ایک ڈکٹیٹرشپ پائی جاتی ہے' ملوکیت چھلک رہی ہے۔ ملوکیت تو چلی گئی لیکن اس کے بعد یہ جو اس کی پرچھائیاں ہیں جو اس کے سائے ہیں' وہ اتنے لمبے ہیں کہ وہ قیامت تک امت پر مسلط رہیں گے اور اس کا ہمارے ذہن میں تو یہ ہے ہم ان کو دوش دے رہے ہیں یہ امت کا' ہمارا یہ جرم ہے جس کی وجہ سے ہم یہ سزا بھگت رہے ہیں۔ یہ جرأت پیدا نہیں ہوئی کہ ہزار برس میں یہ کہا جائے کہ یہ اسلام نہیں ہے۔ ہزار برس سے یہی کچھ ہو رہا ہے اور قوم اسے مانتی چلی آ رہی ہے اور جب مانتی چلی آ رہی ہے' تو مار کھاتی چلی جا رہی ہے' سیدھی بات ہے اور یہ کسی فرد کی بات نہیں' فرد تو بیچارہ معاشرے کے اندر پس جاتا ہے۔ معاشرے میں جب یہ عام ہو جائے کہ یہ میاں بیوی اب حرام کاری کرتے ہیں' ان کے بچے بھی حرام کے ہیں' تو وہ مرد اس معاشرے کے اندر کیسے جی سکتا ہے۔ یہ ہے ان احکام کی کیفیت جو شریعت کے یا شرعی احکام' اسلامی عائلی قوانین کے بتائے جا رہے ہیں۔

## قانون کی حکمرانی کے بغیر معاشرتی بیچارگی کی حالت زار پر علامہ پرویزؒ کی ذہنی اور دلی کیفیت

میں نے عرض کیا ہے کہ وہ عائلی قوانین (Family Laws) موجود ہیں۔ اس تین دفعہ طلاق طلاق طلاق نکتے کے متعلق جو کہا جائے گا وہ نافذ العمل ہے مگر وہ کاغذ کے اندر ہے۔ معاشرے کے اندر نافذ العمل نہیں ہے۔ وہ کہیں کوئی ایسا ہے جو جرأت کر کے کونسل کی طرف چلا جائے' ورنہ جونہی تین دفعہ آپ نے کہا' وہ معاشرے کے اندر طلاق پڑ گئی۔ اس کی اپیل نہیں' وکیل نہیں' کچھ نہیں۔ تو میں یہ عرض کر دوں کہ اگر کسی میں' بہرحال یہ جرأت ہو' میرے یہاں تو جو آتے ہیں' وہ بھی جو بیان کرتے ہیں' خاص طور پہ خواتین آتی ہیں' میری بیٹیاں اور بہنیں' ہوتا یہ ہے کہ پھر وہ بھی رو رہی ہوتی ہیں اور میں بھی رو رہا ہوتا ہوں۔ کیا حال بتاؤں! نکل جاؤ یہاں سے' چلے جاؤ یہاں سے۔ جن حالات میں حضرت مریمؑ اور ان کے خاوند معاشرے کے چھوڑنے کے لیے مجبور ہو گئے تھے' چنانچہ تیس سال تک مصر میں جا کر زندگی گزاری' انہی کے ہاتھوں یہی جو مذہبی پیشوائیت تھی' جنہوں نے کہا تھا کہ نکاح ناجائز ہے۔ یہ ہوتا ہے معاشرے کا اثر' عزیزانِ من! یہ تھا کہ کچھ امید تھی یہ جو اقبالؒ نے پاکستان کا تصور دیا تھا وہ تو یہ تھا کہ یہ خطہ زمین اس لیے ہم مانگ رہے ہیں کہ ایسی حکومت قائم کر دیں جس میں ہمارے ملوکیت کے زمانے کا اسلام کے اوپر جو خول چڑھا ہوا ہے اس کو ہم اتار کر صحیح اسلام کو نافذ کر سکیں۔ یہ مقصد ہے۔ یہی ہے وہ خول جو چڑھا ہوا ہے۔ یہ ملوکیت کے زمانے کے جتنے قوانین ہیں' وہ Public Laws ہوں یا وہ آپ کے ہاں پرسنل لاز ہوں' پبلک تو بہرحال حکومت آ کر بھڑا دیتی ہے کیونکہ وہ Recognise نہیں کرتی۔

## رائج الوقت قانون کے برعکس شریعت حقہ کی سوچ کی پیدا کردہ معاشرتی مشکلات کا ذکر

یہ جو معاشرتی قوانین ہوتے ہیں ان کی جڑیں بڑی گہری ہوتی ہیں' یہ جڑیں معاشرے کے اندر ہوتی ہیں۔ کسی سے یہ کہا جائے کہ یہ میاں بیوی نہیں رہے ہوئے ہیں' تو ہزار قرآن حمید کہتا رہے' لاکھ رائج الوقت قانون کہتا رہے' معاشرہ جو ہے وہ ان کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ وہ بیچارے جی نہیں سکتے تو صورت یہ ہے کہ اگر کسی نے کسی سے کچھ بتانا بھی ہو کہ آپ یہ چھوڑیئے کہ قرآن حکیم کا قانون تو نافذ العمل ہی نہیں ہے یہاں جو مروجہ عائلی قوانین کی رو سے حکومت کا قانون بھی جو رائج ہے' یہ بات انہیں بتایا کیجیے کہ اس کی رو سے یہ تین دفعہ اس طرح طلاق طلاق کہنے سے کوئی طلاق نہیں پڑتی۔ اس کا ایک طریقہ ہے' حکومت نے مقرر کیا ہوا ہے۔ اگر واقعی بالا رادہ سچ مچ طلاق تم لوگوں نے دینی ہے تو اس طریقے کو اختیار کرو اور اگر یونہی غصے سے ایسا نکل گیا ہے تو یہ تو پھر وہ غصے کو ٹھوہ کر دیجیے' معاملہ ختم ہوتا ہے۔ یہ کوئی بات ہی نہیں ہے۔ تو میں پھر عرض کرونگا کہ ٹھیک ہے آپ یہ ان کو مشورہ تو دیدیں گے' معاشرے کے اندر جب انگلیاں اٹھیں گی تو اسے کون برداشت کر سکے گا۔ اگر ان میں ہمت ہے تو یہ کریں' معاشرہ نہیں کرنے دیتا' معاشرہ خود کچھ بھی ویسے نہ کہے یہ جو حضرات بیٹھے ہوئے ہیں ان قوانین کے محافظ اجارہ دار' یہ ہیں' جو معاشرے کے اندر اس قسم کے شوشے چھوڑتے ہیں کہ نہیں شریعتِ حقہ کی رو سے یہ طلاق پڑ گئی ہے' اب یہ میاں بیوی نہیں رہ سکتے۔ جب شریعتِ حقہ کی رو سے یہ ہو جاتا ہے تو پھر کیا کہا جا سکتا ہے۔

## طلاق کے مسئلے کے سلسلہ میں قرآن حکیم کا نبی اکرم ﷺ سے خطاب

عزیزانِ من! قرآن کریم کی سورۃ الطلاق کی پہلی آیت ہے کہ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ (65:1)۔ آیت کے پہلے دو لفظوں میں سارا صحیفہ بتا دیا۔ کیا اعجاز ہے اس کا صاحب! ایڈریس' خطاب کیا جاتا ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ (65:1) اے نبی ﷺ! اور آگے ہے طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ (65:1)۔ یہ جمع کا صیغہ ہے' نبی تو واحد کا صیغہ ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اے نبی! جب تُو طلاق دے اپنی بیوی کو یا اپنی عورت کو' تو یہ کر' طریقہ یہ تھا۔ یہ کیا ہے کہ ایڈریس نبی کو کیا جاتا ہے اور اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ جب تم عورتوں کو طلاق دو' تو پھر یہ چیز کرو۔ یہ ''تم'' کون ہیں؟ نبی ﷺ نے تو اپنی کسی بیوی کو طلاق نہیں دی۔ صیغہ جمع کا ''تم'' آرہا ہے تو یہیں تو پتہ چل گیا ہے کہ ''تم نے جو طلاق دینی ہے' اس کا فیصلہ اے نبی ﷺ! تم نے کرنا ہے' انہوں نے جو طلاق بھیجی ہے اس کا فیصلہ نبی نے کرنا ہے۔ تو میں نے کہا تھا کہ جو رائج الوقت قوانین ہیں' وہ بہر حال پھر بھی قرآن حمید سے قریب ہیں کیونکہ اس میں یہ ہے کہ آپس میں میاں بیوی گھر میں بیٹھ کر یہ نہیں بات کر سکتے کہ اس نے طلاق طلاق کہا اور طلاق ہوگئی' Separation اس کا فیصلہ ہو گیا۔

## 61-62 میں عائلی قوانین کے متعلق مذہبی پیشوائیت کی مخالفت پر علامہ پرویزؒ کے تاثرات

قرآن کریم میں اس کے متعلق سورۃ النسآء (4) کی آیت 35 ❶ میں طریقہ بتایا ہے کہ اگر تم میں سے کسی معاملے میں میاں بیوی میں اختلاف ہو جائے' کشیدگی ہو جائے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک ثالث میاں کے خاندان یعنی خاوند کے خاندان سے ایک ثالث بیوی کے خاندان سے' حکومت کا نمائندہ مقرر کرے۔ یہ ثالثوں کا بورڈ بیٹھے' وہ ان میں مصالحت کی کوشش کرے۔ اگر یہ کوشش ناکام رہ جائے اور وہ اس نتیجہ پہ پہنچیں کہ یہ نباہ نہیں ہو سکتا' قرآن حمید کے الفاظ میں یہ خدا کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکتے' کیا بات ہے! تو پھر وہ فیصلہ دیدیں کہ ہاں بھئی! اب یہ چیز طلاق ہوگئی۔ یہ طریقہ ہے قرآن حمید کا اور ملتا جلتا ہے یہ طریقہ ہے جو رائج الوقت قانون ہے۔ Family Law قریباً 1961,1962ء میں طے ہوئے تھے۔ اس وقت سے یہ ہمارے مولوی صاحبان ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ روز یہ ہوتا ہے کہ انہیں منسوخ کرو' انہیں منسوخ کرو کیونکہ وہ جو عورتوں پہ' بیویوں پہ ڈکٹیٹر شپ قائم ہے' اس سے کچھ تھوڑی سی ان میں ڈھیل آ جاتی ہے اور وہ جو پنجہ ہوتا ہے وہ تو ڈھیلا نہیں پڑتا۔ یہ عورتیں بیچاری لاکھ چیختی رہیں۔ اقبالؒ نے تو فرنگ کے لیے کہا تھا لیکن یہ تو ہر باز یا جسے شکرا کہتے ہیں' اس میں پھنستی ہیں:

ترا ناداں امیدِ غم گساریہا ز افرنگ است؟ ❷

اے ناداں! کیا افرنگ سے تجھے امیدِ غمگساری ہے؟

دلِ شاہیں نسوزد بہر آں مرغے کہ در چنگ است ❸

باز کے پنجے میں چڑیا آ جائے تو لاکھ چیں چیں کرے' وہ اُسے نہیں چھوڑتا۔ یہ باز سے اس چڑیا کی یہ امید رکھنی کہ میں چیں چیں کروں گی تو مجھے چھوڑ دے گا' وہ کہتا ہے کہ حماقت ہے' کوئی باز اس چڑیا کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا جو اس کے پنجے میں آ جاتی ہے۔ تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے' کسی پنجرے یا کسی دائرے کے اندر باز اُس چڑیا کو نہیں چھوڑتا۔ بہرحال قرآن کریم نے طلاق کا یہ طریق بتایا اور رائج الوقت قانون یہ ہے' لیکن باز کا پنجہ ہے کہ وہ چڑیا کو نہیں چھوڑتا۔ کہا ہے کہ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ (65:1)۔ عزیزانِ من! وہ اسی لیے ایک ایک آیت کے بعد کہتا ہے کہ تدبر کرو' غور کرو' فکر کرو کہ میں نے کیا کہا ہے۔ کہا کہ یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا

---

❶ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ''اگر کسی خاص میاں بیوی میں ناچاقی کا خدشہ ہو' تو ایک ثالث خاوند کے خاندان سے اور ایک بیوی کے خاندان سے' مقرر کرو۔ اس طرح' اگر میاں بیوی باہمی مصالحت کا ارادہ کر لیں (یا یہ دونوں ثالث اُن میں اصلاح کی نیت سے موافقت پیدا کرنے کی کوشش کریں) تو قانونِ خداوندی' اُن میں موافقت پیدا کر دے۔ اس لیے کہ اس کا قانون علم و آگہی پر مبنی ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔198)۔

❷ اے ناداں! تجھے اپنے غموں کے مداوا کی امید یورپ والوں سے ہے؟

❸ شاہیں کا دل نہیں جلتا اس پرندے کے لیے جو اس کے پنجے میں ہو۔

طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ (65:1) اگر میاں بیوی کا طلاق کا یہ مسئلہ آپس میں گھر میں طے کرنے کا ہوتا تو یہ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ (65:1) والی بات یہاں سے شروع نہ ہوتی کہ اے جماعتِ مومنین! اے مسلمانو! اب جب تم اپنے ہاں طلاق دو تو پھر بات آگے کرو تو یہ یوں ہونی چاہیے تھی۔ یہ یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ (65:1) بیچ میں کیسے آ گیا۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ طلاق کے یہ احکام نبی پہ تو آئے ہی نہیں تھے، حضورﷺ نے تو کسی کو طلاق ہی نہیں دی تھی۔ یہاں ایڈرس کیا جاتا ہے۔ یہ نبی اس ثالث بورڈ کا سربراہ ہے جو قرآن حمید نے تدبیر کیا ہے۔ نبی سے مراد یہی حکومت کا سربراہ، نمائندہ، صاحبِ اقتدار، صاحبِ اختیار ہے، اب حضورﷺ کے بعد اسلامی مملکت میں جو بھی صاحبِ اختیار ہو گا وہ یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ (65:1) کی جگہ آ جائے گا کہ جب یہ معاشرے میں طلاق کا مسئلہ ہو اور وہ طلاق والی بات اس طرح طے ہو جائے جیسی کہ ہم نے سورۃ النسآء کی آیت 35 میں بتائی ہے اور یوں ان دو لفظوں کی تفسیر ہو جائے گی کہ وہاں کہہ کر نبی طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ[1] (65:1) کیوں کہا گیا۔ تو تفسیر یوں بیان کی جائے گی کہ اے سربراہِ مملکت! اے صاحبِ اقتدار! اے اولی الامر! جب طلاق کا معاملہ ہو تو اسے طریقے سے طے کرو جو ہم نے سورۃ النسآء میں بیان کر دیا ہے۔ جب یہ طے پا جائے کہ یہ نباہ نہیں ہو سکتا اور ان کو الگ کرنا مقصود ہے تو اس وقت پھر وہ اسے طلاق کہیں گے۔ طلاق کے معنی یہ نہیں ہوتے ہیں کہ طلاق کہہ دیا، وہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ کہہ دیا تو نہیں، کوئی بات نہیں، تین دفعہ طلاق کہا تو ہو گئی۔

## لفظ طلقہ کا مفہوم اور پھر عدت کی اہمیت اور اس کی لِم، اس کی حکمت

طلقہ کے معنی ہی ہیں "عقدِ نکاح سے آزاد ہو جانا"۔ اس لفظ کے معنی ہی "آزاد ہو جانا ہے"، طلاق کا لفظ اس وقت بولا جائے گا جب یہ نکاح سے آزاد ہو جائیں گے، باقی نہیں رہیں گے، جب یہ صورت ہو جائے۔ یہ نہیں ہے کہ جب تم گھر میں طلاق طلاق طلاق کہہ دو، دو دفعہ کہہ دو تو اور بات، تین دفعہ کہو تو اور بات۔ اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ طلاقہ کا، طلاق کا جہاں لفظ آ جائے گا اس کے معنی ہوں گے کہ جب وہ سلسلہ ٹوٹ گیا، نکاح ختم ہو گیا، جب یہ ہو جائے تو کیا کرو؟ کہا کہ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ[2] (65:1) تو پھر عدلت کے لیے سوال ہے۔ قرآن حمید نے عدت بڑی ضروری قرار دی ہے۔ عجیب احکام ہیں، عزیزانِ من! یعنی اتنا بڑا Procedure (طریقہ کار) جو بتایا گیا ہے وہ ثالثی بورڈ یا Reconciliation میں اس کے بعد بھی جب یہ ہو جائے تو کہا یہ ہے کہ بھئی! پھر بھی تھوڑا بہت انتظار کر لو، ہو سکتا ہے کہ اس Separation سے، اس علیحدگی سے، جو یوں واقع ہوئی

---

[1] جب تم طلاق کے مقدمات کا فیصلہ کرو (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 1326)۔

[2] تو لوگوں سے کہہ دو کہ اس کے بعد، عدت کا سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسے ضرور پورا کرنا چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تم اس کا حساب رکھو (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 1326)۔

ہے' تمہارے فیصلے میں کچھ فرق پڑ جائے' تمہارے جذبات اور احساسات میں کوئی تبدیلی آ جائے یعنی ایک Waiting Period (انتظار کا وقت) رکھ دیا کہ اس میں شاید یہ جو چیز ہے' کچھ اور حالات ہو جائیں یا تم ہی اپنے فیصلے بدلو تو قانون نے گنجائش رکھ دی۔ کتنی بڑی چیز ہے! طلاق طلاق طلاق کہنے سے کچھ نہیں ہو رہا' وہ طریق وہ ہے اتنا لمبا چوڑا۔ اس کے باوجود جب وہ فیصلہ کر لیں گے کہ علیحدگی کی بات ہی ہے تو اس پہ بھی کہا کہ ذرا انتظار کر لو۔ اسے کہتے ہیں عدت' جس دوران وہ عورت کسی اور جگہ شادی نہیں کر سکتی۔ یہ جو میاں بیوی تھے' ان کے لیے گنجائش باقی رہتی ہے کہ اگر وہ باہمی مرضی سے اپنے فیصلے سے رجوع کرنا چاہیں بہر حال ہوتا یہ ہے۔

## نکاح کا معاملہ ہو یا طلاق کا' ہر دو معاملے میں' ہر دو کی مرضی کا شاملِ حال ہونا ضروری ہے

یاد رکھیے! نکاح بھی عورت کی مرضی سے ہوتا ہے' یہ طلاق کا معاملہ بھی اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ One way Traffic (یک طرفہ آمدورفت) نہیں ہے کہ نکاح تو اس کی مرضی سے ہو اور جو چھٹکارا طلاق ہے' یہ اس سے پوچھے بغیر' جو جی میں آئے کر لے۔ تو Wating Period رکھ دیا کہ ممکن ہے' اس دوران جذبات کچھ اور ٹھنڈے پڑ جائیں' تم خالی الذہن ہو کر جذبات سے بلند ہو کر پھر سوچ لو' سمجھ لو' تو پھر تم عدت کے دوران واپس آ سکتے ہو' کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ پہلی جو عدت بتائی گئی ہے اس کے بعد بھی اگر آنا ہو تو پھر رجوع کر سکتے ہیں مگر اس کے بعد نکاح کرنا ہو گا لیکن عدت کے دوران تم ویسے ہی رجوع کر سکتے ہو اگر دونوں میاں بیوی پہ راضی اس ہوئے' متفق ہوئے۔ یہ ہے عدت۔ آگے کہا ہے کہ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ (65:1) خدا کے قوانین کی نگداشت کرو' وہی ہے تمہارا نشوونما دینے والا۔ کہا کہ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ❶ (65:1) اسے اسی گھر میں رہنے دو' زبردستی نکالو نہیں وہاں سے بجز اس کے کہ کوئی کھلی ہوئی بے حیائی کی بات ہو جائے' وہ اور بات ہے' وہ تو ایک جرم ہی اور ہو گیا ورنہ محض اس کے مطلقہ ہونے کی جہت سے اس کو گھر سے نہ نکال۔ آگے ہے وہ بھی نہ گھر سے نکلیں۔ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ (65:1) یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں۔ یاد رکھیے! قرآن مجید میں چند ہی قانون ہیں' جن کی جزئیات بھی خود مقرر کی ہیں' ورنہ اس نے یہ حدیں ہی مقرر کی ہیں' یہ Limitations ہی ہیں' جو Prescribe (مقرر) کیے ہیں۔ وہ کہتا یہ ہے کہ ان کو نہیں توڑ سکتے' ان کے اندر رہتے ہوئے تم اپنے اپنے حالات کے مطابق امت کے باہمی مشورے سے جزئی By Laws (جزئی قوانین) خود مرتب کر سکتے ہو' اسی لیے وہ ان چیزوں کو حدود اللہ کہتا ہے۔ آگے کہا کہ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ

---

❶ اس دوران میں' ان مطلقہ بیویوں کو ان کے گھروں سے مت نکالو (65:6)۔ (عدت کے دوران یہ گھر ہنوز ان کے اپنے گھر ہیں۔ اس لیے نہ تم انہیں ان گھروں سے نکالو) نہ وہ خود ہی (بلا عذر) وہاں سے نکلیں۔ ہاں' اگر وہ کھلی ہوئی بے حیائی کی مرتکب ہوں (تو پھر انہیں گھر سے نکالا جا سکتا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1326)۔

فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ (65:1) ان حدود سے جو سرکشی برتتا ہے' تجاوز کرتا ہے' وہ ظلم کرتا ہے۔ کس پہ ظلم کرتا ہے؟ کہا ہے کہ اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے۔ کیا بات ہے' صاحب! یہ تجاوز' یہ حدود اللہ کی خلاف ورزیاں جو ہیں' یہ کئی دفعہ ہے کہ خدا کا تو اس سے کچھ نہیں بگڑتا اور تم ہو کہ اپنے آپ پہ ظلم کرتے ہو۔

## خدا تعالیٰ کی رحمانیت انسانی معاشرے کے الجھے ہوئے گیسو سنوارنے کے لیے تو آخری حد تک شامل حال رہتی ہے

عزیزانِ من! کیا انداز قرآن حکیم کے بتانے کا ہے۔ جو یہ عدت تھی' اس کی مصلحت پھر آ گئی۔ کہا کہ لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰهَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا❶ (65:1) تمہیں کیا معلوم ہے کہ اس کے بعد' یہ قانوناً ٹھیک ہے کہ فیصلہ ہو گیا کہ نہیں نبھ سکتا' طلاق ہو سکے گی' ممکن ہے اس دوران میں کوئی اور Un-expected (غیر متوقع) حالات ہو جائیں' تمہارے جذبات و احساسات میں کوئی تبدیلی آ جائے' تم اپنا فیصلہ بدلنا چاہو۔ یہ کہہ کے گنجائش رکھ دی کہ تمہیں کیا معلوم ہے اور یہ کسی کو معلوم نہیں ہوتا' خود اس میاں بیوی کو بھی معلوم نہیں ہو سکتا کہ کل کو کیا حالات پیدا ہو جائیں۔ کیا بات ہے! کہا کہ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ (65:2) یہ Waiting Period (وقتِ انتظار) جو عدت کا ہے' جب یہ ختم ہونے کو آئے تو اس وقت پھر یہ آخری فیصلہ کرو کہ الگ ہو جانا ہے یا ساتھ رہنا ہے۔ دونوں کے متعلق بِمَعْرُوْفٍ اس طریق کے مطابق جو قرآن حکیم Recognize کرتا ہے کہ ٹھیک ہے اور اس نے بتایا۔ کیا طریقہ ہے؟ طریقہ یہ ہے کہ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ (65:2) ایسے میں دو گواہ رکھ لیا کرو' جن کے سامنے یہ بات کرو۔ یہ چپکے سے کرنے کی بات نہیں ہے۔ معاشرے میں یہ بات مشہور ہونی چاہیے کہ تم نے ساتھ رہنے کا یا الگ ہونے کا باہمی فیصلہ کیا ہے۔ اس کے لیے شہادت کی ضرورت ہے۔

## قرآن حکیم کے نزدیک میاں بیوی کی علیحدگی کا فیصلہ انفرادی سوچ پر موقوف نہیں

دیکھیے! یہ وہ دو افراد کا' میاں بیوی کا' نجی معاملہ نہیں قرار دے رہا۔ اس کا اثر معاشرے پہ بہت بڑا پڑتا ہے۔ ظلم کی حد سے ایک عورت کو طلاق ملی ہوئی' اس پہ اور اس کے بچوں پر جو بیتتی ہے' اس کے خاندان پہ جو بیتتی ہے' دونوں خاندانوں میں اس قدر انشقاق اور مخالفت واقع ہوتی ہے' پھر معاشرے میں جس قدر اختلافات پیدا ہوتے ہیں' یہ ایک فیصلہ نجی نہیں ہے۔ اسی لیے

---

❶ انہیں (عدت کے دوران) انہی گھروں میں رکھنا' اور ان کا وہیں رہنا اس لیے قرین مصلحت ہے کہ اگرچہ وہ' زمانہ عدت میں' میاں بیوی نہیں رہتے لیکن ہو سکتا ہے کہ اس مفارقت کے عملی تجربہ سے ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ان میں باہمی موافقت کی شکل نکل آئے (بشرطیکہ یہ طلاق ایسی ہو جس میں پھر موافقت کی گنجائش ہوتی ہے)۔ پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 27-1326)۔

قرآن حکیم نے کہا ہے کہ یہ بات نہیں ہے کہ تم دونوں کا آپس کا فیصلہ کرلیا' معاملہ ختم ہوگیا۔ معاشرے میں یہ گواہ یہ مشہور کریں کہ ہمارے سامنے انہوں نے الگ ہونے کا یا ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا تھا' کہا کہ **ذٰلِكُمْ يُوعَظُ بِهِ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ** ❶ (65:2) یہ کتنا اہم ہے! کہا کہ اس سے اس بات کا ٹیسٹ ہوگا کہ تم خدا اور آخرت پہ ایمان رکھتے ہو یا نہیں' دیکھا! وہ عائلی قوانین کو کتنی اہمیت دے رہا ہے۔ گھر کا پرسکون ہونا' معاشرے کے پرسکون ہونے کی اوّلیں منزل تو یہ ہے۔ گھروں میں یہ حدث اور سکونت ہو' اطمینان ہو' میاں بیوی کی زندگی' قرآن حمید کہتا ہے' کہ جنت کی ہو' ایک ایک گھر کی ہوگی تو معاشرے کی خود ہی جنت کی ہوگی۔ معاشرہ اور ہوتا کیا ہے؟ معاشرہ تو عشرہ ہے' دس گھر اکٹھے ہوں معاشرہ بن جاتا ہے۔ جس قسم کے وہ دس گھر ہوں گے اسی قسم کا معاشرہ ہوگا۔ یہ جو ہمارے ہاں باہر نکل کے بھی یہ دس گھر والے جہنم میں رہتے ہیں' یہ اس لیے ہے کہ اندر آتے ہیں تو یہ بھی جہنم ہوتا ہے۔ کہا کہ **وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ** (2:167) اس جہنم سے یہ نکل ہی نہیں سکتے خواہ گھر سے باہر چلے جائیں' خواہ گھر کے اندر آ جائیں صاحب! قرآن کریم نے خود اس کو جہنم کہا ہے۔ بہرحال کہا ہے کہ **وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا** ❷ (65:2) ہوسکتا ہے کہ ان احکام کی پابندی سے تمہیں کوئی مشکل پیش آئے لیکن اسے ہمیشہ پیشِ نظر رکھو کہ قانون کی پابندی کی وجہ سے اگر کوئی مشکل پیش آتی ہو' تو نظامِ خداوندی اس مشکل کا کوئی نہ کوئی حل تجویز کردے گا۔ آگے کہا ہے کہ **وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا** (65:3) اس میں معاشی مشکلات بھی پیش آسکتی ہیں' لیکن نظامِ خداوندی اس کا انتظام بھی ایسے طریق سے کردے گا جس کی تمہیں توقع تک نہ ہو۔ یاد رکھو! جو شخص بھی نظامِ خداوندی پر بھروسا کرتا ہے' تو وہ نظام اس کے اس بھروسے کو پوری طرح نباہتا ہے۔ اسے یونہی لٹکتا نہیں چھوڑ دیتا' بلکہ آخر تک اس کا ساتھ دیتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ نے ہر بات کے لیے پیمانے اور اندازے' قوانین و ضوابط مقرر کر رکھے ہیں اور جو کام قاعدوں اور ضابطوں کے مطابق ہو' ان میں نہ عدم یقین ہوسکتا ہے' نہ دشواری۔ طلاق کا فیصلہ دینے والی عدالت کے لیے ضروری ہے کہ وہ تمام متعلقہ امور کو پیش نظر رکھے اور اس فیصلے سے پیدا ہونے والی دشواریوں اور پیچیدگیوں کا مناسب حل تجویز کردے۔

عزیزانِ من! جیسا کہ (2:228) میں بتایا جا چکا ہے' عدت کی مدت حالات میں' تین حیض کا زمانہ ہے۔ ممکن ہے حیض آنا بند ہو چکا ہو تو کہا کہ **وَالّٰٓـئِيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓـئِيْ لَمْ يَحِضْنَ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا** (65:4) جن عورتوں کو حیض آنا بند ہو چکا ہو

---

❶ یہ تاکید اس شخص سے کی جارہی ہے جو قوانینِ خداوندی اور مستقبل کی زندگی پر ایمان رکھتا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1327)۔

❷ بقیہ درس میں آواز نہیں ہے۔ اسے آیت سات تک مفہوم القرآن سے مکمل کیا گیا ہے۔

اوراس وجہ سے یہ دشواری لاحق ہو کہ ان کی عدت کا شمار کس طرح کیا جائے' تو ان کے لیے تین حیض کے بجائے' تین مہینے' عدت کے شمار کرو۔ یہی عدت اُن عورتوں کے ضمن میں شمار کرو جنہیں' کسی عارضہ کی وجہ سے' حیض نہ آ سکا ہو۔ اور حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل تک ہے۔ اب ممکن ہے کہ بعض طبائع کو عدت کی یہ مدت لمبی معلوم ہو کیونکہ اس مدت میں انہیں مطلقہ بیوی کے اخراجات کا متحمل ہونا پڑے گا۔ لیکن اس میں خائف ہونے کی کوئی بات نہیں۔ جو شخص بھی قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرے گا' نظامِ خداوندی اس کے لیے آسانیاں پیدا کر دے گا۔ متعلقہ عدالت کو ایسی شکلیں بھی سامنے رکھی چاہئیں اوران کا حل تجویز کرنا چاہیے۔

عزیزانِ من! آ گے کہا ہے کہ ذٰلِکَ اَمۡرُ اللّٰہِ اَنۡزَلَہٗۤ اِلَیۡکُمۡ وَمَنۡ یَّتَّقِ اللّٰہَ یُکَفِّرۡ عَنۡہُ سَیِّاٰتِہٖ وَیُعۡظِمۡ لَہٗۤ اَجۡرًا (65:5) یہ اللہ کا حکم ہے جو اس نے تمہاری طرف بھیجا ہے اور جو شخص قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرتا ہے تو نظامِ خداوندی اس کی وہ دشواریاں دور کر دیتا ہے جو اس قسم کی عائلی ناہمواریوں سے پیدا ہوتی ہیں اور اس کے اس عمل کا (کہ اس نے قانونِ خداوندی کی اطاعت میں کچھ دقتیں اٹھائیں) بہت بڑا اجر دیتا ہے۔ اس لیے کہا کہ اَسۡکِنُوۡہُنَّ مِنۡ حَیۡثُ سَکَنۡتُمۡ مِّنۡ وُّجۡدِکُمۡ وَلَا تُضَآرُّوۡہُنَّ لِتُضَیِّقُوۡا عَلَیۡہِنَّ وَاِنۡ کُنَّ اُولَاتِ حَمۡلٍ فَاَنۡفِقُوۡا عَلَیۡہِنَّ حَتّٰی یَضَعۡنَ حَمۡلَہُنَّ فَاِنۡ اَرۡضَعۡنَ لَکُمۡ فَاٰتُوۡہُنَّ اُجُوۡرَہُنَّ وَاۡتَمِرُوۡا بَیۡنَکُمۡ بِمَعۡرُوۡفٍ وَاِنۡ تَعَاسَرۡتُمۡ فَسَتُرۡضِعُ لَہٗۤ اُخۡرٰی (65:6) تم ان مطلقہ عورتوں کو وہیں رکھو جہاں تم رہتے ہو' اوراسی طرح رکھو جس طرح تم خود رہتے ہو اور انہیں تنگ کرنے کی غرض سے کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچاؤ۔ اور اگر وہ حمل سے ہیں تو وضع حمل تو تمہیں ان کا خرچ بہرحال برداشت کرتا ہے' اگر وضع حمل کے بعد' وہ تمہاری خاطر بچے کو دودھ پلائیں یعنی تم کوئی اور انتظام نہ کرو اور باہمی رضامندی سے یہ طے پا جائے کہ وہی بچے کو دودھ پلائیں تو انہیں ان کی دودھ پلائی کی اجرت دو۔ ان امور کی تفاصیل کو باہمی مشورے سے' قاعدے' قانون کے مطابق' طے کر لیا کرو۔ اور اگر تم میں سے کسی پر یہ انتظام گراں گزرے تو تم کسی دوسری عورت کا انتظام کر لو جو بچے کو دودھ پلائے۔ آ گے کہا کہ لِیُنۡفِقۡ ذُوۡ سَعَۃٍ مِّنۡ سَعَتِہٖ وَمَنۡ قُدِرَ عَلَیۡہِ رِزۡقُہٗ فَلۡیُنۡفِقۡ مِمَّاۤ اٰتٰىہُ اللّٰہُ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا مَاۤ اٰتٰىہَا سَیَجۡعَلُ اللّٰہُ بَعۡدَ عُسۡرٍ یُّسۡرًا (65:7) مطلقہ کا خرچ' یا دودھ پلانے کی اجرت کا معاملہ طے کرنے کے سلسلہ میں اس بات کو مدّنظر رکھو کہ صاحبِ وسعت اپنی وسعت کے مطابق خرچ دے' اور جس کا ہاتھ تنگ ہو' تو جو کچھ اللہ نے اسے دے رکھا ہے وہ اس کے مطابق دے۔ یاد رکھو! خدا کا قانون کسی پر اس کی حیثیت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ اگر اس فالتو خرچ سے اس پر کچھ تنگی آ جائے تو قانونِ خداوندی کی رو سے اس کی اس تنگی کو آسانی سے بدلا جا سکتا ہے۔ عدالتِ مجاز اس بات کا بھی خیال رکھے۔

عزیزانِ من! سورۃ الطلاق کی ہم سات ہی آیات لے سکے۔ آٹھویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

# دوسرا باب: **سورة الطلاق** ( آیات 8 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج ستمبر 1983ء کی 9 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الطلاق کی آیت 8 سے ہو رہا ہے: (65:8)۔

## قوموں کے تمدن پر عائلی زندگی کے نشیب وفراز کا اثر

سابقہ درس میں آپ نے دیکھا کہ اس سورۃ کے پہلے رکوع میں طلاق کے متعلق قرآنی احکامات کی وضاحت کی گئی تھی۔ اب اس کے بعد ہی اسی سلسلے میں اگلی آیت آ رہی ہے۔ کہا ہے کہ **وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا o فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا o اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا** (65:8-10)۔ کتنی ہی بستیاں، کتنی ہی قومیں، ایسی تھیں کہ جن سے ہم نے مواخذہ کیا، اس لیے کہ انہوں نے ہمارے قوانین سے اعراض برتا تھا اور اس کی جگہ اپنے قوانین کا اتباع کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ تباہ ہوئیں، اور وہ سخت عذاب کے شکنجے میں جکڑی گئیں۔ پہلی چیز تو یہ ربط کی دیکھیے۔ ہماری مذہبی پیشوائیت جو معاذ اللہ قرآن حکیم کے متعلق یہ حقائق رکھتی ہے کہ اس میں کوئی

ربط نہیں ہے' وہ یونہی ہے' ادھر کا فقرہ اُدھر رکھ دیا' ادھر کا ادھر رکھ دیا۔ بہر حال جو اسے خدا کا کلام سمجھتا ہے وہ تو یہ گستاخی نہیں کر سکتا۔ آنکھیں بند ہوں تو یہ چیز کہ سورج کہیں روشنی نہیں دیتا تو ٹھیک ہے' بند آنکھوں کو تو یہی نظر آئے گا۔ اس میں بڑا گہرا ربط ہے اور وہ یہ ہے کہ ہماری جو عائلی زندگی ہے' گھر کی زندگی ہے' اس کا قوموں کے تمدن کے ساتھ' قوموں کے انجام کے ساتھ' قوموں کی خوشحالی اور خوشگواری کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ گھروں کی زندگی اگر پرسکون اور اطمینان بخش اور جنت فروش ہے تو وہ جنت ہو جاتی ہے۔

## گھروں کے اندر کے انتظامی امور ہی پورے معاشرے کے لیے جنت اور جہنم کا باعث بنتے ہیں

قرآن کریم کہتا ہے کہ اگر ہمارے قوانین کے مطابق گھر کی زندگی ہو تو وہ جنت ہو جاتی ہے۔ گھروں کی زندگی' اگر جنت کی زندگی ہو تو معاشرہ خود بخود جنتی ہو جاتا ہے' قوم جنتی ہو جاتی ہے۔ اور قوم کے جہنمی ہونے کا ثبوت مانگنا ہو تو گھروں کے اندر جھانک کر دیکھنا چاہیے۔ گھروں کے اندر اور گھروں کے باہر فاصلہ کیا ہوتا ہے؟ یہی گھر کے اندر والے جب باہر نکلتے ہیں' صبح کام کاج کے لیے باہر نکل جاتے ہیں' تو معاشرہ ہو جاتے ہیں' گھروں میں آ جاتے ہیں تو وہ عائلی زندگی ہو جاتی ہے۔ تو یہ تو ہونے سے رہا کہ گھر کے اندر آئیں تو جہنم ہو اور باہر جائیں تو وہ جنت ہو۔ جہنم کا تو کوئی گوشہ بھی جنت نہیں ہوتا صاحب! وہ تو ساری کی ساری جہنم ہوتی ہے صاحب! تو عائلی قوانین کا ذکر آ رہا تھا اور آگے یہ ہے کہ جن قوموں نے ہمارے قوانین سے اعراض برتا تو ان کے لیے یہ دو باتیں بڑی ضروری نوٹ کرنے کی ہیں۔ انہوں نے امر ربی سے اعراض برتا اور امر ھا کا Follow (اتباع) کیا۔ کیا بات ہے صاحب! جو گھر کی عائلی زندگی ہے۔ اس کے لیے کچھ تو قانون وضوابط وغیرہ ہوتے ہی ہیں۔ اب قرآن حکیم نے ان دونوں کے اندر ایک دوسرے کا تضاد دکھایا ہے۔ ایک خدا کے بتائے ہوئے' متعین فرمودہ قوانین اور پابندیاں ہیں۔ دوسرے ایک انسانوں کے خودساختہ قوانین ہیں تو خدا نے کہا کہ اگر ہمارے قوانین کا اتباع کرتے تو وہ بستیاں جنت کی بستیاں بن جاتیں' خوشحال زندگی بسر کرتیں۔ انہوں نے انہیں چھوڑا' اپنے قوانین کے تابع گھر کی زندگی بسر کرنی شروع کی تو وہ تباہی اور بربادی کا شکار ہو گئیں۔

## عائلی زندگی کی چیخ وپکار کے سلسلہ میں خودساختہ فقہی قوانین کا کردار اور علامہ پرویزؒ کے تاثرات اور پھر علاج

آپ نے کبھی غور فرمایا کہ ہم جس عذابِ جہنم میں گرفتار ہیں' ان میں اس بات کا حصہ کس قدر گہرا ہے کہ ہماری گھروں کی زندگی قوانینِ خداوندی کے بجائے انسانوں کے خودساختہ قوانین کے تابع بسر ہو رہی ہے۔ میری کیفیت' اسے خوش بختی کہیے یا کوئی بدنصیبی' ایک ڈاکٹر کی سی ہے کہ اس کے پاس ہمیشہ مریض آتے ہیں' جو تندرست ہوتا ہے۔ وہ اپنے گھر میں بیٹھا ہوتا ہے۔ میرے ہاں احباب بالخصوص میری بیٹیاں اکثر آتی رہتی ہیں اور میرا اندازہ اب یہ ہے' اگر سروے کیا جائے' تو ہمارے ہاں کا شاید ہی سو میں

سے کوئی ایک گھر ایسا ہو جو پر سکون بستا ہو۔ خود اگر پر سکون بھی بستا ہے تو اگر اس بیچارے نے کہیں بیٹی بیاہ لی ہے تو بس اس کے بعد پھر جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس میں یہ ہوتا ہے کہ بیٹیوں کی زندگی کے متعلق' اپنی زندگی کے متعلق وہ جسے کہتے ہیں کہ رونا رویا جاتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ آپ کے ہاں فقہ کے جو قوانین رائج ہیں' ان کے تحت اصلاح کی کوئی صورت نہیں ہوتی اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ میری بیٹی بھی روتی ہے' ساتھ میں بھی روتا ہوں اور پھر ہم یہ تحقیق کرنے کے لیے کمیشن بٹھاتے ہیں' انکوائری کمیٹیاں قائم کرتے ہیں کہ یہ جو معاشرہ ہے' وہ پر سکون کیوں نہیں ہے۔ تحقیق یہاں سے شروع کرو کہ ہمارے ہاں گھر پر سکون کیوں نہیں ہیں اور اس کی وجہ وہ قوانین ہیں جو انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں' جن کو خدا کا قانون کہہ کر نافذ کیا جاتا ہے۔ اگر نافذ نہ بھی کیا جائے' تو یہ عجیب چیز ہے کہ شخصی حکومتیں اس قسم کے قوانین اپنے ہاں بنالیتی ہیں۔ مملکتیں ختم ہوئیں' حکومتیں بھی مٹ گئیں' صاحبِ اقتدار باقی نہ رہے' ان کے بنائے ہوئے جو قوانین ہیں وہ امت کے سر پہ مسلط چلے آرہے ہیں اور عقیدہ یہ پیدا کیا گیا ہے کہ یہ ناقابلِ تغیر ہیں' قیامت تک کے لیے یہ رائج رہیں گے۔

## مذہبی پیشوائیت کی گرفت کسی کو چوں بھی نہیں کرنے دیتی

عزیزانِ من! اب جب معاشرے میں یہ چیز عام ہو جائے تو اس کے بعد بڑی مشکل ہوتی ہے کون جرأت کرسکتا ہے کہ ان میں کوئی تبدیلی پیدا کرے' ان کی جگہ کوئی اور قوانین لے آئے یا قوانینِ خداوندی رائج کرے۔ قوانین خداوندی رائج کرنے کے لیے بڑی جرأت کی ضرورت ہے۔ معاشرہ میں مذہبی پیشوائیت کی گرفت اتنی سخت ہوتی ہے کہ وہ کسی کو' جسے کہتے ہیں' کہ چوں نہیں کرنے دیتے۔ حکومت کے قانون کی خلاف ورزی سے متعین ہے کہ عدالت میں مقدمہ چلے گا اور اس کے بعد ملزم صاحب! مجرم ثابت ہوگا تو اتنی سزا ملے گی۔ اس طرح معاشرے میں کچھ تو تعین ہے۔ اس کے برعکس اگر میاں بیوی کی زندگی میں ہی کوئی ایسا قدم اُٹھایا جائے جو ان قوانین کے خلاف ہو' جسے ہمارے ہاں کی مذہبی پیشوائیت اسلامی قوانین کہہ کر پیش کر رہی ہے تو اس کا معاشرے کے اندر رہنا محال ہو جاتا ہے۔ وہ سزا تو پھر بھی دو چار مہینے' چھ مہینے کی ہوگی مگر یہاں تو ساری عمر کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ وہ میاں بیوی جی نہیں سکتے۔ میرے سامنے یہ Cases آتے ہیں' انہوں نے خدا کے کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کی ہوئی ہوتی' چونکہ ان مذہبی پیشواؤں کے قوانین کی خلاف ورزی ہے' ان کا معاشرے میں رہنا محال ہو جاتا ہے' وہ تنگ آجاتے ہیں' یہ کوئی کم عذاب ہے کیا۔

## ملوکیت کے دور کی پیدا کردہ ثنویت پبلک لاز اور پرسنل لاز پر حصہ داری قبضہ

ملوکیت کے زمانے میں' انہوں نے جسے آج پبلک لاز کہتے ہیں' اس زمانے میں یہ اصطلاح تو نہیں تھی' مملکت اور حکومت سے متعلق جو معاملات تھے' وہ تو انہوں نے اپنے پاس رکھے۔ اب ان حضرات کے ساتھ جو مذہب کے اجارہ دار تھے' ان کے ساتھ

مفاہمت بڑی ضروری تھی' ورنہ یہ ان کو کبھی ظل اللہ علی الارض نہ کہتے' محراب و منبر پہ کھڑے ہو کر ملوکیت کے حق میں دعائیں نہ مانگتے۔ یہ کس طرح سے ہوا؟ انہوں نے مملکت' حکومت بانٹ دی۔ انہوں نے کہا کہ یہ پبلک لاز ہماری حکمرانی ہے' پرسنل لاز میں تمہاری حکمرانی' اور قرآن حمید کی رو سے' اسلام کی رو سے' خود قوانینِ خداوندی کو دو حصوں میں تقسیم کرنا بجائے خویش شرک ہے' وہ تو کہتا ہے کہ **اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً** (2:208)۔ پورے کا پورا ماننا ہوتا ہے' یہ حصے ہی نہیں کیے جا سکتے۔ پرسنل اور پبلک لا کے معنی کیا ہیں' اور یہی افراد ہیں جو پبلک بنتے ہیں' یہی ہیں جن کے وہ پرسنل ہوتے ہیں۔ پرسنل لاز وہ ان کے ذمے ہوتے ہیں' اب وہ جتنے پبلک لا والے تھے' جنہیں مملکتیں' حکومتیں سلاطین خلفاء کہتے ہیں' غلط فہمی سے' وہ تو ختم ہو گئے۔ یہ مذہبی پیشواؤں کے پرسنل لاز ابھی تک چلے آ رہے ہیں۔ ہندوستان میں انگریزی کی حکومت آئی اس نے بھی یہی سمجھا کہ بہتر یہی ہے کہ اس کو ٹچ (Touch) نہ کیا جائے۔ پبلک لاز تو اس نے اپنے بنائے۔ ان کے تابع یہ اطمینان سے زندگی بسر کرتے چلے جا رہے تھے۔

اندازہ لگائیے کہ یہ انسانوں کے قوانین کے تابع زندگی بسر کرتے تھے' اطمینان سے ہی نہیں بلکہ یہ کہتے تھے کہ اس سے اسلام محفوظ ہے' کیوں؟ کیونکہ پرسنل لاز (Personal Laws) میں وہ دخل نہیں دیتے تھے' وہ انہوں نے ان مذہبی پیشواؤں کے حوالے کر دیئے' ان میں فتویٰ ان کا چلتا تھا' امیر مطمئن تھے اور اصل حکومت تو ان کی مذہبی پیشواؤں کی تھی۔ وہ تو کبھی کسی کو پبلک لاز (Public Laws) کا کوئی معاملہ پڑے تو جب جائے وہ کہیں عدالت میں' وہاں جا کر کوئی فیصلے کرائے۔ اور یہ تو ہر روز کی بات تھی گھروں کے اندر جو معاملات تھے' ان میں ان کی حکومت چلتی تھی۔ سمجھا یہ تھا کہ مملکتِ پاکستان بنے گی تو اسلام کے نام پہ' جیسا کہتے ہیں' کم از کم اسلام تو آئے گا۔

## ہمارے ہاں پرسنل لا کی گرہیں فرقہ بندی کو قائم رکھنے کے لیے مضبوط کی گئیں

یہ اس قسم کی پرسنل اور پبلک لاز کی تقسیم تو نہیں رہے گی' مگر ہوا یہ اس تقسیم کی رہیں اور مضبوط ہو گئیں آپ کے جو Constitutions بنے تھے' ان کے اندر یہ چیز پبلک لا اور پرسنل لا موجود تھی' یہ پرسنل لا کی گرہیں کیوں مضبوط ہوئیں؟ اس لیے کہ یہ جو پرسنل لا یا شخصی قوانین ہیں' یہ ہر فرقے کے اپنے الگ الگ ہیں' ان کو پبلک لاز بنائے تو وہ قانون تمام فرقوں کے اوپر لاگو ہو گا۔ یہ اس لیے تیار نہیں کہ یہ مداخلتِ دین ہے' اس کی ہم اجازت نہیں دیتے' یعنی فرقے مٹانے کی اجازت نہیں دیتے۔ انگریز نے ان سے کہا کہ ہمیں کیا ضرورت ہے کہ اس اوکھلی میں اپنا سر دیں۔ ٹھیک ہے۔ تم اپنے اپنے لاز' اپنے اپنے فرقے رکھو' اس سے فرقے مضبوط ہوئے۔ ان سے اپنے اپنے لاز' اپنے اپنے قوانین' کو مضبوط سے مضبوط تر کرتے چلے گئے۔ بہر حال ہم نے سمجھا تھا کہ یہ مملکت جسے اسلام کے نام پہ کہتے ہیں' اس کے اندر کم از کم یہ چیزیں جو بالبداہت قرآن حمید کے خلاف' فلہٰذا اسلام کے خلاف ہیں'

وہ تو پرسنل لاز کو مٹانے کے لیے مت جائیں گی۔

## فرقہ بندی اور پرسنل لاز کے خلاف پہلی آواز تحریکِ طلوع اسلام کی طرف سے بلند ہوئی تھی

یہ چیز' میں نے عرض کیا ہے کہ پھر وہ درمیان میں' میں آ جاتی ہے تو مجھے کچھ طبعًا ایسی صورت ہے کہ جھجک ہوتی ہے لیکن کہنا پڑتا ہے کہ یہ صرف یہاں کی آواز تھی جس نے پہلے دن سے یہ کہا کہ یہ فرقہ بندی قرآن کریم کی رو سے شرک ہے' پرسنل لاز اور پبلک لاز کی جو موجودہ تقسیم ہے' یہ خلافِ اسلام ہے۔ یہ ایک ہی قسم کا ضابطہ قوانین ہے جو قرآن حمید کی رو سے مرتب ہو اور تمام مسلمانوں کے اوپر یکساں طور پہ منطبق ہو' ان کا اطلاق ہو۔ لیکن کون سنتا تھا؟ آپ حیران ہوں گے کہ ہر دستور میں یہ شق تھی اور ہر دستور کے خلاف طلوعِ اسلام نے آواز اٹھائی' عائلی قوانین کے متعلق کتنا کچھ اس نے لکھا۔

## 73ء کے آئین میں پرسنل لاز کی قبولیت کے بعد شرعی عدالتوں کے الگ قیام کی نوعیت

عزیزانِ من! یہ غنیمت تھا کہ غالبًا 1973ء کے آئین میں یہ جو چیز تھی کہ پرسنل لاز' ہر فرقے کے' اپنے اپنے الگ الگ ہوں گے' یہ شق نہیں تھی۔ ان حضرات نے اصرار کر کے یہ شق اس کے اندر داخل کرائی۔ اب اس کے بعد آپ کے ہاں شرعی عدالتیں قائم ہوئیں۔ یہ جو پرسنل لاز ہیں' یہ شرعی عدالتوں کے حیطہ اقتدار سے باہر ہیں یعنی کسی پبلک لا کے متعلق آپ ان عدالتوں میں یہ دائر کر سکتے ہیں کہ انصاف فلاں قانون کتاب وسنت کے ہی خلاف ہے۔ جیسا ان کی Terms ہیں' یہ اصطلاح ہے۔ یہ اس کے خلاف ہے' یہ تو آپ کر سکتے ہیں لیکن یہ کہ میرا نکاح جو ہے' اس کے متعلق شرعی عدالت سے کہوں کہ یہ کتاب وسنت کے مطابق ہے' وہ وہیں کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! یہ ہمارے حیطہ اقتدار سے باہر ہے یعنی یہ شرعی عدالت کے حیطہ اقتدار سے بھی باہر ہے۔ تو الگ عدالتیں ان کے ہاں کی الگ ہو گئیں۔ نکاح' طلاق' پرسنل لاز کے متعلق کوئی معاملہ' آپ نے حل کرانا ہو تو وہ ان کی طرف ہی جانا ہو گا' نہ حکومت کی طرف' نہ حکومت کی شرعی عدالت کی طرف آپ جا سکتے ہیں۔

## قرآن حکیم کے غیر متبدل اصولوں کے خلاف برپا ہونے والی سرخ آندھی نے ہر گھر کو خون آلود کر رکھا ہے

کبھی آپ نے غور فرمایا کہ کونسا اسلام ہے؟ آپ وہاں نہیں جا سکتے' نتیجہ اس سے ظاہر ہے۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے مجھے جو تجربہ ہوتا ہے اس میں' میں نے دیکھا ہے کہ وہ اس میں بس استثنٰی کرنی ہوتی ہے۔ شاید ہی ایک فیصد کوئی گھر ایسا ہو گا جو کہیں پرسکون ہو اور خوشحال ہو' مطمئن ہو' ورنہ ہر گھر کے اندر کوئی نہ کوئی پرابلم ہے اور وہ پرابلم انہی قوانین کی پیدا کردہ ہوتی ہے جنہیں اسلام کا

قانون کہہ کر پرسنل لاز پہ نافذ کیا جا رہا ہے' اور یہی نہیں' عزیزانِ من! ہمارے ہاں تو کسی قسم کی ریسرچ یا تحقیق بھی ممنوع ہے کیونکہ شریعت کے معاملے میں عقل وفکر سے جو کام لینا ہے' وہ تو حرام ہے۔

## قوموں کے تمدن پر موجودہ دور کی ہوش ربا تحقیق کا نتیجہ جہنم

مغرب کی اقوام نے اپنے ہاں حالانکہ ان کی جو معاشرتی زندگی ہے' وہ بے حد جہنم کی ہے' انہوں نے یہ تحقیق کی ہے اور اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ یہ جو مرد عورت تعلقات ہیں' ان کا اثر قوموں کے تمدن پہ اتنا پڑتا ہے کہ اگر یہ خراب ہو جائیں تو وہ اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ وہ قوم زیادہ سے زیادہ ایک سو سال تک زندہ رہ سکتی ہے' پھر وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ یہ ان کی ریسرچ [1] ہے اور یہاں قرآن کریم کی کیفیت یہ ہے' کیا بات ہے صاحب اس آسمانی کتاب کی! کہ وہ طلاق کے متعلق قوانین کا ذکر کرنے کے فوری بعد یہ کہتا ہے کہ کتنی ہی قومیں تھیں جو اس لیے تباہ ہو گئیں کہ انہوں نے ان عائلی زندگی کے متعلق خدا کے قوانین کی بجائے اپنے قوانین کا اتباع کیا اور وَرُسُلِهٖ (65:8) اور اس کے رسولوں کی مخالفت کی پھر دیکھیے کہ **فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا** (65:8) تو ہمارے قانونِ مکافات نے ان کا سخت محاسبہ کیا اور ان پر' انہی کی وجہ سے تباہیاں اور بربادیاں آ گئیں اور کہا کہ **اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا** (65:10)۔ چنانچہ' خدا نے قانونِ مکافات کے مطابق' ایسی قوموں پر سخت تباہی آ جاتی ہے پھر کہا کہ **عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا** (65:9) اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

انہی آیات کے اندر تین چار دفعہ اس عذاب کا ذکر' تباہی کا ذکر' ہلاکت کا ذکر' آ رہا ہے کہ خدا کے قوانین' جو پرسنل لاز یا عائلی زندگی کے متعلق تھے' ان کی بجائے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کا اتباع کیا' تو قوموں کی یہ کیفیت ہو گئی اور ہمیں تو تاریخ سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے' صورت ببیں حالش مپرس [2] ہمارے اوپر اپنے آپ پہ بیت رہی ہے' گذر رہی ہے یہ صورت ہے۔ ایک طلاق کا ہی مسئلہ جو میں نے پچھلے دنوں آپ کو بتایا تھا' جو اس نے غصے میں آ کر کہا کہ جی! میں نے تین دفعہ کہہ دیا طلاق طلاق طلاق، اس کے بعد صاحب! فتویٰ مل گیا کہ اب اس بیچاری معصومہ کو حلالہ کرنا پڑیگا۔

## خود ساختہ قوانین اور خالقِ کائنات کی طرف سے عطا کردہ قوانین کا تجرباتی فرق

سوچیے تو سہی کہ کیا یہ **عَذَابًا نُّكْرًا** (65:8) نہیں ہے؟ کیا بات ہے قرآن حمید کی! ''نکرا'' وہ ہے کہ جو نہ کہیں دیکھا' نہ کہیں سنا گیا۔ کہا کہ یہ کیفیت ہے۔ پھر میں عرض کروں کہ یہ قرآن حکیم کا اعجاز ہے۔ ایک طرف ہے کہ **عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا** (65:8)

---

[1] اس تحقیق کے لیے دیکھیے: Unwin, J.D, (1934). Sex and Culture. London: Oxford University Press.

[2] صورت دیکھ لو' حال پوچھنے کی ضرورت نہیں۔

انہوں نے خدا کے قوانین سے سرکشی برتی' اَمۡرِهَا (65:9) کا اتباع کیا امرھا یعنی اپنے قوانین بنا کر ان کا اتباع کیا۔ اب دیکھیے! کہ کس طرح سے قرآنِ حمید ان دونوں قوانین میں فرق کرتا ہے یعنی یہ لاقانونیت کی زندگی نہیں ہے جو بسر ہو رہی ہے۔ خدا کے متعین کردہ' فرمودہ قوانین اور انسانوں کے خود ساختہ قوانین میں فرق بتا رہا ہے اور عزیزانِ من! جب ہم ان انسانوں سے کہیں گے خواہ وہ کتنے ہی بڑے جلیل القدر' بزرگ' متقی' پرہیزگار' ہستیاں کیوں نہ ہوں' کسی انسان کو خدا نے حق نہیں دیا ہے کہ وہ اپنے قوانین دورے انسانوں پہ نافذ کریں خواہ وہ کوئی بھی کیوں نہ ہوں' ان کی تعظیم' ان کی تکریم' ہمارے سرآنکھوں پر ہے وہ بزرگ تھے لیکن یہ تو کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ انسانوں کے بنائے ہوئے احکام نافذ کر کے انسانوں پر حکومت کرے۔ ہزار سال پہلے اگر کوئی انسان اپنے ہاں ایک قانون بنا دے' اور قیامت تک کے انسانوں کے اوپر ان کو رائج کر دے' ان کی آزادیاں سلب کر لے۔ اس معاملے میں تو صرف خدا کو یہ حق حاصل ہے' جس نے انسان کو آزاد پیدا کیا' اس کو آزاد کیا' اس کی آزادی پہ جو پابندیاں عائد کرنی تھیں' وہ اس نے عائد کی ہیں۔ اس نے تو یہاں کہا ہے کہ کسی بشر کو بھی اس کا حق حاصل نہیں ہے۔ وہی آیت بار بار آیا کرتی ہے کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ یُّؤۡتِیَهُ اللّٰهُ الۡكِتٰبَ وَ الۡحُكۡمَ وَ النُّبُوَّةَ (3:79)۔ اس کے پاس ضابطہ قوانین ہو' حقِ حکومت ہو' نبوت بھی کیوں نہ اس کو مل گئی ہو' اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم خدا کے نہیں' میرے احکام کی اطاعت کرو۔ یہ تو کسی انسان کو بھی حق حاصل نہیں ہے۔ وہ تو نبوت کو بھی درمیان میں لا رہا ہے۔ تو جو اَمۡرِهَا (65:9) اور اَمۡرِ رَبِّهَا (65:8) ہے' میں نے یہی عرض کیا ہے کہ دیکھیے! کیا فرق کر جاتا ہے۔

## قرآن حکیم تو ہر اربابِ عقل و دانش کو زندگی کے ہر موڑ اور ہر قدم پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے

عزیزانِ من! قرآن کریم اور عائلی زندگی کے ساتھ یہ کچھ ہوا ہے۔ اس کے بعد کہا ہے فَاتَّقُوا اللّٰهَ (65:10)۔ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ یہ کن سے کہہ رہا ہے؟ کہا کہ یٰۤاُولِی الۡاَلۡبَابِ (65:10) یہاں ''اربابِ عقل و دانش'' کو مخاطب کیا جا رہا ہے۔ اے اربابِ عقل و دانش! دیکھیے قرآن حکیم خطاب کر رہا ہے کہ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا (65:10)۔ اے اربابِ عقل و دانش! جو تم غور و فکر کے بعد خدا پر اور اس کی کتاب پر ایمان لے آئے ہو' تو یہاں تو ''اولی الباب'' اور ''آمنوا'' دونوں جتنے بھی ہیں' وہ تو اکٹھے ہیں۔ اولی الباب اگر عقل و فکر کی رو سے نہیں تو قرآن کریم تو اس ایمان کو ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا۔ اور یہاں یہ جو معاملات ہیں' یہ قوانین' یہ فقہ کی باتیں' ان میں جو عقل و فکر کو دخل دینا ہے' ممنون ہے۔ قرآن کریم ایمان کے لیے عقل و فکر کی شرط رکھ رہا ہے۔ وہ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا (65:10)۔ کی تعریف یہ اولی الباب کرتا ہے اور جو الباب بھی ہیں' وہ تو پھر اور بھی آگے چلے جاتے ہیں' یہ لفظ لب لباب بھی تو آپ نے سنا ہوگا۔ وہ جو میں پنجابی میں کہا کرتا ہوں: تت کڈیا ہویا کسی چیز دا جیہڑا ہوندا اے یعنی نچوڑ کسی چیز کا جو نچوڑ'

ملخص ہوتا ہے، عقل کا بھی نچوڑ ہے، وہ کون ہیں؟

## قرآنی ضابطہ حیات کے نفاذ کے لیے ایک زندہ اتھارٹی کا ہونا ضروری ہوتا ہے

کہا کہ **الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قَدۡ اَنۡزَلَ اللّٰہُ اِلَیۡکُمۡ ذِکۡرًا o رَّسُوۡلًا یَّتۡلُوۡا عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتِ اللّٰہِ مُبَیِّنٰتٍ** (65:10-11)۔ آ ہا ہا! خدا نے تمہاری طرف ایک ضابطہ قوانین نازل کر دیا، ایک رسول بھیج دیا۔ ضابطہ قوانین ایسے ہی نہیں کہ وہ چٹانوں پہ لکھ کر تمہیں دیدیا یا یونہی کہیں کتاب میں لکھ کر دیدیا کہ وہ رکھے ہیں۔ اس ضابطہ کو نافذ کرنے والی ایک اتھارٹی ہونی چاہیے، اس کو سمجھانے والا ہونا چاہیے، ساتھ ہم نے اپنی طرف سے رسول بھیج دیا۔ وہ خدا کے قوانین کو تم تک پہنچاتا ہے اور وہ جو دوسرے مقامات ہیں ان میں کہا کہ **یُعَلِّمُہُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ** (3:48)۔ وہ تمہیں قانون کی تعلیم دیتا ہے، **وَ الۡحِکۡمَۃَ** (3:48)۔ قانون کے پیچھے The why of it (کیوں ایسا ہے) قانون جسے اس کے اندر Rational کہتے ہیں، وہ اس کا Reason بتاتا ہے کہ یہ ایسا قانون ہم نے کیوں نافذ کیا ہے۔

## رسول کا فریضہ تو خدا کے احکام کو نافذ کر کے تاریکی کو دور کرنا ہوتا ہے

رسول کا فریضہ تھا کہ قرآن کریم نے جو قانون دیا ہے اس کی قرآن کریم نے جو حکمت بیان کی، اس کی تعلیم دینے والا رسول کہا، ہم نے اتنا بڑا انتظام کیا ہے، یہ سب کچھ کاہے کے لیے کیا؟ کہا کہ **لِّیُخۡرِجَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ** (65:11) تا کہ انہیں جو اس طرح ایمان لائیں اور وہ صحیح کام کریں، انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے۔ یہ تھا مقصد اس قرآن کریم کا اور اس تعلیم نبوی ﷺ کا کہ انہیں تاریکیوں سے، تاریکیاں جمع ہے، سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ہم کن تاریکیوں کے اندر ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ آپ عائلی زندگی کی ایک ایک پرابلم لے لیجیے، جو پرابلم Rrise ہوتی ہے، اس کا صحیح حل (Solution) آپ کو نہیں ملتا۔ اگر ملتا ہے تو ذہنی طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ شریعت کے خلاف ہے۔ آپ پھر اس تاریکی کے اندر رہتے ہیں۔ وہ تو تاریکی مٹے گی، ہٹے گی، تو روشنی آئے گی، روشنی آئے گی تو وہ تاریکی مٹے گی۔ یہ روشنی کو آنے نہیں دیتے۔ یہ بند کمرے کے اندر جہاں تاریکی ہے، ماچس جلانے ہی نہیں دیتے۔ روشنی تو ایسی چیز ہے کہ اتنا بڑا کمرا بھی کیوں نہ ہو، ایک چھوٹی سی ماچس بھی جلا لیجیے تو قرآنِ کریم کہتا ہے کہ **جَآءَ الۡحَقُّ وَ زَہَقَ الۡبَاطِلُ اِنَّ الۡبَاطِلَ کَانَ زَہُوۡقًا** (17:81) روشنی آئی، وہ کتنی سی بھی کیوں نہ ہو، تو تاریکی چلی جائے گی۔ تاریکی کی تو فطرت کے اندر ہے کہ روشنی آئے تو وہ چلی جائے۔

## جہاں بھی ظلم ہوگا وہاں ظلمت جنم لے گی حق کا وجود تو ظلم کو پیدا ہی نہیں ہونے دیتا

تاریکی خود مستقل بالذات نہیں ہوتی وہ تو روشنی کے نہ ہونے کا نام ہوتا ہے اور یہ تو پھر عربی زبان ہے۔ ظلمت جس لفظ سے نکلا

ہے وہ ہے جسے ظلم کہتے ہیں۔ظلمت کے معنی ہیں ''وہ مقام' جہاں روشنی ہونی چاہیے مگر وہاں روشنی نہ ہو۔اسے کہتے ہیں ظلمت۔تو کم از کم یہ جو ایمان کا دعویٰ کرنے والی قوم ہے'ان کے ہاں تو یہ روشنی ہونی چاہیے تھی اور وہ تو اس نور دیا ہے۔اس نے قرآن حمید کو نور کہا ہے' وہ ان کے گھر میں ہے لیکن اب جو اس نور کو غلافوں میں بند کر کے طاق کے اوپر رکھ دیا جائے تو اسے کا کیا علاج! جہاں روشنی ہونی چاہیے وہاں روشنی نہ ہو' تو اس کو ظلم یا ظلمت کہتے ہیں' طریقہ اس کا یہ ہے کہ روشنی کی ایک کرن لے آیئے' تاریکی کافور ہو جائے گی۔طاغوت کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہاں روشنی کی ایک کرن بھی آنے نہ پائے۔کہا ہے کہ اٰیٰتِ اللّٰـهِ مُبَيِّنٰتٍ (65:11)۔کیا بات ہے! واضح ہیں خدا کے قوانین! اس میں الجھاؤ نہیں پیچیدگی نہیں ہے' ابہام نہیں ہے واضح ہیں' لاریب ہیں۔مبینٰت تو خود بھی واضح ہے اور ہر چیز کو واضح کرنے والے والی ہے۔

## قرآنِ حکیم کے پیش کردہ عائلی قوانین ظلم کو پیدا ہی نہیں ہونے دیتے

کہا کہ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا (65:11)۔اور جو اس طرح سے خدا کے قوانین پر ایمان لے آئے اور ان کو اپنی زندگی کا ضابطہ حیات بنالے' تو انہیں خدا پھر ایسی جنت کی زندگی عطا کر دیتا ہے۔آپ نے دیکھا کہ وہ بات عائلی قوانین کے ذکر میں ہی چلی آ رہی ہے۔دوسرے مقام پہ ہے' غالباً سورۃ البقرۃ میں ہی ہے کہ جو ہم کہہ رہے ہیں' اس کے مطابق آپ کی زندگی عائلی ہو' تو وہ کہہ رہا ہے کہ خدا تمہیں جنت کی طرف دعوت دے رہا ہے اور یہ لوگ تمہیں جہنم کی طرف بلا رہے ہیں اور یہاں بھی کہا کہ اس کے مطابق زندگی بسر کرو گے تو تمہاری جنت کی زندگی ہو جائے گی۔یہاں بھی جنت کی زندگی کہا ہے اور جس کی یہاں جنت کی زندگی ہے' عاقبت میں بھی جنت کی زندگی ہوگی' جو یہاں جہنم میں ہے' وہاں بھی جہنم میں ہے۔کہا ہے کہ وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (17:72)۔جو یہاں اندھا ہے' وہ وہاں بھی اندھا ہی ہوگا۔وہ تمہیں جنت کی زندگی دے گا' سدا بہار جنت کی زندگی' خزاں ناآشنا' ابدی جنت کی زندگی یعنی جب تک ان قوانین پہ عمل کرتے رہو گے' اس جنت کی خوشگواریوں میں' سرسبزیوں میں' فرق نہیں آئے گا۔

## قدرت نے تو قرآن حکیم کی اقدار میں سامانِ زیست چھپا رکھا ہے

آگے کہا کہ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا (65:11) اتنا اچھا اس شخص کو خدا نے سامانِ زیست دیا' اس کا نام خدا نے رزق رکھا ہے۔یہ ہے سامانِ زیست۔کہا کہ اَللّٰهُ الَّذِيْ (65:12) پھر قرآن حمید آ گیا اسی اپنے انداز پہ۔شہادت پیش کر رہا ہے کہ ہمارے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے سے کس قدر سکون ہوتا ہے' کس قدر کامیابیاں ہوتی ہیں! یہ خارجی کائنات ہے۔وہاں باہر کی

زندگی میں قوانینِ خداوندی بھی ہیں، جنہیں آپ قوانینِ فطرت کہتے ہیں۔ یہ بھی خدا کے ہی قوانین ہیں، انہوں نے ان کا نام الگ رکھا ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہاں ان چیزوں کو اس کا اختیار نہیں ہے کہ وہ خدا کے قانون کے مطابق زندگی بسر نہ کریں یا اپنے قوانین کے مطابق کریں، وہ اپنے قوانین بنا ہی نہیں سکتے۔

## کائناتی قوانین کو بار بار سامنے لانے کا مقصد قوانین خداوندی کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے

قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے کس قسم کا ماحول پیدا ہوتا ہے، وہ فوراً باہر کی زندگی، یونیورسل لاز، جو کائناتی زندگی ہے، اس کی طرف تمہاری توجہ مبذول کراتا ہے۔ یہ کتنے عظیم کرّے ہیں! کہا ہے کہ اَلَّذِیۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الۡاَرۡضِ مِثۡلَهُنَّ (65:12)۔ ان عظیم الشان کرّوں کی طرف دیکھیے جو قانونِ خاوندی کے اتباع سے مسلسل اپنے راستے پر رواں دواں ہیں اور ہم، عزیزانِ من! کیا سمجھ سکیں گے کہ یہ کرّے، خارجی یونیورس میں قانونِ خداوندی کے مطابق سرگرم عمل رہتے ہیں۔ یہ انتظام ربوبیت اس خدا کی طرف سے ہوتا ہے جس نے کائنات کی فضاؤں میں متعدد بلندیوں کو پیدا کیا اور ہر بلندی کے مقابلہ میں، اس جیسی پستی ❶۔ وہ ان تمام اجرام فلکی میں، اپنے پروگرام کو نافذ کرتا ہے اور یہ اسی کے مطابق سرگرم عمل رہتے ہیں۔۔ یہ شہابِ ثاقب ایسی قرآن حمید کی گزرگاہیں، جنہیں کہکشاں کہا جاتا ہے۔ یہ علم الافلاک کے جو ماہرین ہیں اگر ان کی کوئی ایک آدھ کتاب بھی آپ پڑھیے تو آدمی اپنا سر پکڑ کر رہ جاتا ہے کہ یا اللہ! یہ تیری اس کائنات کا ذرا سا گوشہ ہوتا ہے، ان کے مقابلے میں زمین تو ایک طرف رہی، یہ جسے نظامِ شمسی کہتے ہیں، جس کے اندر یہ اتنے اور کرّے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ وہ ایسے ہے جیسے ایک صحرا میں ذرہ ہوتا ہے۔ یہاں قرآن کریم ہمیشہ ان کرّوں کی، ارض وسما کی مثال دیتا ہے جو ہمارے سامنے محسوس اور مرئی شکل میں ہوتے ہیں۔ کہا کہ دیکھا یہ کہ کس سکون سے، کس Discipline سے، کس نظم وضبط سے، یہ کارگہ کائنات چل رہی ہے۔ کیوں چل رہی ہے؟ اس لیے کہ وہ خدا کے قوانین کا اتباع کر رہی ہے۔

---

❶ بلندی اور پستی اضافی (Relative) جہتیں ہیں۔ اگر تین چیزیں اوپر اور نیچے رکھی ہوں تو سب سے اوپر والی کے مقابلہ میں، درمیان والی چیز نیچے ہوگی اور سب سے نیچے والی کے مقابلہ میں، وہی درمیان والی اوپر ہوگی۔ اس طرح ہر پستی کی ایک بلندی ہوتی ہے اور ہر بلندی کی ایک پستی۔ یہی صورت، فضا میں بکھرے ہوئے اجرام فلکی (کرّوں) کی ہے۔ ہر کرّہ اپنے سے نیچے والے کے مقابلہ میں بلند اور اپنے سے اوپر والے کے مقابلہ میں پست ہے۔ یہ مطلب ہے ہر ''سما'' کے مقابلہ میں، اس جیسی ایک ''ارض'' کا۔ سماء بلندی اور ارض پستی۔ سماء اوپر والا کرّہ۔ اور ارض اس سے نچلا کرّہ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 1330 (فٹ نوٹ 1)۔

## عقلِ انسانی کے لیے چودہ سو سال پیشتر سر زمین عرب میں قرآن حکیم کا ایک انکشاف کہ ہر اسما کی ایک ارض ہے

عزیزانِ من! آگے ایک بات کہی گئی ہے۔ ویسے تو قرآن کریم کے ایک ایک لفظ سے اس کی شہادت ملتی ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے' وحی ہے' لیکن بعض مقامات ایسے ہوتے ہیں' جہاں وہ پکار اُٹھتے ہیں کہ یہ خدا ہی کا کلام ہوسکتا ہے' کوئی انسان ایسا نہیں کہہ سکتا تھا۔ چودہ سو سال پہلے کے علم الافلاک کی کتابیں' آپ دیکھ لیجئے' عزیزانِ من! جو بھی رائج تھیں ان میں سے کسی میں یہ بات نہیں ملے گی جو قرآن کریم کہہ گیا ہے۔ آج یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے۔ کیا کہا ہے؟ کہا یہ ہے کہ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ (65:12)۔ اس نے متعدد کرّے بلندیوں پہ پیدا کیے وَّ مِنَ الۡاَرۡضِ مِثۡلَهُنَّ (65:12) اور ان کی مثل' عام ترجمہ' ارض پیدا کی۔ یہ بڑی عظیم چیز ہے۔ ''سماء'' کہتے ہیں جو چیز اونچی ہو' ارض کہتے ہیں جو چیز نیچے ہو۔ یہاں کہا ہے کہ ہر ''سماء'' کی مثل ایک ارض ہے۔ یہ جو اونچی اور نیچی ہے' اسے اصطلاح میں کہیں گے کہ یہ اضافی (Relative) چیز ہوتی ہے یعنی کسی چیز سے نیچی ہوگی' وہ سمجھ لیا آپ نے' کسی چیز سے اونچی ہوگی۔ تین چیزیں اگر آپ اوپر نیچے رکھیں گے' درمیان کی چیز اوپر کی چیز کی نسبت سے نیچے ہوگی' اور نیچے کی چیز کی نسبت سے اوپر ہوگی۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ جسے تم ''سماء'' اوپر کی چیز کہتے ہو' اس سے جو نیچے کا کرّہ ہے' وہ اس کی ارض ہے اور یہ ارض ایک ''سماء'' ہے نیچے والے کرّے کا۔ یہ اس کی ارض ہے' یہ اس کا سماء ہے۔ اللہ اکبر! کہا کہ فی ذاتہٖ نہ سماء' سماء ہے' نہ ارض' ارض ہے۔ یہ تو جس سماء کو آپ دیکھو اس کے نیچے کا جو کرہ ہے' وہ اس کی ارض ہے اور اس سے نیچے ایک کرّہ ہے یہ اس کرّے کی سماء ہے' وہ کرہ اس کی ارض ہے۔ عزیزانِ من! اس کو تو جیمز جینز ہی Appreciate کر سکتا ہے۔ یہ یورپ کے محققین وجد میں آ جاتے ہیں۔ ان کے سامنے جب قرآن حمید کی کوئی آیت آ جاتی ہے۔

ان کرّوں کے متعلق چودہ سو سال پہلے یہ چیز کہنا' وہ بھی عرب کی سر زمین میں' جہاں مکے جیسے شہر میں جو سارے عرب کا مرکزی مقام تھا' کہا جاتا ہے کہ سترہ آدمی جو تھے' وہ نوشت وخواند جانتے تھے' تعلیم تو بہت بڑی چیز ہوتی ہے۔ چودہ سو سال پہلے کا زمانہ' دنیا بھر میں کہیں بھی علم الافلاک میں یہ بات نہیں ملتی۔ وہ تو بطلیموسی نظام تھا' فرصت ہو تو میں بتاؤں کہ وہ کیا مانتے تھے۔ اس کے اندر عرب' جو باقی ممالک کے مقابلے میں بھی اتنا کم درجے کا علم تھا۔ اس میں ایک فرد جو نبوت سے پیشتر ان پڑھ ہے' وہ شخص ﷺ یہ بات علم الافلاک کے متعلق کہتا ہے۔ وہ تو ایک طرف اس زمانے کا تو بطلیموس بھی یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا جو کہی گئی۔ کیا یہ انسانی فکر کی بات ہوسکتی ہے؟ آج یہ لوگ اس تحقیق کے بعد پہنچے کہ یہ جو کرّے اس طرح سے یوں نظر آتے ہیں' واقعی ان کی کیفیت یہ ہے' اوپر ہیں' نیچے ہیں' نیچے والے سے پھر نیچے ہیں اور قرآن حمید نے لفظ ہی ایک استعمال کیا ہے۔ کہا کہ وَّ مِنَ الۡاَرۡضِ مِثۡلَهُنَّ (65:12) ہر سماء کی مثل اس کی ایک ارض ہے۔ کیا بات ہے! لَا رَیۡبَ (2:2)۔ یہ انسانی فکر کی تخلیق نہیں ہوسکتا۔ خدا ہی یہ کہہ سکتا تھا جو ارض وسما کا خالق تھا مِثۡلَهُنَّ (65:12)۔ لیکن ہم ان چیزوں کو کیا جانیں' ہم تو آج بھی چاند دیکھتے ہیں تو بند کمرے کے اندر

میٹنگ کر کے دیکھتے ہیں۔ جی! کمیٹی مقرر کی جاتی ہے صاحب! کہا کہ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ (65:12) آہاہاہا! اور اس تمام فضا کے اندر اس کا ''امر'' دیکھا! وہ ''امر'' کا لفظ کہاں کہاں چلا آ رہا ہے۔

## قرآن حکیم کا تو ہر حکم علم و حکمت پر مبنی ہے

عزیزانِ من! وہ عائلی زندگی کے قوانین بھی ''امرِ ربی'' ❶ ہے۔ اس کے متعلق کہا کہ اگر ان کے مطابق معاشرہ ہو تو کس حسن و خوبی سے چلے گا۔ باہر کی کائنات دیکھیے! یہاں بھی کہا کہ یہ اس طرح سے حسن و خوبی سے چل رہے ہیں۔ ''امر رب'' کے ماتحت چل رہے ہیں۔ ان کے مابین بھی خدا اپنا امر نافذ کر رہا ہے۔ یہ ہے اَمْرِ رَبِّی (65:8)۔ آگے کہا ہے کہ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِکُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا (65:12) تا کہ تم تحقیق کرو، غور و فکر کرو، تو یہ حقیقت تمہارے سامنے آ جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شے کے لیے قوانین مقرر کر دیئے ہیں اور وہ قوانین سکھا شاہی نہیں، خدا کے ہیں، دھاندلی نہیں معاذ اللہ! اور بِکُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا (65:12)۔ اس کے سارے قوانین علم پر مبنی ہیں تو کہا یہ ہے کہ دیکھو تو سہی، جب باہر کے اتنے عظیم القدر کرّوں کے اندر جو قوانین خداوندی کا اتباع کرتے ہیں۔ ان میں کیسا سکون و اطمینان ہے۔

## پوری کی پوری خارجی کائنات میں کوئی کسی کو طلاق نہیں دیتا

اس کے ہاں کوئی ایسی کُرّی نہیں ہے جو آ کر روئے کہ مجھے اس نے تین دفعہ طلاق طلاق طلاق کہہ دیا اور مجھے تباہ کر دیا۔ کائنات کے کسی کرّے میں یہ بات نہیں آتی۔ وہاں کوئی کسی دوسرے کرّے کو طلاق طلاق طلاق نہیں کہتا۔ کہا کہ دیکھا ہمارا امرِ رب! ان کے اندر چل رہا ہے۔ دیکھا کہ کس طرح سے یہ نظام چل رہا ہے اور اسی سے کہا کہ بِکُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا (65:12) یہ قوانین علم پر مبنی ہیں۔ کہیں کہا کہ یہ حکمت پر مبنی ہیں، واضح ہیں، وہ ان چیزوں پر مسلط ہیں۔ میں پھر عرض کر دوں کہ یہ نہیں ہے کہ خدا نے اپنی کوئی صفات بیان کی ہیں کہ ہم ایسے ہیں، ہماری قوت ایسی ہے ان صفات کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر تم نے ہمارے نام پر کوئی مملکت یا حکومت قائم کرنی ہے، تو اس کے قوانین کو ایسا ہونا چاہیے کہ علم پر مبنی ہو، حکمت پر مبنی ہو، کہ جو پوچھے تم Explain کر سکو کہ ایسا قانون کیوں بنایا گیا ہے، اس کے نتائج اس قانون کی صداقت کا ثبوت بن جائیں۔

## خدا کی صفات کو بیان کرنے کا مقصد انتظامی امور کے سلسلہ میں انسانوں کی راہنمائی کرنا مقصود ہے

یہ جو خدا کی صفات بالخصوص آتی ہیں میں نے اب کئی دفعہ کہا ہے کہ آیت کے آخر میں جو ایک صفتِ خداوندی آتی ہے وہ بڑی عظیم شے ہوتی ہے۔ اس میں گہرائی بھی ہوتی ہے، گیرائی بھی ہوتی ہے کہ تمہارے جو قوانین بننے چاہئیں، یہاں ان قوانین کو نافذ

---

❶ اس کے لیے دیکھیے: (65:8)

کرنے کے لیے جو ہم نے بھیجے ہیں' ان میں تمہیں بتانا ہوگا کہ یہ کیوں ایسا بنایا گیا ہے' کیوں یوں نافذ کیا گیا ہے۔ یہ علم کی بناء پہ ہوگا' حکمت کی بناء پر ہوگا' مبیّنت ہوں گے' وہ واضح ہوں گے' اس کے اندر ابہام نہیں ہوگا تا کہ تمہیں تعلموا ہو سکے۔ اب یہ تعلموا کے معنی کیا ہیں؟ تا کہ تمہیں معلوم ہو جائے۔ اگر معلوم ہو جائے تو پھر کیا ہو؟ ہمیں تو خیر' یہ معلوم ہی نہیں ہوتا' ہم ریسرچ ہی کبھی نہیں کرتے' اگر معلوم بھی ہو جائے کہ یہ اس طرح سے چلتے ہیں تو پھر کیا؟ اگلی بات یہ ہے کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ ہمارے قوانین ایسے ہونے چاہئیں۔ ہماری مملکتیں ایسی ہونی چاہئیں۔ الغرض اس کے ان تمام امور کو اس لیے بیان کیا ہے کہ تم سمجھ لو کہ کائنات میں ہر شے اس کے مقرر کردہ اندازے اور پیمانے یعنی قانون کے مطابق چل رہی ہے اور یہ کہ کائنات کی کوئی شے' علمِ خداوندی کے احاطہ سے باہر نہیں۔ عزیزانِ من! یہ سورۃ الطلاق کی آخری آیت تھی۔ اب سورۃ التحریم شروع ہوتی ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّاؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀......❀......❀

# سورة التحريم

# پہلا باب: **سورۃ التحریم** (پس منظر آیت 1)

**بسم الله الرحمن الرحیم**

عزیزانِ من! اب سورۃ التحریم شروع ہوتی ہے [1]۔ یہ 66ویں سورۃ ہے: (66:1)

## حرام وحلال کے سلسلہ میں زیرِنظر آیت کا مروجہ غلط ترجمہ اور پھر اس کا صحیح مفہوم

اس سورۃ کی پہلی ہی آیت میں ایک بڑی اہم چیز ہے اور بڑی ہی غور طلب چیز ہے، اور متنازع بھی ہے۔ وہ تو ہمارے ہاں ہوتا ہی ہے۔ تنازع نہ پیدا کیا جائے تو فرقے کیسے پیدا ہو سکتے ہیں۔ فرقہ کے معنی ہی الگ الگ رہنا ہیں۔ وہ تو تنازع سے ہی ہوتا ہے، کبھی صلح سے بھی کوئی الگ الگ رہتا ہے۔ نبی اکرمﷺ سے خطاب ہے کہ **یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ** (66:1) بات پہلے اتنی ہی ہوئی ہے۔ عام ترجمے کے اعتبار سے یہ ہے کہ اے نبیﷺ! خدا نے جو حلال کیا، اسے تُو نے اپنی بعض بیویوں کی پسندیدگی کی خاطر اپنے لیے حرام کیوں قرار دے دیا۔ یہ ہے جی عام ترجمہ جو کیا جاتا ہے۔ پہلی ہی بات تو یہ ہے کہ اگر حرام کے معنی وہ لیے جائیں کہ جو ابدی طور پر کوئی چیز حرام ہوتی ہے، جسے خدا نے کہا ہے کہ ہم نے تمہارے اوپر حرام قرار دی مثلاً قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ ہم نے ماؤں سے نکاح کرنا حرام قرار دیا ہے، تو اب حرام کے معنی واضح ہو گئے کہ یہ نکاح کسی حالت میں، کسی صورت میں، ابدی طور پر، قیامت تک، نہیں ہو سکتا۔ ہر ایک کے لیے یہ چیز ہے۔ یہ ہے حرمت۔ اسی طرح لحمِ خنزیر حرام قرار دیدیا۔ وہ حرمت ہو گئی لیکن یہ جو لفظ ہے ایک تو حرام وہ ہے جو خدا نے حرام قرار دیا۔ ابدی طور پر جو چیز حرام ہو گئی اس کے عام معنی ہوتے ہیں ممانعت کر دینا، کوئی پابندی عائد کر دینا۔

---

[1] یہ درس سورۃ الطلاق کے دوسرے درس مورخہ ستمبر 1983 کی 9 تاریخ کے تسلسل میں ہی ارزاں فرمایا گیا تھا۔

## حج کے موقعہ پر احرام باندھنے کا حقیقی مفہوم

اب میں نے عرض کیا ہے کہ ہم تو کبھی الفاظ پہ غور نہیں کرتے۔ یہ جو حج کے لیے احرام باندھا جاتا ہے میں سمجھتا ہوں ہر سال ہمارے ہاں سے بھی ہزار ہا اور دنیا میں سے لاکھوں جاتے ہونگے اور آپ احباب میں سے بھی گئے ہونگے' احرام باندھا ہوگا' کبھی سوچا بھی ہے کہ اسے احرام کہتے کیوں ہیں؟ یہ کیا بات ہے؟ ہم نے تو یہی سمجھا ہے کہ وہ وہاں نیچے اوپر صرف ایک ہی بن سلی چادر ہوتی ہے' اور اس کے لیے مصلحت یہ ہے کہ صاحب! ایک ہی قسم کے سارے نظر آئیں۔ اس لیے یہ ہے۔ اس کو احرام کیوں کہا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ تو یہیں ح ر م سے یہ لفظ ہے۔ وہ ایک میقات مقام ہے جہاں سے وہ شروع ہوتا ہے۔ وہ حرم کا دائرہ سمجھ لیجیے۔ وہاں پہنچنے پر بہت سی چیزیں جو اس سے پہلے عام طور پر جائز تھیں' کی جاسکتی تھیں' بہت سی چیزوں کے کرنے کی ممانعت ہو جاتی ہے۔ اس کا شعار یا Symptom یہ ہے کہ میں نے اپنے اوپر ان چیزوں کی' جو خدا نے حج کے دوران کہی ہیں' ممانعت عائد کر لی ہے' پابندی عائد کر لی ہے۔ یہ اس کا ایک Symptom ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کے لیے یہ لفظ احرام آیا ہے یعنی پابندی' ممانعت' عائد کر دینا۔ قرآنِ کریم میں بھی یہ جو لفظ ہے اس حرمت کے علاوہ' جو خدا نے حرام قرار دی ہیں' اس کی ممانعت' عام پابندی کے معنوں میں بھی آتا ہے' واجب قرار دینے کے معنوں میں بھی یہ لفظ آتا ہے۔

## خدا کی حلال کردہ کسی چیز کو نبی بھی حرام قرار نہیں دے سکتا۔ اس چیز کا مکمل اختیار صرف خدا کے پاس ہے

تو پہلی چیز مجھے اس لیے اتنی کہنی پڑی کہ اگر اس کے معنی یہ کہیں کہ اے نبی! تُو نے اپنے اوپر حلال کو کیوں حرام قرار دیدیا تو اس کے معنی یہ ہو گئے کہ خدا کے حلال کردہ کو نبی نے حرام قرار دیدیا (معاذ اللہ) ان معنوں میں (معاذ اللہ) نبی کبھی ایسا کر سکتا ہے۔ یہ نبی تو ایک طرف رہا' یاد رکھیے! جو حرام اور حلال ہے' یہ خدا نے اس کے اختیارات صرف اپنے لیے رکھے ہیں۔ یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے کہ اس نے قیامت تک کے لیے تمام انسانوں کی آزادی پہ ایک پابندی لگا دی کہ تم قیامت تک یہ نہیں کر سکتے۔ اس کی آزادی سلب کر دی جاتی ہے پابندی لگا دی جاتی ہے۔ بہت بڑی چیز ہے۔ خدا نے انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔ اس کے اختیار اور ارادے پر پابندی عائد کرنے کا کسی کو حق حاصل نہیں ہے۔ اسی کو کہتے ہیں کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے کہ دوسرے انسان پہ حکومت کرے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنی کسی بات کی پابندی اس کے اوپر عائد کرے' یہ صرف خدا کو حق حاصل ہے۔ تمام انسان یکساں طور پہ آزاد پیدا ہوئے ہیں۔ انسانوں کی آزادی کے اوپر کوئی پابندی عائد کرنی جو تھی' یہ خدا کے اپنے اختیار کی بات تھی' کسی انسان کی نہیں۔ اس نے جو پابندیاں عائد کرنی تھیں' جن کی حکمت اور مصلحت اس کو معلوم ہو' اور اس نے بیان کی ہو' وہ اس نے عائد کی ہیں۔ وہ جو پابندیاں خدا نے عائد کی ہیں اسے کہتے ہیں خدا نے اس چیز کو حرام قرار دیا ہے اور کہا اس نے یہ ہے کہ کسی انسان

کو حق حاصل نہیں ہے کہ خدا نے جس چیز کو حلال قرار دیا ہے یعنی جس پہ پابندی نہیں لگائی ہے اس کے اوپر کوئی پابندی لگا دے۔ کہا ہے کہ **یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکُمْ** (5:87)۔ اے جماعتِ مومنین! یہاں مومنین کو خطاب ہے کہ ''خدا نے جو کچھ تمہارے لیے حلال قرار دیا' اسے اپنے لیے حرام قرار نہ دو۔ یہ خدا فرما رہا ہے کہ جسے حلال قرار دیا ہے' اسے حرام قرار نہ دو۔ مومنین کو تو معاذ اللہ نبی یہ کہے گا کہ جس کو خدا نے حلال قرار دیا تھا' اس کو اپنے اوپر حرام قرار دے لے۔ اس معنی میں یہ تو اتنی بڑی معصیت ہو جائے گی۔ آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ یہ اور دوسرے مقامات کے اوپر بھی' کئی مقامات کے اوپر ہے کہ خدا نے حرام قرار دیا ہے' خدا نے پابندی عائد کی ہے کسی دوسرے کو حق حاصل نہیں ہے اور یہاں تو خاص طور پہ کہا ہے۔ حرام اور حلال دو ہی الفاظ ہیں۔ اس آیت میں بھی ہیں' عام مومنین کے لیے ہے تو نبی کے اوپر تو سب سے اعلیٰ طور پر یہ بات ہو جائے گی تو کیا رسول اللہؐ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ اسطرح کی معصیت کریں گے کہ خدا نے جو حلال قرار دیا' اسے ابدی طور پہ حرام قرار دیں۔

## لفظ حرام کے معنی کسی چیز پر پابندی عائد کرنے کے ہوتے ہیں حرام' حلال اور طیباً کی وضاحت

عزیزانِ من! پہلی چیز میں یہ عرض کر رہا تھا کہ حرام کا یہ لفظ ان معنوں میں نہیں ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز پہ پابندی عائد کر دینا اور یہ کوئی کر سکتا ہے۔ قرآنِ کریم نے جہاں بھی حلال کہا ہے' وہاں ساتھ طیباً کہا ہے کہ یہ چیزیں حلال ہیں' ان کے کھانے پہ پابندی نہیں ہے لیکن ان میں سے جو تمہیں خوشگوار نظر آئیں' مرغوبِ خاطر ہوں' پسندیدہ ہوں' مضرِ صحت نہ ہوں' انہیں کھاؤ۔ اگر کوئی چیز آپ کو ناپسند ہے تو آپ نہ کھائیے لیکن اسے حرام نہ قرار دیجیے۔ ان دونوں میں بڑا لطیف فرق ہے۔ (مثلاً) مجھے یہ چیز اچھی نہیں لگتی' میں نہیں کھاتا' مرغوبِ خاطر نہیں ہے۔ ٹھیک ہے۔ حرام شے کو تو آپ نہیں کھا سکتے' خواہ وہ آپ کو اچھی لگے بجز اضطراری حالت کے' جو قرآن حکیم نے بتایا ہے۔ اب حرام کو حلال نہیں کر سکتے۔ حلال چیزوں کے اندر قرآن حکیم نے طیبہ ساتھ کہا ہے کہ جو ان میں سے مرغوبِ خاطر ہوں' اچھی لگیں' پاکیزہ ہوں' انہیں کھاؤ۔ تو اس قسم کی پابندی عائد کرنا حلال کو حرام قرار دینا نہیں ہے بلکہ خود نہ کھانا ہے اور ویسے بھی' جو دنیا میں حلال چیزیں ہیں وہ تو لاکھوں کی تعداد میں ہوں گی۔ وہ کونسا شخص ایسا ہے جو کہے کہ میں نے دنیا کی ہر ایک حلال چیز کھالی ہے۔ ایسا کوئی نہیں ہوگا۔ اس لیے کسی چیز کے متعلق یہ کہنا کہ مجھے وہ اچھی نہیں لگتی' میرے مزاج کے خلاف ہے' مجھے Agree نہیں کرتی' مجھے موافق نہیں آتی یہ تو ہم کہتے ہیں تو وہ حرام قرار دینا نہیں ہے۔ یہ اپنے اوپر پابندی عائد کی جاتی ہے۔ یہ چیز اس معنی میں تھی کہ ایک چیز' جس پہ پابندی نہیں تھی' وہ اے رسول! تم نے اپنے اوپر یہ پابندی عائد کر لی۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ جب صورت یہ ہے کہ جو عام مومنین ہیں ان کو بھی یہ اجازت ہے کہ حلال میں' جو پسندیدہ خاطر ہو' مرغوبِ خاطر ہو' طیب ہو' وہ کھائے اور جو نہیں ہو' اسے چھوڑ دے۔

## نبی اکرم ﷺ کا ایک حلال چیز کے کھانے سے اجتناب پر خدا کی طرف سے تنبیہ آخر کیوں؟

اب سوال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی اگر کسی چیز کے متعلق یہ کیا' تو انہیں خاص طور پہ یہ تنبیہ کیوں آ گئی؟ اس کی وجہ تھی کہ نبی کا جو عمل ہے' وہ آگے چل کر ایک اور شکل اختیار کرتا ہے اور قرآن کریم نے خود بتا دیا کہ یہودیوں نے یہ کہا کہ ان کے ہاں اونٹ کا گوشت حرام ہے۔ ادھر جب قرآن حکیم آیا تو اس نے یہ گوشت حلال قرار دیا۔ انہوں نے اعتراض کیا تھا کہ ہمارے ہاں ایک چیز حرام ہے' تو تمہارے ہاں وہ کیسے حلال قرار دیدی گئی؟ قرآن حکیم نے بتایا کہ ذرا اپنی تورات کو' اپنی تاریخ کو' پڑھو۔ خدا نے اسے حرام نہیں قرار دیا تھا۔ حضرت یعقوبؑ کو یہ پسند نہیں تھا' تو انہوں نے اپنی ناپسندیدگی کی وجہ سے کہا تھا کہ میں یہ نہیں کھاتا۔ قرآن حکیم نے کہا کہ نبی کے اس عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعد میں اس کی امت نے یہ سمجھا کہ یہ حرام ہی ہوگا جبھی ہمارے نبی نے چھوڑا تھا۔ قرآن حکیم نے یہ تصریح کر دی اور یہودیوں سے کہا کہ خدا نے یہ حرام قرار نہیں دیا تھا' تم اس کے لیے کوئی سند لاؤ کہ خدا نے حرام قرار دیا ہے۔ یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے تو اسے اپنی ذات کے لیے چھوڑا تھا۔ قرآن حکیم یہ کہتا ہے کہ انہوں نے اپنی ذات کے لیے یہ کہا تھا کہ یہ مجھے پسند نہیں ہے اس لیے میں نہیں کھاتا[1]۔ تم نے سمجھ لیا کہ یہ شریعت کا حکم ہے۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ پھر امتیں شریعت کے احکام اس طرح بنا لیا کرتی ہیں' اے نبی! محتاط رہو۔ آہاہا! جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے۔ محتاط رہیے' آپ تو محض اپنی ناپسندیدگی کی خاطر ایک چیز کر رہے ہیں' یہ اس کو حرام قرار دیدیں گے' بعد میں شریعت بن جائے گی' پھر اس کے بعد بڑے احتیاط کی ضرورت ہے اور یہیں سے' عزیزانِ من! بڑا اہم مسئلہ طے ہو جاتا ہے۔

## قرآن حکیم میں محفوظ کردہ نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کے علاوہ دواڑھائی سو سال بعد کے مرتب کردہ اسوۂ حسنہ میں بنیادی فرق ہے

نبی اکرم ﷺ کی جو حیاتِ طیبہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے' وہ اسوہ حضور ﷺ ہے۔ وہ تو محفوظ ہے' متعین ہے' مقرر ہے' اس کا ایک ایک حرف سچ ہے۔ یہ جو اسوۂ دواڑھائی سو سال بعد جا کر' زبانی روایات کے ذریعے مرتب ہوا ہے' تاریخ بھی زبانی لکھی ہوئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا' حضور ﷺ نے یہ کیا' سنیے! حضور ﷺ نے یہ فرمایا' حضور ﷺ نے یہ کیا' سنیے! حضور ﷺ نے اس کو مستنبط کر کے نہیں دیا تھا۔ ٹھیک ہے اگر اس میں کوئی چیز ایسی بھی آتی ہے کہ جس میں جی! رسول اللہ ﷺ نے عمر بھر ایسا نہیں کیا اور اس کو کہا جائے کہ یہ پھر شریعت میں حرام ہو گیا' کیا معلوم کہ حضور ﷺ نے اپنی عادت کے مطابق ہی اس سے اجتناب کیا ہو' یہ

---

[1] اس کی وضاحت کے لیے دیکھیے: (3:92;4:160;147)

ہماری کتبِ روایات یا تاریخ میں کہیں نہیں ہے۔ یہ کہیں نہیں بتایا ہوا کہ حالات یہ تھے، اس کی وجہ یہ تھی، اس کی بناء پہ حضور ﷺ نے یہ فرمایا، یہ کہا۔ یہ نہیں ہے۔ تو اب یہ کیسے متعین ہو؟

## وحی سے ہٹ کر نبی اکرمؐ کا معاشرتی معاملات میں آراء کی کیفیت کے متعلق بخاری شریعت کی ایک روایت

عزیزانِ من! یہ جو کہا جاتا ہے کہ یہ سنتِ رسول اللہؐ ہے، یہ سنت نہیں ہے اور اسی لیے ہر ایک فرقے کی الگ الگ سنت ہو گئی۔ کسی نے کہا کہ نہیں، یہ ہو سکتا ہے، کسی نے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا، تو گویا یہ ان کے اوپر متعین کرنا چھوڑ دیا کہ کونسی بات سنت ہے اور کونسی بات سنت نہیں ہے اور جو سنت ہے، وہ فریضہ شریعت قرار پا گیا۔ اندازہ لگایئے کہ یہ آپ نے کیسے متعین کیا ہے، حضورؐ نے تو خود ہی بعض معاملات میں فرما دیا تھا، وہ ہے ایک واقعہ، بخاری میں خود آتا ہے کھجوروں کے فصل لگانے کے متعلق واقعہ کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ اس طرح سے نہیں اس طرح سے کرو، تو کھجوریں زیادہ پھل دیں گی، اور انہوں نے ایسے کیا تو وہ پہلے سے بھی کم پھل ہوا، تو انہوں نے پوچھا تو آپؐ نے فرمایا یہ چیز ہمارے ہاں کہ تم بنیادی دنیاوی معاملات کو جو تمہارے ہیں، ان میں بعض میں مجھ سے بہتر جانتے ہو، تو تم اس کے مطابق کیا کرو۔ اگر اس چیز کا ٹکڑا ساتھ نہ آئے تو یہ چیز بن گئی نا سنت کہ کھجوروں کو اس طرح سے جو لگانا ہے وہ ارشادِ نبویؐ ہے۔

## روایات کو پرکھنے کا بنیادی معیار صرف قرآنِ حکیم کا معیار ہے

یہ متعین کرنے کا بڑا اہم سوال ہے اور اس کے تعین کرنے کے لیے یہ چیز خود خدا نے بتا دی کہ نبی کوئی بات قرآن حکیم کے خلاف نہیں کرتا۔ یہ Touch Stone اور معیار آ گیا، ہمارے سامنے۔ جو کچھ بھی روایات میں یا تاریخ میں منسوب کیا جائے رسول اللہ ﷺ کی طرف، اسے دیکھ لیجیے کہ قرآن حکیم کے مطابق ہے یا اس کے خلاف ہے۔ کوئی چیز جو قرآن حکیم کے خلاف ہے رسول ﷺ کبھی قرآن حکیم کے خلاف نہیں کرتے تھے۔ اس بات کو بلا تامل مسترد کر دیجیے کہ یہ میرے نبی ﷺ کی نہیں ہو سکتی، میرا رسول ﷺ ایسا نہیں کر سکتا، اس نے ایسا نہیں کیا ہوگا، یقیناً نہیں کیا ہوگا، ہزار بخاری اور مسلم کہتے رہیں۔ خدا کہتا ہے کہ رسول قرآن حکیم کے خلاف نہیں کہتا تھا۔ ہمارا ایمان ہے کہ رسول ﷺ نے کبھی معصیتِ خداوندی نہیں کی، ہم اسے رسول کی طرف منسوب نہیں کر سکتے، عزیزانِ من! وہ جو میرے متعلق کہا جاتا ہے کہ منکرِ حدیث ہے۔ یہ انکارِ حدیث نہیں ہے، انکار یہ ہے کہ اس بات کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہی نہیں کیا جا سکتا، یہ حدیثِ نبوی ہو نہیں سکتی۔ مانتا ہوں کہ حدیث ہے اور کہتا صرف یہ ہوں کہ یہ بات حضور ﷺ سے غلط منسوب کی گئی ہے، ورنہ معاذ اللہ معاذ اللہ کسی مسلمان کو یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ حضور ﷺ کی بات

کو نہ ملے مانے۔

## قرآن حکیم کے مطابق نبی اکرم ﷺ کا اپنی ذات کے متعلق ارشاد اور وحی کی دو قسموں کے متعلق پایا جانے والا تصور

ہم تو حضورؐ کے نام پہ ایمان لائے ہوئے ہیں لیکن یہ بات وہ ہے کہ رسول اللہ حضور ﷺ ایسا فرما نہیں سکتے تھے، کر نہیں سکتے تھے۔ کیوں؟ اس لیے کہ یہ قرآن حکیم کے خلاف ہے اور اس کی شہادت خدا دیتا ہے، اور قرآن حکیم میں نبی اکرمؐ کے یہ قول دو تین دفعہ موجود ہیں کہ اگر میں بھی خدا کے کسی حکم کے خلاف کروں تو میں بھی اس کے عذاب سے بچ نہیں سکتا۔ تو ہمارے پاس تو معیار آ گیا۔ لہٰذا **لِمَ تُحَرِّمُ** (66:1) یہ میں نے اس لیے کہا۔

عزیزانِ من! یہ بڑی اہم آیت ہے اور پوچھو نہیں کہ ہزار برس میں اس کے متعلق کیا کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے: تحرم کے معنی پہلے ''حرام قرار دینا ہوا''، پھر آگے ایک عقیدہ یہ ہے کہ رسول اللہؐ جو کچھ بھی کرتے تھے، کہتے تھے، وہ بھی وحی ہوتا تھا، یہ ایک عقیدہ ہے کہ وہ ساری وحی قرآن حکیم کے اندر نہیں آ گئی، قرآن حکیم کے باہر بھی ہے اور وہ ان روایات یا حدیث کے اندر ہے۔ خارج از قرآن حکیم وحی دو قسم کی وحی ہے لہٰذا جو چیزیں بھی رسول اللہ ﷺ کی کہی جائیں، خواہ وہ کتبِ روایات یا حدیث میں آئیں تو وہ بھی وحی ہیں۔ اسے وحی خفی کہا جاتا ہے، غیر مکتوب کہا جاتا ہے، غیر متلو کہا جاتا ہے، وہ تلاوت نہیں ہوتی تھی، لکھی نہیں گئی لیکن وہ وحی ہے۔

## وحی کی دو قسموں کے متعلق پیدا ہونے والا ایک سوال

جب عقیدہ یہ ہو کہ وہ وحی کی رو سے کرتے تھے، اب آ گئی ان کے لئے مشکل۔ کہا کہ **لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ** (66:1) تو حضورؐ نے جو چیز حرام قرار دی تھی اپنے اوپر، وحی کی رو سے کی تھی، اس عقیدے کے مطابق تو یہ عجیب قسم کی وحی ہے کہ ادھر حضورؐ سے کہتی ہے کہ اس کو حرام قرار دے لو، آپؐ نے حرام قرار دیا تو اس کے اوپر یہ کہا ہے کہ **لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ** (66:1) اور کیوں حرام قرار دیا اس کو۔ اب مشکل بن گئی، یعنی خود ہی یہ چیزیں اپنے ہاں بیڑیاں تیار کرتے ہیں، اندر بیٹھے ہوئے ہیں، کنڈی لگائی ہوئی ہے، رو رہے ہیں کہ نکلیں کیسے، وہ اپنی لگائی ہوئی کنڈی کھولی کہ جی نہیں، یہ بڑی مقدس ہے۔ تو روتے رہو، یعنی الجھاؤ ہی الجھاؤ۔ اب غور فرمایا یہ الجھاؤ۔ پہلے کہا کہ حرام قرار دے دیا رسول اللہؐ نے، کچھ آگے بات آئے گی کہ کیا حرام قرار دیدیا، عقیدہ بنایا کہ حضورؐ کا ہر عمل وحی پہ مبنی ہوتا تھا، حرام قرار دیا تو وحی کے مطابق ہوگا، یہ تو وحی کے مطابق حرار قرار دیا اور وحی یہ کہہ رہی ہے کہ یہ تم نے کیوں حرام قرار

دیا۔بس پھراس پہ بحثیں چلنی شروع ہوگئیں۔یہ کھڑے ہوکرنہیں سوچا کہ وہ عقیدہ ہی غلط ہے۔نہ وہ تو اپنی جگہ ٹھیک ہے‘اس کے ٹھیک ہونے کی سند کیا ہے؟ کہا کہ امام شافعی نے فرمایا ہے چلیے ! جناب خدا جو کچھ مرضی فرما تا رہے‘ بحث اس کے اوپر ہے۔میں نے گزارش کیا تھا کہ پہلی آیت ہی آپ کے ہاں اتنی اہم ہے‘اہم کیا ہے وہ تو ہماری بنائی ہوئی مشکلات ہیں‘ ہزار برس سے آپ کے ہاں تفاسیر کتب اوران چیزوں کے اندران کی Discussion دیکھیے‘ان کی بحثیں دیکھیے‘ان چیزوں پہ ہیں تو پہلا نکتہ جو ہے وہ ہے کہ ڈور کو سلجھار ہے ہیں اور سرا ملتا نہیں۔سرا تو یہ تھا کہ وہ عقیدہ غلط ہے‘ جوتم کہہ رہے ہو۔آگے بات اگر وہ سمجھ لیں تو پھر تو یہ ہوگیا کہ رسولؐ نے اپنی ہی مرضی اور اختیار سے یہ کیا تھا۔وہ جوان کا ہے کہ کیا تھا‘ حرام قرار دیا تھا‘ خدا نے کہا کہ کیوں حرام کیا۔یہاں تک تو بات اتنی سی ہوگئی کہ رسول اللہؐ نے ایسا کیوں عمل کیا جوحرام تھا لیکن یہ تو نہ ہوا کہ خدا کی وحی کے مطابق حرام قرار دیا اور خدا نے کہا کہ تم نے کیوں ایسا کیا‘ یہ تو بات نہیں ہے۔بات صاف ہے یہ حرام کا لفظ ہے۔حرام کے معنی ہیں ’’ممانعت‘پابندی عائد کر لینا کسی چیز کے نہ کھانے کی‘‘ ہم روز یہ کچھ کرتے ہیں۔خدا نے کیوں کہا؟ اس لیے کہ آپ ﷺ کی حیثیت آپ ﷺ کا مرتبہ کچھ اور ہے۔آپؐ نے یہ چیز اپنے لیے ہی ناگوار یہ سمجھی۔جیسا کہ ہو چکا ہوا ہے قرآن نے اسی لیے وہ جو Precedent جو ہے وہ کوٹ کردیا۔قرآن مجید کے اندر کہ پہلے ایسا ہو چکا ہے کہ ایک نبی ❶ نے اپنی ذات پر ایک چیز کو حرام قرار دیا یا اس کی ممانعت قرار دی‘ امت نے بعد میں سمجھ لیا کہ یہ خدا کا حکم تھا اور وہ سنتِ حضرتِ یعقوبؑ کی مطابق انہوں نے شریعت میں یہ حکم داخل کردیا۔یہودیوں کے ہاں اب بھی اونٹ کا گوشت حرام ہے اوران کی یہ بحث مسلمانوں سے ہوتی تھی‘ خدا نے کہا! او یہ کس طرح سے ہوا؟ اس لیے رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا کہ آپؐ نے جوایسا کیا ہے‘ کوئی عام انسان ایسا کرلے تو اس کے اس عمل کو یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ خدا کی طرف سے حکم تھا‘ آپؐ کے اس عمل کے متعلق یہ چیز کی جاسکتی ہے جو پہلے ہو چکا ہوا ہے‘ یہ آپ کو نہیں کرنے چاہیے۔’’ایتلا (66:1) میں جو کہا گیا تھا اس مفہوم یوں ہے کہ اے نبی ﷺ ! جس چیز کو خدا نے تیرے لیے حلال قرار دیا ہے‘ تو اسے‘ اپنی بیویوں کی رضامندی کی خاطر‘ اپنے اوپر حرام کیوں قرار دیتا ہے؟ (یہ تنبیہ اس لیے کی گئی ہے کہ) تم پر خدا کی طرف سے سامانِ حفاظت وربوبیت کی کمی نہ ہو (جو حلال چیزوں کو حرام قرار دے لینے کا لازمی نتیجہ ہے۔اس کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ تیرے کسی عمل کا اثر‘ تیری اپنی ذات تک محدود نہیں رہتا۔تم کسی چیز کو محض طبیعت کی ناپسندیدگی کی وجہ سے چھوڑ دو‘ اور تیرے متبعین یہ سمجھ لیں کہ یہ چیز فی ذاتہٖ بُری ہے اس لیے وہ بھی اسے حلال قرار دے لیں۔تمہیں‘ اس لیے بھی زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے)۔اگلی ہی آیت میں کہا کہ **قد فرض اللہ لکم تحلۃ ایمانکم . واللہ مولکم وھوا لعلیم الحکیم** (66:2) (اگرتم نے اس بارے میں کوئی قسم کھالی ہے‘

تو اس کا کچھ مضائقہ نہیں) قانونِ خداوندی نے اس قسم کی قسموں کو توڑنے کے لیے کفارہ مقرر کر رکھا ہے (2:225;5:89)۔ اللہ تمہارا کارساز ہے (اس لیے اُس نے اپنے قانون میں اس کی گنجائش رکھی ہے کہ جو باتیں کہو و خطا کی وجہ سے سرزد ہو جائیں' ان کا تدارک آسانی سے ہو سکے۔ وہ انسان کی طبیعت کی کمزوریوں سے واقف ہے' اس لیے اس نے اپنے قانون کو حکمت پر مبنی رکھا ہے۔''

اب اگلی بات یہ کیا ہوئی تھی؟ اور درس کا وقت ہو گیا۔ بات ہو گئی لمبی۔ آئندہ درس میں ہم اسے لیں گے۔
ابھی سورۃ التحریم کی پہلی ہی آیت ہمارے سامنے ہے [2]۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀......❀......❀

---

[1] حضرت یعقوب علیہ السلام
[2] آواز نہیں تھی اس لیے یہ واوین والا حصہ مفہوم القرآن سے لیا گیا ہے تاکہ اگلے درس کا تسلسل قائم رہ سکے۔

# تیسرا باب: **سورۃ التحریم** (آیات 1 تا اختتام)

**بسم الله الرحمن الرحیم**

عزیزانِ من! آج ستمبر 1983ء کی 23 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ التحریم کی اولیں آیات سے ہو رہا ہے: (66:1)۔

## جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے

سابقہ میں اس سورۃ کی پہلی دو آیات کے متعلق کچھ تمہیدی یا تعارفی سی گفتگو ہوئی تھی۔ پہلی آیت میں تو یہ تھا کہ نبی اکرم ﷺ نے کسی ایسی چیز استعمال کے لیے، جو حرام نہیں تھی، اپنے اوپر پابندی عائد کر لی تھی۔ اس کے لیے بھی خدا کی طرف سے تنبیہہ آئی تھی کہ آپ کو یہ نہیں کرنا چاہیے تھا، اس سے غلط نتائج نکالے جاسکتے ہیں۔

## نبی اکرم ﷺ کا اپنی بیویؓ سے کسی راز دارانہ بات کے سلسلہ میں علم الخبیر کے معاملہ کی وضاحت

بعد میں جا کر کہ یہ جو چیز تھی، یہ خدا کی طرف سے ہی حرام کی ہوئی تھی۔ ان سب چیزوں کی تفصیلی گفتگو سابقہ درسوں میں ہو چکی ہوئی ہے۔ جو دوسری آیت ہے، اس میں یہ تھا کہ خدا نے کوئی راز دارانہ طور پر کوئی بات، اپنی کسی بیوی سے کہی۔ اس نے کسی دوسری بیوی سے اس کا اظہار کر دیا اور اس سے پھر ذرا کچھ باہمی مناقشت سی ہوئی اور پھر وہ جو معاملہ تھا، وہ سلجھ گیا۔ یہ گھریلو زندگی میں میاں بیوی میں، یہ چھوٹے موٹے اختلافات ہوتے رہتے ہیں۔ ان کو کوئی خاص اہمیت نہیں ہو سکتی لیکن نبی اکرم ﷺ کی زندگی کو چونکہ آنے والی امت کے لیے اسوہ یا ایک نمونہ بننا تھا اس لیے ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے بھی جہاں کہیں کسی غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ یا خدشہ ہو سکتا تھا، اللہ تعالیٰ نے خود ہی اس کی وضاحت قرآن حمید میں بتا دی ہے تو یہ حقیقت میں گھر کے اندر کی باتیں ہیں لیکن اس سے جو نتائج مرتب ہوتے ہیں، ان کا تعلق ہم سے، امت سے ہے اور قیامت تک آنے والے مسلمانوں سے ہے۔ جو تیسری آیت تھی میں پہلے اس کی تلاوت کر دیتا ہوں، عام ترجمہ بھی بیان کر دیتا ہوں بات صاف ہے۔ اس میں ایک نکتہ ایسا ہے جو ذرا وضاحت طلب ہے وہ آیت یہ ہے کہ **وَاِذۡ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعۡضِ اَزۡوَاجِہٖ حَدِیۡثًا فَلَمَّا نَبَّاَتۡ بِہٖ وَاَظۡہَرَہُ اللّٰہُ عَلَیۡہِ عَرَّفَ بَعۡضَہٗ وَاَعۡرَضَ عَنۡۢ بَعۡضٍ فَلَمَّا نَبَّاَہَا بِہٖ قَالَتۡ مَنۡ اَنۡۢبَاَکَ ہٰذَا قَالَ نَبَّاَنِیَ الۡعَلِیۡمُ الۡخَبِیۡرُ** (66:3)۔ نبیؐ نے اپنی بیویوں میں سے کسی ایک سے کوئی بات کہی۔ ''اسرا'' کے لفظ کے اندر یہ بات آ گئی کہ وہ راز دارانہ طور پہ کوئی بات کہی تھی، وہ کسی دوسرے کو بتانا نہیں

چاہیے تھا تو اس نے کسی اور کو بھی بتادیا۔ جب نبی اکرم ﷺ کا اس کا علم ہوا' یوں کہیے ترجمہ یا معنی کے اعتبار سے' تو آپؐ نے اپنی اس پہلی بیوی سے کچھ بات تو بتادی کہ اتنی سی بات مجھے معلوم ہوئی ہے' باقی یہ جو چیز تھی کہ کس نے یہ کہا ہے' کس نے بتایا ہے' غالباً یہ بات تھی کہ جو نہیں کہی گئی۔ قرآن حمید نے اتنا ہی کہا ہے کہ اس کی کچھ بات اس سے کہدی اور کچھ بات نہ کہی تو اس نے پوچھا کہ آپ کو یہ کیسے علم ہوا' تو یہ جو قرآن حمید کے الفاظ ہیں وہ تو یہ ہیں کہ ''مجھے یہ بتایا ہے علیم الخبیر نے'' تو یہ وہ نکتہ تھا جو میں نے کہا تھا کہ یہ تھوڑا وضاحت طلب ہے اگرچہ آپ احباب تو اب برسوں سے درس سنتے چلے آرہے ہیں۔ آپ کو تو ان چیزوں کے سمجھنے کی دقت نہیں' بعض نے تو یہ کہا ہے کہ یہ العلیم الخبیر سے مراد ہی وہ بیوی تھی جس کو اس کا علم تھا' جس کو اس کی خبر تھی لیکن اس کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چونکہ یہ العلیم اور الخبیر ہے' یہ ہوسکتا ہے کہ خدا نے مجھے بتایا ہے' معنی کے اعتبار سے تو یہاں یہ بات پیدا ہوتی ہے کہ خدا نے جو بتایا' وہ تو وحی ہوتی ہے اور وحی تو قرآن کریم میں ہی آتی ہے تو قرآن کریم میں تو اس کا ذکر نہیں ہے تو یہ بات اصولاً سمجھ لینی چاہیے کہ قرآنِ کریم کا ایک اسلوب اور انداز یہ بھی ہے کہ جو چیزیں عام حالات میں' عام طور پر' فطری طریق کے اوپر بھی کچھ معلوم ہوتی ہیں' ان کی نسبت خدا کی طرف کردی جاتی ہے۔ قرآن کریم میں بے شمار مقامات ہیں اور میں نے تو اس پہ ایک پورا مقالہ لکھا تھا' جو طلوعِ اسلام میں شائع ہوا تھا' اسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے کہ جو بات اس انداز سے ہوتی ہے کہ ان چیزوں کو خدا کی طرف منسوب کردیا جاتا ہے اور پھر بات بنتی نہیں ہے' تو طرح طرح کی تاویلات ہوتی ہیں۔ اسے ذہن میں رکھیے' میں وہ مختلف مقامات اس وقت پیش نہیں کرنا چاہتا' بڑی تفصیل سے میں نے وہ مقالہ تقدیر کی گرہیں' لکھ دیا تھا غالباً اس کا عنوان یہ تھا طلوعِ اسلام میں شائع ہوا تھا اس کے علاوہ کئی اور مقامات بھی ہیں۔

## 'مما علّمکم اللہ' کے مفہوم کی وضاحت

وہ چیز جو انسان اپنی طرف سے کرتا ہے یا خدا کی دی ہوئی صلاحیت کی بناء پر کرتا ہے' اسے خدا اپنی طرف منسوب کرلیتا ہے۔ اس کی بیّن مثال مثلاً سورۃ المآئدۃ کی آیت 4 ہے۔ یہ پانچویں سورۃ کی چوتھی آیت ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ تم شکاری کتوں کو یا شکاری پرندوں کو اس علم کی بناء پر جو خدا نے تمہیں دیا ہے۔ شکار کرنا سدھاتے ہو۔ اب ظاہر ہے کہ شکاری کتوں کو سدھانے کا علم تو خدا نے کسی کو براہِ راست نہیں دیا ہے۔ یہ کیا بات ہے؟ وہاں مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ (5:4) ہے۔ یعنی وہ علم جو خدا نے تمہیں سکھایا ہے اس سے تم اپنے ان کتوں کو سدھاتے ہو' پرندوں کو سدھاتے ہو۔ میں نے ایک مثال یہ عرض کی ہے کہ یہ جو چیز ہے' فطری طور پہ بھی' جو چیز انسان اخذ کرتا ہے' حاصل کرتا ہے' جس کا علم حاصل کرتا ہے' اسے بھی خدا اپنی طرف منسوب کرلیتا ہے۔ میں یہ چیز کسی دوسرے وقت پہ عرض کرونگا کہ وہ اسے اپنی طرف کیوں منسوب کرتا ہے اور کن حالات میں منسوب کرتا ہے۔ یہ بیّن مثال تو موجود

ہے کہ شکاری کتوں کو جو سدھاتے ہیں تو وہ تو وہ طریقہ ہوتا ہے جو انہوں نے یا تو اپنے بزرگوں سے سیکھا ہوتا ہے' استاد سے سیکھا ہوتا ہے یا اپنے طور پہ ہی اس کو اخذ کیا ہوتا ہے یا مرتب کیا ہوتا ہے لیکن خدا یہ کہتا ہے کہ اس علم کی بناء پہ تم سکھاتے ہو جو اللہ تمہیں دیتا ہے۔ یہ ایک مثال ہے یا **عَلَّمَ بِالْقَلَمِ** (96:4) جو قرآن کریم نے کہا ہے' خدا نے تمہیں قلم سے لکھنا سکھایا' تو اب سیدھی بات ہے کہ یہ اس طرح قلم سے لکھنا خدا تو نہیں سکھاتا' یہ کیا بات ہے؟ اس کے معنی ہوتے ہیں کہ جو صلاحیت خدا نے تمہارے اندر رکھدی ہے' اس بناء پہ تم ایسا کرتے ہو۔ اگر ذہن میں یہ بات رکھ لی جائے تو بہت سے مقامات صاف ہو جاتے ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ موضوع ایسا ہے کہ اگر تفصیل میں' میں جاؤں' اس وقت نہیں جاسکتا کبھی اور عرض کرونگا کہ آخر میں علت اور علل یا مسبب الاسباب جسے the first cause آپ کہیں گے کڑیاں ملاتے چلے جایئے تو آخر میں یہی بات ہوگی کہ وہ خدا کی عطا کردہ ہی صلاحیت ہوتی ہے۔ جس کی بناء پہ انسان کرتا ہے کبھی اس کو خدا اس انسان کی طرف منسوب کر دیتا ہے' کبھی خدا اپنی طرف منسوب کر دیتا ہے' تو بہر حال یہ جو حضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے کہلایا گیا کہ مجھے سکھایا علیم وخبیر نے' تو یہ وحی کی رو سے ایسا نہیں تھا کیونکہ قرآن حمید میں یہ نہیں ہے اور وحی قرآن حمید ہی کے اندر ہے۔ بہر حال یہ بات آپ نے کہدی کہ مجھے اس کے متعلق یہ علم ہو گیا۔

## قرآن حکیم نے گھریلو زندگی کو جنت کی زندگی کہہ کر پکارا ہے

میں نے جیسا عرض کیا ہے اس قسم کے اختلافات میاں بیوی میں ہوتے رہتے ہیں لیکن قرآن حمید گھر کی زندگی کو پورا پرسکون بنانا چاہتا ہے' بڑا خوشگوار رکھنا چاہتا ہے' اسے وہ جنت کہہ کے پکارا ہے۔ اس نے سورۃ البقرۃ میں اس زندگی کو جو گھر کی زندگی سکون اور مؤدت اور رحمت اور سکینت کی زندگی ہو' اسے اس نے جنت کہہ کر پکارا ہے۔ تو اس جنت کی زندگی میں اگر ذرا سی بھی کہیں خلش واقع ہو جائے' تھوڑی سی بھی پھانس چبھ جائے' تو وہ بات باقی رہتی نہیں ہے۔ یہ واقعات اس لیے بتا دیئے کہ اور تو اور رسول کی زندگی میں بھی ایسے واقعات آگئے تھے' آسکتے تھے کہ جس میں کچھ گھریلو اختلاف گھر میں پیدا ہوسکتا ہے۔

## گھریلو اختلافات کو سلجھانے کے لیے قرآن حکیم کا بیان کردہ طریق

اختلاف کو سلجھانے کی شکلیں قرآن حکیم نے بتا دی ہیں اور اگر کوئی صورت ایسی باقی نہ رہے تو ہمارے لیے اس کے اندر تلقین یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ تم گھر میں مناقشات اور اختلافات کی زندگی' جہنم کی بسر کرو' بہتر یہی ہے کہ پھر الگ ہو جاؤ کیونکہ ازدواجی زندگی تو اس وقت ہی رہے گی جب میاں اور بیوی کے اندر کامل ہم آہنگی ہو اور بات یہاں یہ کہی کہ وہ جو ہمارے ہاں ہے کہ وہ جی جو طلاق ہے وہ عورت کہتی ہے کہ میں تو خودکشی کرلونگی' مر جاؤنگی' اس جہنم میں زندگی بسر کرلونگی' یہ عذاب برداشت کرلونگی' میں طلاق کی زندگی نہیں۔ برداشت کرسکتی۔ مطلقہ کو ہمارے ہاں بھی بڑی مذموم نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔

## عائلی زندگی پر ہندو معاشرت کے اثرات کو مٹانے کے لیے قرآن حکیم کی راہنمائی

یہ سارے ہندو معاشرت کا اثر ہے۔ ہندوؤں کے ہاں تو طلاق کا سوال نہیں ہے' بیوہ تک کی شادی نہیں ہوسکتی۔ تو یہ جو چیز ہے قرآن حکیم نے یہ بات کہی ہے کہ یہ ایسی بات نہیں ہے۔ اگر ہم آہنگی نہ رہے اور اس کے علاوہ اختلافات مٹانے کی کوئی اور صورت پیدا کرنا باقی نہ رہے تو اس قسم کی گھر کی زندگی کے مقابلے میں بہتر ہے کہ الگ ہو جاؤ اور الگ ضرورت ہے پھر گویا شادی کرنے کی ازدواجی زندگی کی تو ہم آہنگ اور ہم خیال اور ہم مسلک اور ہم عقیدہ ہم نظریہ ہم مزاج ہم طبیعت جو عورتیں اور ہیں ان سے شادیاں کر لیجئے۔ مسئلہ آسان ہے۔ رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے۔

میرے ساقی نے عطا کی ہے مے بے درد و صاف

## طلاق کی صورت میں پیدا ہونے والی مشکلات کا تفصیلی حل

ہمارے ہاں جو متوارض خیالات چلے آرہے ہیں ان کی وجہ سے ہمارے ہاں پیچیدگیاں پیدا کی جاتی ہیں؟؟؟ اور پھر اگلی بات جو قرآن کریم نے کہی ہے وہ سورۃ النسآء میں ہی ہے کہ اگر تمہیں اس چیز کا خوف ہو کہ اس طرح Separation سے' طلاق سے' علیحدگی سے' مشکل ہو جائے گی' معاشی مشکل ہو جائے گی' دقتیں ہو جائیں گی' خاص طور پہ عورت کو یہ خیال آئے گا اور یہی وہ خیال ہے جس کی وجہ سے وہ علیحدگی کے اوپر اس جہنم کی زندگی کو ترجیح دیتی ہے کہ کل کو کھائے گی کہاں سے' قرآن حکیم نے یہ بات وہاں کہی ہے کہ اس کی ذمہ داری تو اس نظام پر ہونی چاہیے کہ جو خدا کے نام پر مملکت اور حکومت کا نظام تم قائم کرو' وہ دیکھے کہ کوئی کسی قسم کی معاشی مشکلات میں نہ رہے' معاشرتی مشکلات میں نہ رہے' یہ تمہارا ذمہ ہے۔ کہا کہ اس کے متعلق مت فکر کرو جسے اس نے پھر وہاں یہی کہا ہے کہ اللہ تمہارے لیے سامان پیدا کر دے گا تو اللہ تو انسانوں کے ذریعے سامان پیدا کرتا ہے۔ اسلامی حکومت یا مملکت کا تو یہ فریضہ بھی ہے کہ وہ دیکھے کہ اگر کسی وجہ سے بھی فرض کرو کہ وہ کسی عورت کو طلاق ہوگئی ہے اور ایسا کچھ درمیانی عبوری وقت کے لیے ہے تو اس نے قرآن حمید میں ہی یہ قوانین دیدیئے ہیں کہ اس کے لیے Provision کی جائے' اس خاوند کی ذمہ داری یہ ہو اور اس سے آگے بات بڑھ جائے تو یہ کہا ہے کہ یہ جو نظامِ معاشرت ہے' نظامِ حکومت ہے' اس کا فریضہ ہے کہ وہ دیکھے کہ یہ محتاج نہ ہوں اور محض اس لیے اس جہنم کی زندگی کے اندر نہ جکڑی رہیں کہ اس کے بعد میرا یہ اقتصادی مسئلہ کیسے حل ہوگا۔ عجیب چیزیں قرآن حمید کے اندر ہی' عزیزانِ من! وہ جہنم نہیں بناتا' اسی لیے آگے یہ کہا میں نے عرض کیا ہے کہ یہ معاملہ میاں بیوی کی آپس میں تھوڑے سے اختلاف کا تھا لیکن چونکہ اس کی اہمیت امت کے لیے تھی قرآن حکیم نے بڑی تفصیل سے اسے بیان کیا ہے۔ یہ چیز سورۃ الاحزاب میں بھی آئی ہے وہاں بھی ازواجِ مطہرات کی طرف سے ایسا نظر آتا ہے کہ کچھ مطالبہ تھا۔ وہ مطالبہ کیا تھا؟ یہ اس زمانے میں قریباً

ساری حضورﷺ کے ہاں Protection کے لیے حفاظت کے لیے آئی تھیں' کوئی بیوہ تھی' کوئی مطلقہ تھی' کوئی چھوڑی ہوئی تھی' محتاج تھی' لیکن تھیں بہت اونچے گھرانوں کی۔

## حضورﷺ کی ازواج مطہراتؓ کی طرف سے مطالبات اور حضورﷺ کی طرف اس کا حل

حضورؐ کے اس دامنِ عافیت میں انہوں نے پناہ لی۔ زندگی جیسی تھی وہ تو معلوم ہے' بعد میں ایک حکومت ملی' مملکت ملی' آپؐ دس لاکھ مربع میل کی مملکت کے سربراہ تھے۔ نظر آتا ہے کہ جیسا کہ طبعی طور پہ ہونا چاہیے ان ازواجِ مطہرات کے دل میں یہ بات پیدا ہوئی کہ ہماری زندگی کچھ آسائش کی ہونی چاہیے۔ یہی ہے وہ جو وہاں بات ہے تو حضورؐ نے فرمایا کہ اس گھر میں تو زندگی ایسے ہی بسر ہوگی کیونکہ سربراہِ مملکتِ اسلامیہ تو گیہوں کی روٹی اس وقت کھا سکتا ہے' جب اسے یقین ہو کہ مملکت کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی ملتی ہے۔ تو یہ گھر تو معاشرے کے اندر غریب ترین گھر رہے گا' اب تم اس کے لیے خود فیصلہ کر دو۔ اب تمہیں شاید محتاجی بھی نہ ہو اور سہارے مل سکتے ہوں' آسرے مل سکتے ہوں تو میری طرف سے اجازت ہے' تم وہاں جا کر خوش رہ سکتی ہو تو میں تمہارے راستے میں حائل نہیں ہونا چاہتا' تم جا سکتی ہو' کوئی بات نہیں۔ یہ بھی بڑی اہم چیز تھی کہ اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے اور بیوی یہ کہے کہ میں ان حالات میں یہاں نہیں رہنا چاہتی' قرآن حکیم نے کہا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میں نہایت خوش دلی سے' خندہ پیشانی سے' تمہیں رخصت کر دونگا[1]' تمہیں بڑی عمدگی سے رخصت کرونگا تمہیں تو ایسے وقت میں خود خاوند کے لیے ضروری ہے کہ وہ بڑی خندہ پیشانی سے علیحدگی اختیار کرے اور خدا کی طرف سے ان ازاوج کو جو بھی وہ تھیں' یہ کہا جا رہا ہے۔

---

[1] اس کے لیے دیکھیے (33:28-30)

## ہمارے ہاں کرید کی راہوں کی کیفیت

جیسا میں نے پچھلی دفعہ بھی کہا تھا کہ ہماری تو صورت یہ ہے کہ یہ جو قرآن کریم نے اس کے اندر نکات بیان کیے یا ہمارے لیے جو تعلیم دی' ادھر کسی کی نگاہ نہیں جاتی' ہزار برس سے کرید ساری یہ ہو رہی ہے کہ وہ کونسی بیوی تھی جس نے یہ کیا اور وہ کونسی تھیں جو اس راز کے اندر شریک ہوئیں۔ چلے جا رہے ہیں' صاحب! اس پر کتابوں کی کتابیں لکھی چلی جا رہی ہیں یعنی جس بات کو تو قرآن کریم نے بتایا نہیں' حضورؐ نے خود یہاں کوئی نام نہیں لیا۔ اس کے متعلق کرید کی جا رہی ہے۔

## حضورؐ کے زمانے کی مملکت مدینہ کا تاریخی اور جنیل ریکارڈ تلف کر کے ایک نئی تاریخ کیوں رقم کی گئی؟

اس اعتبار سے پچھلا درس بڑا اہم تھا۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ رجوع کہاں کیا جائے گا؟ اس کے متعلق ڈھائی سو سال کے بعد

اس کے لیے ہوا یہ کہ وہ وضعی احادیث بنا دی گئیں' ایک تاریخ لکھ دی گئی اور وہ جو اوریجنل Source معلومات حاصل کرنے کوئی ہوسکتا تھا' اس کے لیے مدینے کی مملکت کا وہ سارا ریکارڈ تلف کر دیا گیا' امت کو مجبور کر دیا کہ ان کے لیے صرف یہی چیزیں' جو انہوں نے وضوع طور پہ بنائی تھیں' معلومات کا سرچشمہ رہے اور اس میں اب احادیث کی کتابوں میں بھی' تاریخ میں بھی یہ داستانیں شروع ہوگئیں۔ یہ بیویاں کہ کون تھی پھر آگے قصہ چلے جو خود ہی طے کرنا تھے۔ پھر اس کے بعد جس کا جی چاہے' جو کچھ جی چاہے' کہتا چلا جائے۔ بہر حال خدا نے یہ کہا ہے کہ ہمیں معلوم ہے کہ تمہارے دل میں اس کا احساس تو پیدا ہو رہا ہے کہ یہ غلط بات ہوگئی ہے تو جب احساس پیدا ہوگیا ہے تو عجیب بات ہے تو پھر کھل کر اعتراف کرو' معاملہ صاف ہوجائے گا۔ یہ جو ہے کہ اِنْ تَتُوْبَآ اِلَی اللّٰہِ (66:4) توبہ کرنا' یعنی یہ بات کہ تمہارے دل جو ہیں' وہ تو مائل ہو رہے ہیں' ایسے میں ہوتا یہ ہے کہ پھر اس کا کھلے بندوں اعتراف اور اظہار کرے تو کہا کہ جب یہ چیز ہے تو پھر بات صاف کر دو' معاملہ صاف ہوجائے گا اور اگر اس کے باوجود تم آپس میں یہی سمجھتے ہو کہ نہیں' رسول ﷺ کی مخالفت ہی کرنی ہے' تو پھر ٹھیک ہے' اس کے بعد وہ علیحدگی ہوجائے گی' یہ سوچ رکھو کہ تمہاری اس علیحدگی سے رسول اللہ ﷺ' یہ ہمارا رسول تمہارا محتاج نہیں ہے۔ انؐ کے Helper مددگار' والی' جبریل ہے' جو وحی لاتا ہے' مومنین ہیں' ملائکہ ہیں' وہ سب اس کے مددگار رہوں گے اس لیے یہ بات نہیں ہے کہ اسے کوئی احتیاج ہے کہ وہ اس قسم کی زندگی' خواہ اختلاف ہی کی ہو' بسر کرنے کے لیے مجبور ہوجائے' یہ بات نہیں ہے' نہ تم مجبور ہو نہ وہ مجبور ہو کہا کہ عَسٰی رَبُّہٗٓ اِنْ طَلَّقَکُنَّ اَنْ یُّبْدِلَہٗٓ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْکُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ (66:5)۔ اگر معاملہ Seperation تک پہنچ گیا ہے' علیحدگی تک پہنچ گیا ہے' تو پھر وہی بات آ گئی۔ بات تو یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کو اور بیویاں مل جائیں گی۔ کہا یہ کہ خدا ان کی جگہ اور بیویاں تبدیل کر دے گا۔ دیکھنا! وہی بات جو میں نے عرض کی ہے۔

## ہر وہ بات جو خدا کے قانون کے مطابق ہوگی اسے خدا اپنی طرف بھی منسوب کرتا ہے

اب یہاں سے پھر وہ بات چلی کہ وہ جو ہمارے ہاں کے قادیانی ہیں' کہتے ہیں کہ آسمان پہ نکاح ہوجاتا تھا صاحب! وہ کہتے ہیں۔ یہ جو خدا نے کہا ہے کہ ہم تمہارے لیے اور بیویاں بنا دیں گے' تو وہ خدا نے بنائی تھیں' اصل میں رسول کا اس میں کوئی چوائس نہیں تھا۔ یہ جو ایک نکتہ ہے' اس کو نظر انداز کر دینے سے میں نے گزارش کیا ہے کہ ہزار قسم کی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں کہ بتائیے کہ یہ جو خدا نے کہا ہے کہ ہم ان کی جگہ دوسری بیویاں تبدیل کر دیں گے تو بہر حال یہاں تو نوبت ہی نہ آئی لیکن انہوں نے کہہ تو دیا کہ خدا نے کہا۔ خدا کیا کرتا ہے؟ یہ وہ بات جو بات خدا کے قانون کے مطابق کی جائے' اسے بھی وہ اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ بیوی کا انتخاب تو' قرآن حکیم نے جتنی ہدایات دی ہیں' اس کے مطابق ہوگا۔ اس جہت سے بھی وہ اسے اپنی طرف منسوب کر لیتا ہے کہ اگر

ان قوانین اور ہدایات اور تلقینات کے مطابق تم انتخاب کرو گے تو گویا یوں سمجھو کہ یہ خدا نے انتخاب کیا ہے۔ بات بڑی واضح ہے۔ کسی کی ہدایت کے مطابق کوئی کچھ کام کرے تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ تو اس نے ہماری مرضی کے مطابق' ہمارے کہنے کے' مطابق کیا ہے تو گویا ہم ذمہ دار ہیں' ہم نے ہی یہ کیا ہے' اس انداز سے ان باتوں کو سمجھنا چاہیے تو اگر یہ ہوا تو کوئی بات نہیں ہے' وہ تم سے بہتر اور بیویاں دیدے گا۔

## شادی کے سلسلہ میں ہر دونوں طرف سے انتخاب کا معیار پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہے

اب یہ جو آگے کہا گیا ہے کہ ان بیویوں کی خصوصیات کیا ہوں گی۔ وہ حضورﷺ کی بیویوں کے متعلق نہیں کہا ہے۔ یہ قیامت تک تلقین دی ہے کہ اگر تم نے آپس میں میاں بیوی کا انتخاب کرنا ہو تو بیوی کی یہ Qualification ہونی چاہیے اور دوسری طرف میاں کی بھی یہ ہونی چاہئیں تو یہ جو آگے کہا گیا ہے' یہ انتخاب کے لیے قرآن حمید نے ایک ہدایت دی ہے کہ عورت کے اندر یہ Qualifications ہونی چاہئیں اور پھر وہ ہے جو تمہارے ساتھ ہم آہنگ ہوگی کیونکہ تمہارے اندر بھی یہ Qualification اور خصوصیات ہیں کہ وہ مسلمات ہیں' کہ وہ قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکی ہوئی ہوں لیکن جبر سے جھکی ہوئی نہیں۔ مسلمات عجیب چیز ہے یہ کہہ کر یعنی دوسرے مقام کے اوپر مسلمون مسلمات' عورت مرد' عورت مرد' دونوں ان صفات میں گنائے گئے ہیں یہاں چونکہ بات عورتوں کی ہو رہی تھی اس لیے کہا کہ وہ کیا ہوں گی اب پہلے کہاں ہے مسلمات' اور ساتھ یہ ہے مومنات۔ ذہن میں خیال ابھرتا ہے کہ جب وہ مومن ہوگی تو پھر تو وہ مسلم تو ہوگی لیکن اس میں عجیب بڑا فرق ہے۔ مسلم تو ہوا Submit کر دینے والا' Surrender کر دینے والا' جھک جانے والا' قانون کی اطاعت کرنے والا۔ اختیار تو دو طریق سے بھی کیا جاسکتا ہے: کسی جبر کے ماتحت کی بھی کیا جاسکتا ہے' خواہ اپنے دل کے ہی جبر سے ہو' باہر کے کسی جبر سے بھی ہو' اگر وہ قانون کے سامنے جھک گیا ہو' وہ اس اعتبار سے مسلم تو ہو گیا کہ اس کے معنی ہی جھک جانے والا ہیں' ایک جھکنا یہ ہے۔ دوسرا جھکنا یہ ہے کہ دل اس کی تصدیق کرے کہ یہ قانون صحیح ہے' جس کے سامنے میں جھکا ہوں' یوں وہ مومن ہوتا ہے تو کسی کے جبر سے' جو کسی قانون کی اطاعت کرنی ہے' اس سے انسان مومن نہیں ہوسکتا' یہ Submission ہوگی' یہ Surrender ہوگا' زبردستی جھک جانا ہوگا' زبردستی بھی جھکا جائے گا اور دوسرا جھکنا یہ ہے کہ دل اس کی تصدیق کرے کہ یہ واقعی صحیح چیز ہے اور مجھے اس کی اطاعت کرنی چاہیے۔ یوں ہوتا ہے مسلمات کے ساتھ مومنات۔

## لفظ مسلم کے بنیادی مفہوم کے بعد لفظ ''قنت'' کی اصل حقیقت' اس کی اہمیت اور اس کی قدر و منزلت

کہا ہے کہ قٰنِتٰتٍ (66:5) یہ عجیب عجیب الفاظ ہیں۔ ایک ایک لفظ ایک ایک درس کا متقاضی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا' یہ الفاظ

پہلے بھی آئے تھے۔ ترجمے تو اس کے یہی ہوتے ہیں: فرماں بردار، تابعدار۔ قرآن کریم اتنے الگ الگ الفاظ کیوں لاتا ہے؟ ایک ہی لفظ کہہ کر بات ختم کر دینی چاہیے تھے کہا ہے کہ قٰنِتٰتٍ (66:5)۔ مثال کے طور پہ میں نے سمجھایا تھا جو عرب جہاں یہ لفظ استعمال کرتے تھے، وہ سفر میں جاتے تھے تو انہیں پانی کی بڑی دقت ہوتی تھی اور پانی سب سے زیادہ متاعِ عزیز تھی۔ زندگی کا انحصار اس پہ تھا اور ریگستان میں پانی ملتا نہیں تھا تو وہ مشکیزے لے لیتے تھے جن میں پانی بھرتے تھے۔ اس طرح مشکیزہ ہوتا تھا کہ وہ ویسے تو ہر جگہ سے سلا ہوا ہوتا تھا کہ پانی کا ایک قطرہ بھی نہ ٹپکے اور اس کا جو منہ تھا وہ اس طرح سے باندھا ہوا ہوتا تھا کہ وہ اپنے راستے میں ایک قطرہ بھی نہ ٹپکے، جہاں پانی کی ضرورت ہو آسانی سے پانی نکل آئے۔ اسے کہتے تھے وہ مشکیزہ قُنت۔ عورت کے اندر جو صلاحیتیں ہیں، اب یہ بات میں بھی اشارت ہی میں کہونگا جو عورت کے اندر صلاحیتیں ہیں، اگر وہ جہاں جی چاہے یا جہاں جی چاہے ان کو کھول دے، مومن نہیں ہوتی، کھولنے سے انکار کر دے پھر بھی وہ مومن نہیں ہوگی۔ کھولے وہاں، جہاں خدا کے قانون کا تقاضا ہو، تو قُنت ہو جائے گی۔

## علامہ پرویزؒ کی طرف سے ترتیب دی گئی لغات القرآن کی بنیادی خصوصیت اور اہمیت کا ذکر

عزیزانِ من! میں پھر بار بار عرض کرتا ہوں کہ قرآن حمید کے الفاظ پہ بڑا غور کیا کیجیے، معاف رکھیے اگر میں، کہدوں کہ میں نے آپ احباب کی یہ جو محنت ہے، اس کو لغات القرآن لکھ کر بچالیا ہے، عرب ان الفاظ کا کیا معنی لیتے تھے، نزولِ قرآن کے زمانے میں اس کتاب میں آپ کو یہ ملے گا۔ اور وہیں سے قرآن کے جب یہ الفاظ کے معنی آپ متعین کر لیں گے، بڑا آسانی سے قرآن کا مطلب سمجھ میں آ جائے گا، پھر بہرحال قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ (66:5) کبھی کبھی غلطی ہو جاتی ہے، قرآن حمید انسان کی کمزوری کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ ہوتا ہے لیکن ایک تو یہ ہے کہ لغزش ہو اور اس پہ اصرار کر کے جما رہے، وہ کہتا ہے یہ تو جہنم میں گیا، دوسرا یہ ہے کہ لغزش کے بعد احساس ہو جائے کہ یہ غلطی ہوگئی، ندامت ہو جائے، اس کے بعد پلٹ آئے، اسے چھوڑ دے تو اسے توبہ کہتے ہیں۔ کہا کہ یہ ٹھیک ہے اگر کسی وقت وہ عورتیں جن میں یہ بھی خصوصیت ہو کہ کبھی کسی طرح سے گھر میں کوئی لغزش ہو جائے تو اس احساس کے بعد پھر اس سے لوٹ آئیں۔ ابھی ابھی کہا ہے کہ تمہیں احساس تو پیدا ہو گیا کھلے بندوں بات کیوں نہیں کرتی، تو توبہ یہ ہوگی: احساس کے بعد اس کا اعتراف کر لینا اور اس میں پھر اصلاح پیدا کر کے واپس اس مقام پہ آ جانا جہاں سے قدم غلط طرف اٹھا تھا۔ اسے عربوں کے ہاں توبہ کہتے تھے تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ (66:5) یہ مسلمٰتٍ جھکنا ہی ہے، مومن تسلیم کرنا ہے، عبدیت کے اندر یہ چیز ہوتی ہے یعنی وقف کر دینا اپنے آپ کو کسی مقصد کے لیے۔

## عبدیت کے لحاظ سے سب سے اونچا مقام رسولِ اکرمؐ کا ہے

عربوں کے ہاں تو چونکہ غلامی رائج تھی' غلام اپنے مقاصد نہیں رکھتا تھا' مالک کے جو مقاصد تھے ان کو بروئے کار لانے کا ذریعہ بنتا تھا۔ خدا نے جب عبد کہا ہے تو وہ بات غلامی کی تو نہیں لیکن کہا یہ تھا کہ مومن وہ ہے جو اپنی زندگی کو خدا کے بتائے ہوئے مقاصد کے لیے وقت کر دے' جس طرح ایک غلام اپنے مالک کے مقاصد کے لیے اپنے آپ کو وقت کرتا ہے۔ یہ معنی ہوتا ہے خدا کا عبد ہونے کے' اور سب سے بڑا عبد قرآن حمید نے جو کہا ہے وہ ہے کہ رسول کو عبد کہا ہے' اب بھی جو اعلان کیا جاتا ہے' پانچ وقت میناروں کے اوپر سے (عبدہ و رسولہ) بلندترین جو مقام ہے عام انسان کا تو ایک طرف ایک رسول کا جو بلندترین مقام ہے وہ خدا کا عبد ہونا ہے۔

## عورت کی مصروفیات صرف گھر کے اندر تک ہی محدود نہیں ہوتیں

کہا ہے کہ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ (66:5) ہمارے ہاں تو یہ ہے کہ عورتیں تو گھر میں بند ہوتی ہیں مگر قرآن کے اندر یہ خصوصیت بھی بتائی جاتی ہے کہ وہ باہر سفر میں ساتھ جانے والی ہوتی ہیں۔ قرآن کریم نے یہ خصوصیت بتائی ہے کہ وہ گھر کے اندر محض دال روٹی تک کے لیے ہی نہیں ہیں' کوئی سفر میں جانا ہے' جہاز میں جانا ہے' اس کے لیے وہ ساتھ جانے والیاں ہیں۔ ان میں یہ بھی خصوصیت ہونی چاہیے۔ کہا کہ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا (66:5) کوئی بات نہیں' یہاں دوسری بات بھی کہہ دی کہ خواہ وہ غیر شادی شدہ بھی ہوں' یا اس کے بعد شادی شدہ بھی ہوں' بیوی ہوں' مطلقہ ہوں' وہ بات جو ہندوؤں کی معاشرت سے ہمارے ہاں گھروں میں بھی آ گئی ہے کہ جو بیوہ اور مطلقہ ہے' اس کے ساتھ شادی میں کچھ دل کے اندر کبیدگی سی آتی ہے' قرآن حکیم نے یہ رسول کے ہی متعلق کہہ دیا کہ یہ بات نہیں ہے۔ وہ عورت' عورت ہوتی ہے' اگر اس میں یہ صلاحیتیں ہوں' تو یہ ہے جس کا یہ انتخاب کرنا ہو' تو اس میں یہ معیار اپنے سامنے رکھو۔ اب میں نے جو عرض کیا کا تھا کہ بات قرآن حکیم ایک خاص وقعہ کی بیان کر رہا ہے' اس کے بعد جو نتیجہ اخذ کرتا ہے' وہ ہے جو پھر قیامت تک کے لیے مستقل قانون بن جاتا ہے۔ اگلی ہی آیت میں بات صاف ہوگئی۔

## فکرِ قرآنی میں اہل وعیال کا مفہوم اور اس کے تحفظ کا فریضہ

یہ کچھ کہنے کے بعد کہا کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (66:6) اے جماعتِ مؤمنین! اے امتِ مسلمہ! بچاؤ اپنے آپ کو جہنم کی زندگی سے۔ تو وہ اپنے آپ کو ہی بچانے کی بات نہیں کی' وَاَهْلِيْكُمْ (66:6) بھی کہا ہے کہ اپنے آپ کو اور ''اپنے اہل کو'' بھی بچاؤ۔ اب اہل میں بات گھر کے اندر سے شروع ہوگی' جسے اہل وعیال کہا جاتا ہے لیکن اہل کا لفظ بڑا جامع ہوتا ہے۔ وہ آپ کے ہاں کی پارٹی کے سارے لوگ' بھی اہل ہوتے ہیں' آپ کی قوم بھی آپ کی اہل ہوتی ہے' ایک مملکت

کے باشندے حکومت کے بھی اہل ہوتے ہیں۔ یہ لفظ ان تمام معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے تو قرآن حمید نے کہا ہے کہ جو جو بھی تمہارے حلقۂ ذمہ داری کے اندر آتا ہے' گھر کے انسان ہوں یا باہر کے بھی ہوں' سارے اہل ہو جائیں گے۔ کہا ہے کہ اپنے آپ کو بھی جہنم سے بچاؤ اور ان کو بھی جہنم سے بچاؤ۔ سربراہ کے اوپر یہ ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے کہ وہ خود بھی جہنم کی زندگی سے بچے' ان کو بھی بچائے۔ ابھی ابھی گھر کے اندر قرآن نے جہنم کی زندگی بتائی ہے کہ کیسے شروع ہوتی ہے۔ کہا ہے کہ نار کے متعلق بتاؤ۔ پہلے بھی یہ لفظ آیا ہے۔

## جہنم کے ایندھن کے سلسلہ میں علامہ اقبال کا شاعرانہ انداز

کہا ہے کہ وَّقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ (66:6) یہ سورۃ بقرۃ میں بھی آیا ہے۔ جہنم کے وہ جو عام ترجمے ہیں' وہ کیے جاتے ہیں کہ ''جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوتے ہیں'' اور پھر اس میں بہت کچھ لمبا چوڑا لکھا گیا کہ صاحب! انسان تو بہر حال ٹھیک ہے' وہ آپ کو یاد ہے جو اقبالؒ کی نظم ہے' اسے پھر دہرادوں کہ انسان کس طرح سے جہنم کا ایندھن ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں اوپر گیا' شاعرانہ انداز سے سب کچھ دیکھا جنت بھی دیکھی جہنم بھی دیکھی' واپسی کے اوپر میں نے اپنے وہ فرشتہ گائیڈ جو ساتھ تھے اس سے کہا کہ بھئی! وہ جہنم کا بھی سنتے ہیں' ذرا اس کے متعلق بھی میں ایک نظر جھانک کے دیکھ لوں کہ وہ کیا ہے۔ کہنے لگے کہ ٹھیک ہے' یہ ساتھ ہی تو ہے۔ تو انہوں نے لکھا ہے کہ وہ مجھے وہاں لے گیا۔ میں نے وہاں جا کر دیکھا۔ میں نے سنا تھا کہ وہاں بڑے بڑے شعلے ہوتے ہیں' آسماں بوس آگ بھڑک رہی ہوتی ہے' لوگ جھلس رہے ہوتے ہیں مگر وہ ٹھنڈا ٹھار وہاں نظر آیا۔ میں نے کہا کہ کیا یہ جہنم ہے۔

## جہنم میں انسان اپنی بدعملی کی آگ کے شعلے اپنے ساتھ لے کر آتا ہے نیز جہنم کے اندر لیڈروں اور رعایا کی باہمی الزام تراشی کا منظر نامہ

کہنے لگا کہ یہی جہنم ہے۔ میں کہنے لگا کہ وہ جو آگ کے شعلے ہوتے ہیں وہ کیا ہیں؟ یہ نظم کچھ دیکھنے والی ہے۔ اس نے کہا کہ آگ کے شعلے اس میں نہیں ہوتے' اہلِ دنیا جو ہوتے ہیں' وہ اپنے انگارا اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ ہر شخص اپنا جہنم اپنے سینے میں رکھتا ہے۔ قرآن حمید نے کہا ہے کہ وہ آگ جو تمہارے دلوں کو گھیر لیتی ہے' تو دلوں کو گھیرنے والی جو آگ ہے' باہر سے تو اس کا ایندھن نہیں ہوتا' عزیزانِ من! جہنم ہر فرد کا اس کے سینے میں ہوتا ہے۔ اس دنیا میں بھی وہ جہنم میں ہوتا ہے' اسی جہنم کو لے کر پھر آگے چلتا ہے' یہ باہر کا ایندھن نہیں ہے تو والناس تو یہ اس کے اوپر ہو گیا کہ اب سوال یہ ہے کہ یہ آج ہم عربوں سے پوچھ لیں بنیادی بات یہی ہے الناس کہتے تھے ان کے لیڈروں کو اور حجارۃ کہتے تھے رعایا کو' اور قرآن حمید میں مختلف مقامات پر وہاں جہنم کے مقالمے ہیں یہ

قائدین کے یا لیڈروں کے' اور ان کے ساتھ جو ان کے Followers' جن کو کہہ متبعین لیجیے' وہ ان کو الزام دیتے ہیں کہ تم نے ہمیں مروا دیا' وہ کہتے ہیں کہ تم نے ہمیں تباہ کر دیا' تو یہ جو جہنم کے قرآن نے حجاز اور الناس دیئے ہیں' ان کے معنی جو عربی "لسان العرب ❶" میں ہیں' یہ لسانِ مبین عربی کی لغت ہے اس کے اندر یہ معنی دیئے ہوئے ہیں ❷۔

---

❶ لسان العرب ابن مکرّم کی تالیف ہے جنہیں ابن منظور بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی وفات 711ھ میں ہوئی۔

❷ تاج العروس اور محیط المحیط میں ہے کہ "ایسے آدمی کو بھی حجرٌ کہتے ہیں جو بہت ہوشیار اور چالاک ہو۔" راغب نے کہا ہے کہ اس سے مراد ایسے لوگ ہیں جو حق کے قبول کرنے میں ایسے سنگدل ہوں جیسے پتھر (اس کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن (جلد دوم)' ادارہ طلوع اسلام' 1960' ص 474)۔

## قرآن حکیم نے تو جہنم یا جنت کا ذکر تمثیلی یا تشبیہی طور پر بیان کیا ہے

بہر حال اگر وہ وہاں کے جہنم کے متعلق ہے' تو میں نے جیسا عرض کیا ہے' آج کی شعوری سطح' پر ہم اس زندگی کے متعلق کچھ نہیں سمجھ سکتے' وہاں شعور کی سطح ہی بدل جائے گی' تو اس لیے جو چیزیں قرآن حکیم نے تشبیہہ کے طور پر یا مثال کے طور پر بیان کی ہیں' انہیں حقیقت پر محمول نہیں کرنا چاہیے کہ واقعی آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے ہونگے' ایندھن لکڑیوں کے بجائے پتھر ڈالا جائے گا۔ قرآن حکیم نے مثالی طور پر' تمثیلی طور پر' تشبیہی طور پر' ان حقائق کو بیان کیا ہے جو آج کی شعوری سطح پر ذہنِ انسانی میں آ نہیں سکتے۔ کہا ہے کہ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ (66:6) وہ اس کے اوپر جو داروغے مقرر ہوئے ہیں' وہ بڑے سخت گیر قسم کے واقع ہوئے ہیں اور انکی کیفیت یہ ہے کہ لَّا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (66:6) ملائکہ کے متعلق دوسرے مقامات پہ بھی یہ ہے کہ "وہ جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے' وہ کرتے ہیں' اس سے انحراف نہیں برتتے' معصیت نہیں برتتے' برخلافی نہیں کرتے"۔

## قرآن حکیم کے مطابق لفظ ملائکہ کا مفہوم اور ان کے عمل دخل کی وضاحت

پھر بات آ گئی ملائکہ۔ ان کے متعلق تو متعدد بار میں عرض کر چکا ہوں کہ خدا کے پروگرام کو بروئے کار لانے کی یہ قوتیں ہیں' ہمارے ہاں کی جو خارجی دنیا ہے' جسے فطرت کی دنیا کہتے ہیں' وہ فطرت کی قوتیں ہو سکتی ہیں۔ انسان کے اندر قوتیں ہیں جنہیں اب اس دور کے اندر Psychological Intentions کہتے ہیں' وہ ہو سکتی ہیں۔ خدا کے عالمِ امر کے اندر یہ قوتیں کیسے کارفرما ہیں' ہم نہیں جان سکتے۔ ایک بات قرآن حکیم نے یہ کہی کہ انہیں اختیار و ارادہ نہیں دیا گیا کہ وہ خود ہی وہ قوت اپنے آپ کو جس طرح جی چاہے استعمال کرے۔ وہ سب خدا کے احکام کے مطابق کام کرتے ہیں' انہیں اختیار و ارادہ نہیں۔ عزیزانِ من! جہاں تک قرآن حکیم نے کائنات کے اور انسانوں کی جس بھی کائنات کا ذکر کیا ہے' اس میں اختیار و ارادہ صرف اوپر خدا کو حاصل ہے' نیچے انسان کو

حاصل ہے۔ یہ خدا کا صرف اس حد تک دیا ہوا ہے' جس حد تک ہے یعنی بحدِ بشریت' اس کے سوا فرشتوں کو بھی اختیار وارادہ نہیں ہے۔اب یہ چیز مومنین سے کہ کہ گھروں کو جہنم نہ بناؤ' معاشرے کو جہنم نہ بناؤ' ورنہ وہ جہنم ایسا ہے جس پر ہم مستبد حاکم' مستبد عناصر' ملائکہ قوتیں مسلط کر دیتے ہیں اور وہ بڑے سخت گیر ہوتے ہیں۔جہنم کا معاشرہ یہ ہوتا ہے۔جہنم کے معاشرے کے یہ جو داروغے ہیں ان کا جو ہیڈ ہے وہاں اس کا تو نام ہی مالک رکھا ہوا ہے۔انسان اگر کسی کی ملکیت میں آجاتا ہے تو اس سے زیادہ بڑا جہنم کوئی نہیں ہوسکتا۔یہ تو صرف خدا کا عبد ہوسکتا ہے' کسی اور کا نہیں۔کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔وہ معاشرہ جہنم ہوجاتا ہے اور اسی لیے جہنم کے وہ ہیڈ جو داروغہ آپ کہہ سکتے ہیں اس کا نام ہی قرآن نے مالک رکھا ہے۔

## انسان اپنے اختیار وارادہ کو تو استعمال کرسکتا ہے لیکن پھر اس کے عمل کے نتائج کو وہ نہیں بدل سکتا

کہا یہ ہے کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْیَوْمَ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (66:7) ایک طرف مومنین سے یہ کہا اور دوسری طرف وہ جو خدا کے ان قوانین سے انکار کرتے ہیں۔ان سے کہا کہ پھر اب تو تمہیں اختیار ہے' جی چاہے تو یہ راستہ اختیار کرو' جی چاہے دوسرا راستہ اختیار کرو لیکن جو راستہ تم نے اختیار کیا ہے' اس کے نتائج جب سامنے آئیں گے' اس وقت تمہاری کوئی معذرت قبول نہیں کی جاسکے گی۔اس وقت تُجْزَوْنَ مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (66:7) جو کچھ تم آج کررہے ہو' اس کے نتائج تمہیں بھگتنے پڑیں گے اس لیے اب تو وقت ہے کہ تم معذرت کرلو' پلٹ آؤ' اصلاح کرلو لیکن ظہورِ نتائج کے وقت پھر یہ نہیں ہوسکتا کہ اس وقت تم معذرت کرو جب پرچے دیکھے گئے' ممتحن نے مارکس دیدیئے' اس وقت یہ کہنا کہ میں صاحب فلاں سوال کا جواب اب صحیح لکھ دونگا' اس وقت نہیں مانا جاسکتا۔یہی دنیا ہے جس میں آپ یہ کچھ کرسکتے ہیں۔

پہلا رکوع یہ ختم ہے۔دوسرے رکوع کے لیے شاید وقت مل جائے۔یہ سات آیتیں ختم ہوگئیں۔یہ اٹھائیسواں پارہ ختم ہو رہے گا اور یہ ایک اہم چیز ہے وہ میں اگلے درس میں عرض کرونگا۔

## بار بار کی توجہ انسان کو نفسیاتی طور پر کمزور کر دیتی ہے

آٹھویں آیت ہے۔کہا ہے کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا (66:8) آہاہا! آگے کہا کہ عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّکَفِّرَ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ وَیُدْخِلَکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ (66:8) باقی آیت کا حصہ بعد میں تلاوت کروں گا۔یہ بڑی اہم چیز ہے۔کہا یہ ہے کہ اے ایمان لانے والو! خدا کی طرف رجوع کرو' کہیں کوئی لغزش بھی ہوگئی تو اعتراف کرو اور اس کے بعد اس مقام پہ آجاؤ کہ جہاں سے تمہارا قدم غلط راستے کی طرف اٹھا

تھا۔ زبان کے اعتبار سے اسے توبہ کہتے ہیں' یہ کرو۔ اب دیگر مقامات میں یہ کہا گیا ہے کہ ایسے بات نہیں کہ آج کہے گا کہ یا اللہ! میری توبہ اور اس کے بعد وہی کیا اور پھر وہی بات کہدی کہ نہیں صاحب! میری توبہ' تو پھر وہی بات وہ جو آپ کو یاد ہے جس نے کہا تھا کہ صاحب! یہ سگریٹ چھوڑنا بڑا مشکل ہے' نہیں چھوٹتا۔ کہنے لگا کہ واہ! کیوں نہیں چھوٹتا' بہت آسان ہے۔ کہنے لگا کہ کیسے؟ کہنے لگا کہ ہم نے بیس دفعہ چھوڑا۔ یہ بیس دفعہ چھوڑا کیا ہے؟ یہ وہ توبہ ہے جو قرآن حمید کہتا ہے۔ کیا خوبصورت شعر ہے ریاض کا' اسی پہ بیس دفعہ چھوڑا ہے:

جامِ مے توبہ شکن' توبہ مری جام شکن
سامنے اک ڈھیر ہے' ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا

## لفظ توبۃ نصوحاً کا لغوی اور قرآنی مفہوم پھٹے کپڑے کو بڑی مضبوطی اور صفائی سے رفع کرنے کے ہوتے ہیں

ایک یہ توبہ بھی ہوتی ہے: سامنے اک ڈھیر ے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا۔ لیکن قرآن حمید نے ایک لفظ استعمال کیا ہے اور وہ ہے تَوْبَةً نَّصُوْحًا (66:8) کیا بات ہے اس زبان کی' عزیزانِ من! میں تو کیونکہ تھوڑا سا ادب سے بھی دلچسپی رکھتا ہوں' وجد آ جاتا ہے بشرطیکہ ان عربوں سے پوچھا جائے کہ بھئی اس نَصُوْحًا کے معنی کیا ہیں۔ یہ کہ نصیحت والے' سیدھی بات ناصح' ہمارے ہاں نصیحت کرنے والا۔ یہاں سے نصیحت کا انہوں نے کہا بات ہے کیا؟ یہ پھٹے ہوئے گریبان کی اس طرح سے رفو گری کرنا ہے کہ وہ معلوم تک نہ ہو کہ یہ سیا ہوا ہے اور وہ ایسا سینا کہ پھر نہ پھٹے۔ ناصح درازی کو کہتے ہیں' منصا سوئی کو کہتے ہیں لیکن اس میں خلوص ہونا چاہیے۔ اگر موٹے کپڑے سے شہد کو چھانا اور پونا جائے تو جس طرح سے خالص شہد نکلتے نکلتا ہے اس پراسیس کو بھی وہ نصیحت کہتے تھے۔ تو اس میں خلوص بھی ہونا چاہیے۔ اس درازی کے لیے رفو گری (Darning) اس قسم کی ہونی چاہیے کہ معلوم نہ ہو کہ سیا ہوا ہے۔ آہاہا! اور پھر وہ وہاں سے نہ پھٹے۔ یہ ہے تَوْبَةً نَّصُوْحًا (66:8) اگر لفظ کے معنی سامنے آ جائیں تو کسی تفسیر کی ضرورت نہیں پڑتی۔ تَوْبَةً نَّصُوْحًا عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ (66:8) یوں کرو گے تو وہ جو تمہاری ناہمواریاں پیدا ہو گئی ہیں' ان کا ازالہ ہو جائے گا۔

## قرآن حکیم نے قرآنی معاشرے کو جنت کی خصوصیات کا حامل قرار دیا ہے

اس قسم کی توبہ سے پہلے سے تمہیں جو چیزیں نقصانات پہنچاتی ہیں ان کا ازالہ ہو جائے گا۔ یہ اس توبہ کے معنی ہیں اور اس کے بعد خدا تمہیں ان جنتوں میں داخل کر دے گا جس کے نیچے پانی کی شاداب نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ یہ انہار ہے۔ نہر' عربوں کے

ہاں، وہ چھوٹی سی جو نالی بھی تھی، اسے بھی نہر کہا کرتے تھے۔ وہاں پانی کی کمی تھی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جن کی شادابی اور سرسبزی میں فرق نہ آئے، مسلسل پانی ملتا رہے۔ جن درختوں کو کیاریوں سے مسلسل پانی ملتا رہے، وہ سرسبز و شاداب رہتی ہیں۔ قرآن نے یہ چیز ہر جگہ دہرائی ہے کہ وہ سرسبزی و شادابی خزاں دیدہ نہیں ہوگی کہ چھ مہینے کے لیے وہ جنت رہے اور پھر ٹھٹھر اجائے، وہ نہیں ہے، یہ خاں دیدہ نہیں ہے، سدا بہار Evergreen جنت ہے اور وہ پھر یہ وہ دن ہوگا۔

## جہنم جمود کا ہی دوسرا نام ہے جب کہ حیات ذوقِ سفر کےسوا کچھ اور نہیں ہوتی

اب دیکھیے کہ جس میں رسول اور ان کے ساتھی ہیں، انہیں کسی قسم کی ذلت دیکھنی نصیب نہیں ہوگی۔ یہ ہے معیار، عزیزانِ من! ایمان اور اعمالِ صالح کا کہ اس جماعت کو پھر کہیں دنیا میں ذلت نصیب نہ ہو اور جو قوم مسلسل ذلت میں ڈوبی ہوئی ہو، اسے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے آپ کو مومن بھی کہے اور مسلم بھی کہے۔ پھر اگلی بات یہ ہے کہ یہ زندگی قرآن کریم کی رو سے جامد نہیں ہے، اس میں Stagnation (جمود) نہیں ہے۔ ایک مقام پہ کھڑا ہونا نہیں ہے۔ ایک مقام پہ کھڑا ہونا، حرکت رک جانا تو جحیم ہے۔ جہنم کا لفظ بھی ہے۔ یہاں یہ جحیم ہے، اس کے معنی کسی مقام پر کھڑے ہو جانا، رک جانا، حرکت باقی نہ رہنا کے ہیں۔

## یہ قندیل آسمانی تو زندگی کی تاریک راستوں کو روشن کرنے کے لیے دی گئی تھی

قرآن کریم نے دوسری جگہ یہ کہا ہے کہ ہم نے تمہیں ایک ایسی شمع دی ہے کہ اس کو لے کر پھر دنیا میں چلو پھرو، یہ نہیں ہے کہ تمہارا راستہ روشن ہو گیا ہے تو شمع کو لے کر کھڑے رہو کہ میرا راستہ تو روشن ہوا، اتنا ہی تمہارا فریضہ نہیں کہ تمہارا راستہ روشن ہو۔ تم نے دنیا کے راستوں کو روشن کرنا ہے۔ اس کو لے کر دنیا میں پھرو اور جو قوم خود تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی ہو، اس نے دوسروں کے راستوں کو کیا روشن کرنا ہے۔ یہاں اسی نور کے متعلق کہا کہ **نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ** (66:8)۔ ان کا نورِ بصیرت ان کے آگے آگے اور دائیں بائیں سے چلتا ہوں۔ وہاں یہ ہے کہ ان کی پیشانیوں میں وہ ہیڈ لائٹ ہوگی۔ اس سے سامنے کا راستہ، دائیں بائیں کے راستے بھی روشن ہوتے چلے جائیں گے اور ان کی یہ آرزوئیں ہوں گی کہ **يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا** (66:8) اے خدا! ہمارے اس نور میں اور اضافہ کر دے، اسے مکمل کر دے، نور کا اس کو اتمام کر دے، ساری دنیا جگمگا اٹھے: دہر میں اسمِ محمد ﷺ سے اجالا کر دے، خدا مکمل کر دے وہی پھر حرکت ہے، مسلسل رہے گی تو پھر یہ کیفیت ہوگی ایک جگہ کھڑے ہو جانے سے تو بات نہیں رہے گی خواہ نور ہی کیوں نہ ہو۔ سوال یہ ہے کہ کیسے ہو؟

## اے خدا تو ہماری خامیوں کو درگزر کر

کہا ہے کہ **وَاغْفِرْ لَنَا** (66:8)۔ اگر کہیں ہم سے بھول چوک ہو جائے تو ہمیں حفاظت میں رکھ کیونکہ **اِنَّکَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ**

قَدِیْرٌ (66:8)۔ہمیں پتہ ہے کہ تم نے ویسے تو ہر شے کے لیے پیمانے اور قانون مقرر کردیئے ہیں لیکن یہ بھی تیرا قانون ہے کہ اگر کہیں بھول چوک سے' لغزش ہوجائے اور اعتراف ہوجائے اور اصلاح ہوجائے تو جو اس کی وجہ سے نقصانات ہوچکے ہوتے ہیں' ان کا بھی ازالہ ہوجایا کرتا ہے' یہ کردے۔ آگے کہا کہ **یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ اغْلُظْ عَلَیْهِمْ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ** ❶ (66:9)۔اب یہ جو لوگ کفار کے معنی یہی نہیں ہیں کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ ہندو کافر ہے تو ان کے ساتھ جنگ کرتے رہا کرو۔ وہ جو اس کو روکیں' تمہاری مخالفت کریں' تمہارے راستے میں حائل ہوں' سرکشی برتیں' آگے نہ چلنے دیں' مخالفت ایسی کریں تو کفر کے معنی ''سرکشی'' کے ہوتے ہیں اور منافقین کے متعلق تو قرآن حمید بھرا پڑا ہے۔ سب سے زیادہ خطرناک مرحلہ منافقین کا ہوتا ہے ان کے خلاف جہاد ہے۔ ٹھیک ہے یہ جہاد صرف تلوار ہی کا جہاد نہیں ہے' یہ ہر قسم کی جدوجہد کا نام۔ یہ ہے کوشش۔ یہ کرو کہ ان کی کارستانیاں کامیاب نہ ہوجائیں' تمہارے راستے میں یہ روڑے نہ اٹکائیں' تم نور کی شمع لے کر چلو تو یہ بجھانے کی کوشش نہ کریں۔ یہ قرآن کریم کے الفاظ ہیں وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ(66:9)۔جہنم بہت برا ٹھکانہ ہے۔

---

❶ اے نبی ﷺ! انہیں بتادے کہ تمہاری ان آرزوؤں کے برآنے کا طریق یہ ہے کہ تم منافقین کی ریشہ دوانیوں اور کفار کی مزاحمتوں کے خلاف مصروفِ جدوجہد رہو' اوران کے مقابلے میں اپنے آپ کو چٹان کی طرح مضبوط رکھ۔ ان پر پوری شدت سے غلبہ حاصل کرو۔ اس طرح یہ مخالفین' تباہیوں کے جہنم میں پہنچ جائیں گے اوران کا انجام بہت بُرا ہوگا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص1334)۔

## مکافاتِ عمل میں کسی کی بیوی ہونا یا بیٹا ہونا یا کسی کا ماں باپ ہونا کسی کے کام نہ آسکے گا

اب دو آیتوں کے اندر' عزیزانِ من! عائلی زندگی سے بات چلی تھی۔ اپنے اپنے عمل کے نتیجے سے' جزا سے' بدلے سے' دو باتیں ہوئیں کہ بیویاں ہوں' ہم آہنگ اور دوسری چیز یہ کہ کسی دوسرے کا مومن ہونا' مسلم ہونا' اس کا نیک ہونا' کسی دوسرے کو فائدہ نہیں دے سکتا' اور اسی طرح سے دوسرے کا بدکردار ہونا' اگر یہ خود خوش کردار ہے' تو اس سے مواخذہ نہیں ہوگا۔ یہ دو اصول تھے جو قرآن حمید نے بیوں کے متعلق بھی اور اپنے اپنے اعمال کے متعلق بھی بیان کیے اور کہا کہ **ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ امْرَاَتَ لُوْطٍ** (66:10)۔ یہ جو کفار ہیں' ان سے نوحؑ کی بیوی کی اور لوط کی بیوی کی داستان بیان کرو۔ یہ دونوں یہی نہیں کہ نیکوکار بندے تھے' نبی تھے' وہ ان کی بیویاں تھیں' لیکن مسلک میں ان سے ہم آہنگ نہیں تھیں' چنانچہ دونوں کے متعلق قرآن حمید میں آیا ہے کہ جب وہ تباہی آئی انہوں نے بہتیرا ان سے کہا کہ ان کا یہ مسلک چھوڑ دیں' یہ مسلک اختیار کرو۔ انہوں نے اختیار نہیں کیا۔ وہ ان مخالفین کے ساتھ ہی تباہ ہوگئیں تو گویا قرآن حمید نے بتایا یہ ہے کہ اگر مسلک میں کوئی بیوی کسی دوسرے کا میاں' کسی دوسرے کے ساتھ ہو' تو اس کے ساتھ اگر میاں یا بیوی نیک کردار ہیں' تو یہ چیز کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔ میاں

بیوی میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ یہ چیز فائدہ نہیں دے سکتی۔حضرتِ نوحؑ کی بیوی بھی پیچھے رہی' تباہ ہوگئی۔حضرتِ لوطؑ کی بیوی بھی پیچھے رہی' تباہ ہوگئی کہا کہ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ (66:10)۔وہ اگرچہ ہمارے عبدوں کی' عباد کی' نبیوں کی' بیویاں تھیں لیکن چونکہ وہ ایمان اور اعمالِ صالحہ میں ان کے ساتھ نہیں تھیں' ان کی بیویاں ہونا' ان کے کسی کام نہ آیا اور وہ ان کے ساتھ جہنم میں داخل ہوگئیں' جن کا مسلک انہوں نے اختیار کر رکھا تھا۔بیوی ہونا بھی نہیں بچا سکتا' اولاد ہونا بھی نہیں بچا سکتا' ماں باپ ہونا بھی نہیں بچا سکتا۔دوسری طرف وہ کہا کہ انہوں نے یہ فَخَانَتٰهُمَا (66:10)۔خیانت کی۔اس کا یہ خیانت ترجمہ کرتے ہیں اور پھر اس پہ تباہی آئی۔قرآن نے دوسرے مقامات پہ کہا ہے کہ یہ جو بات تھی کہ انہوں نے یہ مسلک یعنی ان کا ایمان اختیار نہیں کیا تھا' وہ جہنم میں گئیں۔اگلا ہے کہ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (66:11)۔فرعون کی بیوی کی مثال ہے۔فرعون کی مثال میں ایسی اہم بات ہے کہ قرآن حمید ادھر نبیوں کی بیویاں لایا ہے' اُدھر اس کے مقابل میں سرکشوں کی بیویاں لے آیا ہے۔فرعون جیسا سرکش ہے مگر اس کی جو بیوی تھی' کہا کہ وہ ایمان رکھتی تھی' وہ خدا سے دعا مانگتی رہتی تھی کہ یا اللہ! اس ظالم سے میری نجات دلا' اس ظالم قوم سے میری نجات دلا۔

## فرعون کی باایمان بیوی کے بعد حضرت مریم جیسی نیک سیرت اور پاک دامن عورت کا مثالی ذکر

کہا کہ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ (66:12). دوسری طرف مریم بنتِ عمران کی مثال ہے۔اس کو کہا ہے' قرآن کریم نے ہر جگہ ان کے متعلق کہا ہے۔حضرت مریمؑ کی زندگی آپ کے سامنے متعدد بار آ چکی ہوئی ہے۔ان کی اہمیت قرآن حکیم نے یہ بتائی ہے کہ انہوں نے خانقاہیت کی جو پابندیاں انسانوں کی عائد کردہ تھیں' ان کے خلاف انقلابی واز ہی نہیں اٹھائی' عملاً ان کو توڑ کر رکھ دیا اور خدا کے حکم کے مطابق زندگی بسر کی۔قرآن کریم نے ان کے اس انقلابی اقدام کی بناء پر ان کے لیے اصْطَفٰكِ (3:4) کا لفظ استعمال کیا' اپنے دور کی تمام عورتوں سے منتخب شدہ کہا ہے کہ اپنے دور کی تمام عورتوں سے ان کی ممتاز حیثیت تھی' کیونکہ انہوں نے یہ جو معاشرے کی روایات' مذہبی پیشوائیوں کی عائد کردہ پابندیاں' جو خدا کے قانون کے خلاف جاتی تھیں' ان کی پرواہ نہیں کی اور ان کے علی الرغم انہیں کو توڑ کر رکھ دیا۔یہ بہت بڑی انقلابی خاتون تھی۔وہ جو انہوں نے خصوصیت بتائی ہے کہ اس نے' قرآن کا یہ انداز ہ ملاحظہ فرمایئے' بات تو یہ کرنی ہے کہ انہوں نے ایسی باحیا محفوظ عصمت کی زندگی بسر کی کہ قرآن میں یہ ہے کہ ہیکل کے اندر کس کس طرح سے وہ جو پیشوا تھے' کیا کیا نگاہیں بد' ان کی طرف ڈالتے تھے' اور کیسے انہوں نے اپنے آپ کو محفوظ رکھا۔قرآن حمید کا انداز یہ ہے جو

میں کبھی کہا کرتا ہوں کہ میری بیٹیاں ہیں' میں اب وہ الفاظ نہیں' قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ ایسی بات وہ ان الفاظ میں نہیں کہتا ہے۔ کیا لفظ ہیں' قرآن کے جناب! کہ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (66:12) اب فرج کے متعلق تو عام ترجمہ ہمارے ہاں' معاف رکھیے گا' شرم گاہ ہی کیا جاتا ہے۔ پوچھیے! قرآن کی لطافت' اس کی نفاست' اس کی یہ بلندی ہے کہ یہ سب کے سامنے بات آئے گی۔ اس کے معنی ہوتے ہیں چاک گریباں اور اَحْصَنَتْ (66:12) ہے۔ انہوں نے اپنے چاک گریباں تک کسی کا ہاتھ نہ آنے دیا۔ قرآن یہ کہہ رہا ہے۔ کیا انداز ہے بات کرنے کا! اور پھر وہ جو بچہ' حمل سے پیدا ہونے والا تھا۔ ہیکل کی زندگی میں تو وہ شادی نہیں کر سکتی تھی۔ اگر کر سکتی تھی تو ہیکل کے کسی پجاری کے ساتھ کر سکتی تھی۔ انہوں نے باہر شادی کی۔ بچے کے متعلق قرآن میں' یہ جہاں بھی انسانی بچے کا ذکر ایا ہے' اس میں یہ چیز آئی ہے کہ خدا نے اپنی توانائی کا شمہ (جیسا کہ ہر انسانی بچے کی صورت میں ہوتا ہے) اس میں داخل کر دیا۔ یہ بات لمبی ہو جائے گی۔ اسے نفخ کہا ہے روحِ خداوندی کا شمہ ڈالا' کہا ہے کہ رُّوْحِنَا (66:12)۔ کبھی اس عورت کے متعلق؛ جس کے بطن میں وہ بچہ ہو' کبھی براہِ راست اس بچے کے متعلق یہ الفاظ قرآن میں آئے ہیں کہ وہ بچہ عام انسانی بچوں کی طرح تھا' خدا نے اپنی توانائی کا شمہ اس میں پھونک دیا تھا۔ اس نے خدا کے قوانین کی صداقت کا عملی ثبوت بہم پہنچایا' اس کی کتابوں کے اوپر عمل کر کے دکھایا اور وہ اب وہ لفظ ''کانت'' آیا۔ وہ قٰنِتٍ میں سے تھی۔ غور فرما لیا کہ کہاں لفظ آ گیا یہ کانت۔ ہیکل کی زندگی میں وہ ہمیشہ کے لیے وہاں کنواری رہنے کی تلقین کرتے تھے یا وہ بھی قٰنِتٍ نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ مشکیزے کا پانی مشکیزے میں دھرے کا دھرا ہی رہ جاتا' پیاسے کے کام نہ آتا۔ اس نے دوسری روش بھی اختیار نہیں کی تھی کہ جہاں بلا ضرورت ہی وہ گرا دیا جاتا۔ کیا بات ہے۔ صاحب! یہ حسین کا ترجمہ قرآن نے کیا ہے: اس نے برموقعہ اور برمحل اس صلاحیت کو استعمال کیا اور وہ قٰنِتٍ میں سے ہو گئی صاحب۔

سورۃ التحریم کی آخری آیت' عزیزانِ من! ختم ہو گئی۔ آئندہ درس میں اگلی سورۃ سورۃ الملک لیں گے۔ یہ 67ویں سورۃ ہے۔ اور میں نے عرض کیا ہے کہ اس پہ اٹھائیسواں پارہ بھی ختم ہوتا ہے۔ اس کی تمہید میں بھی میں کچھ عرض کروں گا۔ اس پارے کے ختم ہونے سے انتیسواں اور تیسواں پارہ' دو ہی پارے' اب ہمارے سامنے رہ گئے ہیں۔ وہ درس کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ آئندہ درس میں' میں عرض کروں گا کہ میرے جذبات کی کیفیت کیا ہے اور ایسے مقام کے اوپر کیا ہوتی ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀......❀......❀

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں
ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن
فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی
کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان
ہے۔ لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح
نظر آئے' وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور
جہاں کہیں سہو وخطا دکھائی دے' وہ میرے
ذہن کی نارسائی۔ (پرویز۔ معراجِ انسانیت)